ساقی
دہلی
اڈیٹر:- شاہد احمد دہلوی

فہرست مفت منگائیے

اشاعتِ خاص

(جس میں)

صرف افسانے اور ڈرامے ہیں

مرتبہ

شاہد احمد (آنرز) بی اے

قیمت ایک روپیہ

ساقی ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔ سالانہ چندہ پانچ روپے مع محصولڈاک ممالک غیر سے بارہ شلنگ

ہر سال ساقی کے دو نمبر شائع ہوتے ہیں مستقل خریداروں سے ان کی قیمت الگ نہیں لی جاتی

جلد ۱۸ | ساقی دھلی، افسانہ نمبر، بابت جولائی ۱۹۳۸ء | نمبر (۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

یہ خبر رنج و افسوس کے ساتھ سُنی جائیگی کہ ایڈیٹر ساقی کی مجموعۂ اوصاف رفیقۂ حیات تیرہ برس کی طویل علالت کے بعد ۴ / جون ۱۹۸۶ء کو صبحدم اللہ کو پیاری ہوئیں ـــــــ انا للہ و انا الیہ راجعون !۔

ایسی فرشتہ خصلت، نیکئ مجسّم اور صدق و صفا کی دیوی کا کہ جن کے دم قدم سے گھر امن و آشتی، سکون و عیش کی آماجگاہ تھا بھری پُری محفل کو یوں سُونا کر جانا اور ایسی خدمتگذار اور فرض شناس کی حسرتناک موت کہ جنہوں نے جملہ اعزا کی آسائش و آرام کی فکر میں بالآخر اپنی جان تک نثار کردی نہایت لائقِ صد ماتم ہے۔ ستّرہ برس کے گہرے رابطۂ خلوص و محبت کے بعد دُکھ درد کے ایسے مونس، دلسوز اور عیش و مسرت کے ایسے پیارے ساتھی سے یوں اچانک چُھٹ جانے پر بھائی شاہد احمد صاحب کے دل و دماغ کی کیا حالت ہوگی۔ آہ ! بیچارگی اور مجبوری، لیکن ؎

تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

پاک رب کریم مرحومہ پر اپنی رحمت کے پھول برسائے اور اُن کے دلریش و شکستہ حال شوہر کو صبر جمیل عطا فرمائے اور اُن معصوموں کو جو مرحومہ کی نشانیاں ہیں پروان چڑھائے اور ہمیشہ ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے !!!

ان متعدد احباب کی خدمت میں جنہوں نے مدیر ساقی کی اِس خانہ ویرانی پر تعزیت نامے بھیجے، موصوف کی جانب سے اظہارِ ممنونیت کرتا ہوں کہ اُن کے پُرخلوص پیغامات خستہ دلوں کیلئے کافی حد تک باعثِ تسلّی ہوئے۔

پیشِ نظر افسانہ نمبر جن پریشانیوں اور بے اوسانیوں کے درمیان مُرتب ہوا ہے اُس کا ذکر فضول ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ ایسے حالات میں جبکہ فراغت و فرصت تو کُجا پل بھر کیلئے جمعیتِ خاطر بھی نصیب نہ ہو اِس شان کے بیش بہا مجموعہ کی ترتیب و تزئین کچھ بھائی شاہد احمد صاحب ہی کا کام تھا اور یہی امر ثبوت ہے اُنکی اعلیٰ درجے کی علم پروری اور وُسعتِ ذوق کا۔

چشم بد دُور ساقی نے جس روشِ خاص سے پاکیزہ ادب کی اشاعت کا اہتمام کیا اور جو لائقِ رشک روایات قائم کیں وہ اسی کا حصہ ہیں۔ عرصہ سے ادبی دُنیا میں ساقی کے خاص نمبروں کی دُھوم ہے۔ پیشِ نظر افسانہ نمبر بھی اُن تمام مختص روایات کا حامل ہے اور باوصف بے سروسامانی کسی گذشتہ خاص نمبر سے کم نہیں بلکہ ایک حد تک فائق ہے کہ اِس مرتبہ قریب قریب تمام مضامین اعلیٰ درجے کے ہیں۔ سوائے میرے مضمون کے !۔ (اگر اسے بے جا انکسار کہا جائے تو مجھے اس زعم باطل کے اعتراف میں بھی تامّل نہیں کہ میرا مضمون بھی "شاید کسی لائق ہو" بہرحال !) یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ علیحدہ علیحدہ ہر ایک مضمون کا ذکر کیا جائے۔ اور نہ قارئین ساقی کی آزاد رائے کو متاثر کرنا منظور ہے۔ اچھے بُرے کا اندازہ اپنے اپنے ذوق کے لحاظ سے لگایا جاسکتا ہے۔ البتہ اُن تمام اہل قلم حضرات کی خدمت میں اظہارِ تشکر ضروری ہے کہ جن کے بیش قیمت رشحاتِ قلم اس افسانہ نمبر کی زیب و زینت کا باعث بنے۔ ساقی کو اُنکی سرگرم معاونت پر ہمیشہ بھروسہ رہیگا۔

بھائی شاہد احمد صاحب کی پریشانی کے سبب یہ فرض مجھے انجام دینا پڑا کہ ان تمہیدی سطور کے ساتھ ساقی کے اس انمول نمبر کو آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ ادارت گو ایک عُمدہ ارمان سہی لیکن خدا نہ کرے کبھی ایسی ضرورت پیش آئے کہ مَیں اس مرتبہ کی طرح اپنے آپ کو مجبور پاؤں۔ حق تعالیٰ مدیر ساقی کو سلامت رکھے۔ جس کا کام اُسی کو ساجے۔ دوجا کرے تو ٹھینگا باجے ــــ مجھے تو کچھ اپنی وہی "استغاثہ۔ گواہ۔ بیان۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر کہو جو کچھ کہو گے سچ سچ کہو گے" کی قسم کے بعد جھوٹ بلوانے کی فضا سازگار ہے !!۔

انصار ناصری

شیکسپیر کا مشہور ڈرامہ

تائمن اتھنزی کے حالاتِ زندگی

مترجمہ

مولا عنایت اللہ دہلوی بی۔ اے۔

تمثیل کے لوگ

تائمن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایتھنز کا ایک شریف،

لوکیوس
لوکولس } ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تائمن کے خوشامدی
سمپرونیوس

ونتیدیوس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تائمن کا ایک جھوٹا دوست

الکی بیادیس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ایتھنز کا فوجی سردار

اپی مانتوس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک اکھڑ سا فلسفی

فلے ویوس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تائمن کے گھر کا داروغہ

شاعر ۔ مصوّر ۔ جوہری اور تاجر ۔

ایک بُڈھا ایتھنزی ۔

فلے مینیوس لوکیلیوس
سرویلیوس } ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تائمن کے نوکر

کافوس
فلوتس
تی ٹس } ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تائمن کے قرضخواہوں اور اُمراے ایتھنز کے ملازمین
ہورتن سیوس
اور دیگر اشخاص

ایک غلام ۔ ایک مسخرا ۔ تین اجنبی آدمی یعنی پردیسی ۔

فری نیا
تی ماندرا } ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الکی بیادیس کی آشنائیں

کیوپڈ ۔ اور عورتیں زرہ بکتر ہتیار لگائے ۔

دیگر اُمرا ، ارکانِ مجلس سیاست ۔ سردار ۔ قزاق اور نوکر چاکر ۔

موقع تمثیل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایتھنز کا شہر اور اُس کے قریب کے جنگل ۔

جزو اوّل

پہلا منظر:- شہر ایتھنز۔ امیر تائمن کے قصر کا ایک کمرہ۔ کمرے کے مختلف دروازوں سے ایک شاعر، ایک مصور، ایک جوہری اور ایک تاجر مع چند آدمیوں کے اندر آتے ہیں۔

شاعر:- آداب عرض ہے۔

مصوّر:- آپکو مع الخیر دیکھکر بے انتہا مسرت ہوئی۔

شاعر:- مدّت سے آپ کا دیدار نصیب نہیں ہوا تھا۔ فرمائیے، دُنیا کس رفتار سے چل رہی ہے؟۔

مصوّر:- جُوں جُوں آگے بڑھتی ہے خستہ و فرسودہ ہوتی جاتی ہے۔

شاعر:- بجا ہے۔ مگر یہ تو سب ہی جانتے ہیں۔ یہ فرمائیے کہ کوئی ایسی نئی بات، عجیب واردات پیش آئی جو پہلے کبھی سُننے یا دیکھنے میں آئی (شعر پڑھتا ہے) "اے داد و دہش کے طلسم۔ یہ تیری ہی طاقت میں تھا کہ تو اتنے آدمیوں کو یہاں موجود کر دے" ان تاجر صاحب سے تو بندہ واقف ہے۔

مصوّر:- میں دونوں صاحبوں کو جانتا ہوں۔ دوسرے صاحب جوہری ہیں۔

تاجر:- واللہ یہ امیر بھی کیسا لائق اور فیاض ہے۔

جوہری:- اُس کے لائق اور سخی ہونے میں کسے کلام ہے۔

تاجر:- اپنی مثال نہیں رکھتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بجُز مسلسل خیر و خیرات دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے کے دوسری بات دُنیا میں آکر سیکھی ہی نہیں، اور ان خُوبیوں میں سب پر سبقت لے گیا ہے۔

جوہری:- میں ایک ہیرا لایا ہوں۔

تاجر:- ذرا ہمیں بھی دیکھنے دیجئے۔ کیا امیر تائمن کیلئے لائے ہیں؟

جوہری:- اگر قیمت سمجھ میں آئی تو اُنہی کے لئے سمجھئے۔ لیکن یہ بات ایسی ہے . . . . .

شاعر:- (خود اپنے سے مخاطب ہو کر شعر پڑھتا ہے) ایسے کلام میں جس میں محض ایسی باتوں کی تعریف ہو جو واقعی قابلِ تعریف ہیں اگر کسی شعر میں معاوضہ کی اُمید میں کسی چیز کی تعریف کی جاتی ہے تو ایسی تعریف سے وہ چیز مبتذل ہو جاتی ہے۔ اور کُل اشعار کی شان کو بٹہ لگ جاتا ہے۔

تاجر:- (ہیرے کو دیکھکر) یہ تو بہت ہی نادر شے ہے، اور گراں قیمت بھی ہوگی۔

جوہری:- مُلاحظہ ہو۔ اِس کے جگر میں یہ روشن تحریر کس غضب کی تڑپ رکھتی ہے۔

مصوّر:- معلوم ہوتا ہے آجکل آپ کچھ کہہ رہے ہیں۔ غالباً امیر تائمن کی تعریف میں ہوگا۔ اور اُنہی کے نام سے معنون کرنے کا قصد بھی ہوگا۔

شاعر:- جی ہاں۔ سمجھئے کہ یونہی دل سے ایک بات نکل پڑی ہے۔ ہماری شاعری کو تو درخت کا گوند سمجھئے کہ جس جرم میں پیدا ہوا اُسی سے ٹپکنے لگے۔ ہمارے دل کے شُعلے خود بخود بھڑک اُٹھتے ہیں اور بہتے پانی کی طرح ہر موج میں اُچھل اُچھل کر چھینٹے اُڑاتے ہیں۔ اچھا۔ آپ کیا لائے ہیں؟۔

مصوّر:- جی ایک تصویر ہے۔ جناب کی نظم کبتک شائع ہوگی؟۔

شاعر:- پیش ہو جانے کے بعد ہی سمجھئے شائع بھی ہو جائیگی۔ ذرا اپنے ہاتھ کی یہ تصویر تو دکھائیے۔

مصوّر:- حاضر ہے۔ شباہت خاصی آگئی۔

شاعر:- تصویر کے عُمدہ ہونے میں کیا کلام ہے۔ واہ سُبحان اللہ۔ چہرے کے خد و خال کیا خوب دکھائے ہیں۔

مصوّر:- جی ہاں۔ یہ تو معمولی بات ہے۔

شاعر:- نہیں بخدا۔ یہ مرقع نہایت قابلِ تعریف ہے۔ کھڑے ہونے کا

انداز خود اپنے مُنہ سے اپنی تعریف کر رہا ہے۔ یہ آنکھیں، واہ کیسی دماغی قوت اُن سے ظاہر ہے۔ لبوں پر سکوت ہے مگر کس درجہ تخیل اور تصور کی شان اُن سے پیدا ہو۔

مصور:۔ جی ہاں۔ بس اتنا ہی خیال فرمائیں کہ زندگی کی نقل خاصی اتر آئی ہے۔ ذرا مُوقلم کے اِس اشارے کو مُلاحظہ فرمائیں۔ بات اچھی پیدا ہو گئی ہے۔

شاعر:۔ میں تو یہ عرض کروں گا کہ فطرت کو بھی آپنے اصلاح دی ہو۔ اِن تحریروں میں صنعت نے اپنا کمال دکھایا ہے۔ زندگی سے بھی بڑھکر جان ڈالی ہے۔

(ایتھنز کی سیاسی مجلس کے چند ارکان اسٹیج پر سے گزرتے نظر آتے ہیں۔)

مصور:۔ اِس امیر کے ملنے والوں کو تو مُلاحظہ کیجیے۔

شاعر:۔ یہ جو ابھی سامنے سے گزرے ہیں یہ سب اربابِ مجلسِ سیاست تھے۔ بڑے خوش اور زندہ دل لوگ ہیں۔

مصور:۔ لیجئے اور صاحب تشریف لارہے ہیں۔

شاعر:۔ آپ مُلاقاتیوں کی اِس کثرت اور رگونا گوئی کو مُلاحظہ کرتے ہیں۔ میں نے بھی اپنی نظم کے مسودے میں ایک آدمی ایسا دکھایا ہو جسے اِس کمینی دنیا کے لوگ بڑے تپاک اور تواضع سے گلے لگتے اور اُس سے پلٹتے ہیں۔ میں اپنی روانی میں کچھ اِس مضمون پر رکا نہیں بلکہ ایک بحرِ ناپیدا کنار میں پہونچ جاتا ہوں اور راہ میں کسی منزل پر بھی کسی سے بُغض و عناد ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس پرواز میں عقاب کی طرح تیز اُڑا چلا جاتا ہوں اور فضا میں کوئی علامت اپنی پرواز کی پیچھے نہیں چھوڑتا۔

مصور:۔ آپکے اِس فرمانے کا مطلب میری سمجھ میں کیونکر آئے۔

شاعر:۔ اِس کی شرح ابھی عرض کرتا ہوں۔ آپ مُلاحظہ کرتے ہیں کہ ہر طبیعت، مزاج اور پیشے کے لوگ خوشامدیوں سے لیکر متین اور سنجیدہ خیال اصحاب تک امیر تائمن کی خدمت میں سلام کو حاضر ہوتے ہیں۔ چونکہ طبیعت فیاض خلیق اور بامروّت پائی ہو اور اسکے ساتھ دولتِ بیکراں کے مالک بھی ہیں۔ اس لئے ہر دل کو محبّت کا گرویدہ کرکے اپنی خدمت گزاری کیلئے رام کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ہر ایسے خوشامدی سے لیکر جس کا چہرہ آئینے کی طرح مکر و فریب کو ظاہر کرتا ہے اپی مانٹوس تک جسے سوائے اپنے تئیں بُرا سمجھنے کے کسی دوسری چیز سے عشق نہیں، وہ بھی سامنے آتے ہی امیر کی تعظیم میں زمین پر گھٹنے ٹیکدیتا ہو۔ اور اگر تائمن ذرا بھی اُس سے ملتفت ہوا تو خوش خوش اپنے گھر جاتا ہو۔

مصور:۔ میں نے تائمن اور اپی مانٹوس کو گفتگو کرتے سُنا ہو۔

شاعر:۔ جناب والا۔ میں نے اپنی نظم میں ایک پُر فضا اور بلند پہاڑی پر تقدیر کو اس کے تختِ حکومت پر بیٹھا دکھایا ہو۔ پہاڑی کے نیچے ہر قوم و ملّت، ہر مزاج اور طبیعت کے لوگ جمع ہیں جو اپنے اپنے کاروبار میں محنت و مشقّت میں مصروف ہیں کہ اپنی ہی شکل اوصاف کے لوگ پیدا کریں۔ مگر اِن سب میں ملکہ تقدیر کی نگاہیں حُسن پر جمی ہیں جسے میں نے امیر تائمن کی شکل و صورت میں دکھایا ہے۔ تقدیر اپنے عاج و زر کے ہاتھوں سے اپنی طرف اُسکو اشارہ کر رہی ہے کہ وہ اپنے مُلازموں اور غلاموں، حتیٰ کہ اپنے حریفوں کو اِس بلند پہاڑی پر لائے۔

مصور:۔ یہ کل صورتیں مصور کے خیال میں آسکتی ہیں۔ یہ تخت، یہ تقدیر، یہ پہاڑی اور میرے خیال میں جب نیچے کے مجمع میں سے صرف ایک شخص کو اُوپر آنے کا اشارہ کیا ہے! ور وہ عزت و مسرت حاصل کرنے کے لئے سر جھکائے اس اونچی پہاڑی پر چڑھا چلا جاتا ہے تو اِن سب چیزوں کو ہم مصور اپنے فن میں بہتر طریقے پر دکھا سکتے ہیں۔

شاعر:۔ بجا ہے، مگر آگے تو سنیئے۔ اور جو لوگ ابتک اُس کے ساتھی تھے اور اُس کے دروازے پر ہجوم کئے رہتے تھے جن میں سے بعض ایسے بھی تھے جو دولت میں اس سے بڑھکر تھے انہایت

ادب و انکسار سے سرگوشیاں کرتے ہوئے اُسکی رکاب کو پاک مقدس سمجھکر اُس کے پیچھے پیچھے قدم مارتے تازی ہوا میں اُڑے چلے جاتے ہیں۔

مصوّر:۔ ہاں آگے فرمایئے اِن لوگوں پر کیا گزری؟

شاعر:۔ جب تقدیر کا مزاج برہم ہوا اور اُس نے اپنی کیفیت بدلی اور جس کی طرف اب تک التفات تھا اُس سے بے رُخی پیدا ہوئی تو پھر جس قدر ساتھی بڑی محنت و مشقت سے اُس کے ساتھ اُوپر آئے تھے وہ سب بیٹھ جاتے ہیں اور کوئی بھی پہاڑی سے نیچے اُترنے میں اُس کا ساتھ، جو اُنہیں اُوپر لایا تھا، نہیں دیتا۔

مصوّر:۔ یہ تو معمولی بات ہے۔ میں ہزار ہا مُرقعے جن میں اسی قسم کے اشارے پائے جاتے ہیں آپ کو دکھا سکتا ہوں، جن سے معلوم ہوگا کہ تقدیر کی یہ مُسلسل ضربیں اور چوٹیں الفاظ سے کہیں بہتر مصور اپنے مُوقلم سے دکھا سکتا ہے۔ لیکن آپنے اپنی تحریر سے یہ بات امیر تائمن کو خوب جتادی کہ کمینوں کی آنکھیں سر سے اُوپر پاؤں دیکھا کرتی ہیں۔

(نفیر بجتے ہیں۔ امیر تائمن آتا ہے۔ جس قدر لوگ منتظر کھڑے تھے اُن سب سے نہایت اخلاق اور مہربانی سے بات کرتا ہے۔ ونتیدیوس نے جس آدمی کو بھیجا ہے اُس سے گفتگو کرتا ہے۔ لوکی لیوس اور ایک دوسرا مُلازم آقا کے پیچھے پیچھے ہیں۔)

تائمن:۔ کیا آپ یہ کہتے ہیں کہ وہ قید ہوگیا؟

ونتیدیوس کا مُلازم:۔ حضور، وہ قید ہوگیا ہے۔ قرضے کی رقم پانچ ٹیلنٹ ہے۔ اب وہ بالکل نادار ہے۔ قرضخواہ سختی سے تقاضا کرتے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اگر حضور منظور کریں تو ایک خط اُسکے قرضخواہوں کے نام جنہوں نے اُسے قید کرایا ہے تحریر فرمادیں اگر ایسا نہ ہوسکا تو پھر اُس کا چین اور آرام معدوم ہے۔

تائمن:۔ شریف ونتیدیوس، مَیں وہ نہیں ہوں کہ کسی کو مدد کی ضرورت ہو اور اُس سے پہلوتہی کرجاؤں۔ میں اُسے بخوبی جانتا ہوں۔ نہایت شریف آدمی ہے اور اس لائق ہے کہ اُس کی مدد کی جائے۔ چنانچہ میں اُس کی مدد ضرور کروں گا۔ مَیں اُس کا قرضہ خود ادا کرکے اُسے قید سے رہا کراتا ہوں۔

ونتیدیوس کا ملازم:۔ حضور کے الطاف و کرم نے اُسے حضور کا ہمیشہ منت گزار رکھا ہے۔

تائمن:۔ میرا سلام کہنا اور کہنا کہ میں اُس کی رہائی کیلئے رقم مطلوبہ ضرور بھیج دوں گا اور جب قید سے رہا ہو تو مجھ سے ملنے ضرور آئے۔

ونتیدیوس کا مُلازم:۔ خُدا ہمیشہ حضور کو خوش اور سلامت رکھے۔

(ایک بڈھا ایتھنزی آتا ہے)

ایتھنزی:۔ یا امیر، ایک عرض میری بھی سُنیئے۔

تائمن:۔ ہاں، ضرور کہو۔

ایتھنزی:۔ آپ کا ایک نوکر ہے جس کا نام لوکی لیوس ہے۔

تائمن:۔ ہاں۔ اس نام کا ایک نوکر میرا ہے تو۔

ایتھنزی:۔ حضور اُسے اپنے سامنے بلوائیں۔

تائمن:۔ ارے لوکی لیوس۔ یہاں ہے؟ ارے لوکی لیوس کہاں ہے؟

لوکی لیوس:۔ حاضر ہوں سرکار۔

ایتھنزی:۔ حضور یہی آدمی ہے۔ یہ حضور کا نوکر ہے اور رات کے وقت میرے گھر آتا ہے۔ میں شروع ہی سے ایک کفایت شعار، جُزرس آدمی رہا ہوں اور میری آرزو تھی کہ جو کچھ میرے پاس ہے اُس کا وارث ایک رکابیاں دھونے والے سے بہتر حیثیت کا آدمی ہو۔

تائمن:۔ اچھا آگے کیا کہنا ہے؟

ایتھنزی:۔ میری ایک اکلوتی بیٹی ہے۔ اُس کے سوا کوئی اور میرا نہیں۔ اور میرا جو کچھ روپیہ پیسہ ہے اس کی وارث یہی ایک لڑکی ہے۔ لڑکی قبول صورت ہے اور دُلہن بننے کیلئے ابھی کمسن ہے۔ خوش رو، سلیقہ شعار اور شیریں حرکات ہے۔ میں نے بہت کچھ

صرف کرکے اُسے پالا پوسا ہے۔ حضور کا یہ مُلازم اُس سے محبّت ظاہر کرنے لگا ہے۔ جناب والا مَیں چاہتا ہوں کہ اُسے میرے گھر جانے کی ممانعت کر دیں۔ میں نے بہت کہا مگر میری وہ سُنتا نہیں۔

تائمن:۔ ہمارا آدمی ایماندار ہے۔

ایتھنزی:۔ اگر ایماندار ہے تو پھر آپ ہی کی طرح وہ بھی ہوگا۔ ہاں اُس کی ایمانداری اُس کی ذاتی خوبی ہوئی۔ میری بیٹی پر اِس کا اثر کیوں ہو۔

تائمن:۔ کیا تمہاری بیٹی بھی اس سے محبت کرنے لگی ہے؟۔

ایتھنزی:۔ وہ لڑکی ناسمجھ ہے۔ محبت میں جو ہمارا حال کبھی رہ چکا ہے وہ بتاتا ہے کہ جوانی کیسی گمراہی کا زمانہ ہوتا ہے۔

تائمن:۔ (لوکی لیوس سے) کیوں کیا تمہیں اُس لڑکی سے عشق ہے؟

لوکی لیوس:۔ حضور، وہ لڑکی بھی مجھ سے محبت رکھتی ہے۔

ایتھنزی:۔ لیکن اگر اُس نے میری بغیر اجازت شادی کرلی تو خداؤں کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ دُنیا کے بھک منگوں میں سے کسی کو مَیں اپنا وارث بنالوں گا اور اس اکلوتی بیٹی کو محروم الارث کر دوں گا۔

تائمن:۔ اگر اُس کی شادی اُسی کی حیثیت کے آدمی سے ہو تو پھر کس قدر جہیز کی ضرورت ہوگی؟۔

ایتھنزی:۔ شروع میں تین ٹیلنٹ کی اور بعد کو وہ اپنے شوہر کے کُل مال کی مالک ہوگی۔

تائمن:۔ یہ مُلازم مدت سے میری خدمت کرتا آیا ہے اور جیسا کہ ایک مہربان آقا کے لئے ضروری ہے مَیں اُسے مالدار بنانے کی کوشش کروں گا۔ تم اُسے اپنی بیٹی بیاہ دو، اور جتنا تم اپنی بیٹی کو دوگے اُتنا ہی مَیں اپنی طرف سے اپنے اِس مُلازم کو دونگا۔ تاکہ مالی حالت دونوں کی ایک سی ہو جائے۔

ایتھنزی:۔ شریف و نجیب امیر۔ اس قول پر حضور اپنی عزت کو کفیل کریں۔ میری بیٹی اب اُسی کی ہے۔

تائمن:۔ آؤ ہاتھ پر ہاتھ مارو۔ ہاں، میری عزت اِس وعدے کی ضامن ہے۔

لوکی لیوس:۔ آقا۔ نہایت عجز و انکسار سے میں حضور کا شکر ادا کرتا ہوں۔ خدا سے دُعا ہے کہ کبھی مجھے مال و دولت نصیب نہ ہو تاوقتیکہ اس کا باعث حضور نہ ہوں۔

(لوکی لیوس اور بُڈھا ایتھنزی چلا جاتا ہے۔)

شاعر:۔ میری محنت اور خونِ جگر پینے کی بھی داد ملے اور مجھ پر بھی کرم فرمایا جائے۔

تائمن:۔ آپ کا بیحد ممنون ہوں۔ بہتر ہے، آپ کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہوں۔ آپ جائیں نہیں۔ تھوڑا توقف فرمائیں۔ اچھا مہربان آپکے پاس کیا ہے؟

مُصوّر:۔ جناب والا ایک تصویر ہے۔ حضور قبول فرماکر اِس ناچیز کو عزت بخشیں۔

تائمن:۔ تصویریں تو مجھے بہت ہی پسند ہیں، اور آپ کی یہ تصویر تو ہوبہو انسان معلوم ہوتی ہے۔ طبیعت کے عیوب انسان کی فطرت کے ساتھ ایک قسم کا لین دین رکھتے ہیں۔ لیکن آپ کی یہ تصویر اُن سے پاک ہے۔ مُصوّر کے ہاتھ کی بنائی ہوئی نازک صورتیں جیسی کچھ کہ وہ نظر آتی ہیں ویسی ہی ہوا بھی کرتی ہیں۔ مَیں آپ کا یہ کام بہت پسند کرتا ہوں اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں نے اِس تصویر کی قدر کیسی کی ہے۔ جب تک اس کے متعلق کچھ نہ کہوں آپ یہیں قیام فرمائیں۔

مُصوّر:۔ خُدا امیر کو ہر بلا سے محفوظ رکھے۔

تائمن:۔ اچھا شریفو۔ تھوڑی دیر کو خُدا حافظ کہتا ہوں۔ مصافحہ کیجئے۔ ہم سب کو ملکر کھانا کھانا ہوگا۔ آپ کا یہ ہیرا تو ایسا ہے کہ تعریف کرنے سے میلا ہوتا ہے۔

جوہری:۔ کیا حضور اِسے قابلِ تعریف نہیں تصوّر فرماتے؟

تائمن:۔ میں تو اِسے اتنا قابلِ تعریف سمجھتا ہوں کہ تعریف کرتے

کرتے طبیعت بالکل سیر ہو جائے۔ اور اگر قیمت بھی اس تعریف کے مطابق آپ کو دوں تو پھر میرا تو خاتمہ سمجھئے۔

جوہری:۔ اس کی قیمت وہی ہے جس قیمت پر ایسی چیزیں فروخت ہوتی ہیں۔ لیکن حضور پر روشن ہے کہ گو ایک ہی سی قیمت کی چیزیں ہوں لیکن مختلف ہاتھوں کی زیب و زینت بن کر اُن میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قدرداں ہی اس کی قیمت کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ حضور یقین جانیں کہ جب اس ہیرے کو انگوٹھی میں لگا کر دستِ مبارک میں پہنیں گے تو پھر ہیرے کی قیمت اور بڑھ جائیگی۔

تائمن:۔ واہ جناب آپنے مجھے خوب بنایا۔

تاجر:۔ نہیں حضور، جوہری نے جو بات کہی ہے وہی دُنیا کہتی ہے۔

تائمن:۔ دیکھئے یہ کون آتا ہے۔ آپ اِنکی باتوں سے گھبرائیں گے تو نہیں؟۔

(اپی مانتوس آتا ہے)

جوہری:۔ نہیں حضور، ہم بھی آپ ہی کی طرح اُن کی باتیں سُنیں گے۔

تائمن:۔ شریف مانتوس کو سلام عرض ہے۔

اپی مانتوس:۔ جب تک مَیں اپنی شرافت ثابت نہ کروں آپ اپنا سلام اپنے ہی پاس رکھیں۔ جب آپ تائمن ہی نہیں تو پھر تائمن کے کہنے سے یہ بدمعاش ایماندار کیسے ہوتے۔

تائمن:۔ آپ انہیں بدمعاش کیوں کہتے ہیں؟ آپ تو ان سے واقف تک نہیں۔

اپی مانتوس:۔ کیا یہ اتھنز کے رہنے والے نہیں ہیں۔

تائمن:۔ اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

اپی مانتوس:۔ تو پھر جو کچھ میں نے کہا اُس پر خفیف ہونے کی مجھے ضرورت نہیں۔

جوہری:۔ اپی مانتوس آپ مجھے تو جانتے ہونگے۔

اپی مانتوس:۔ تمہیں علم ہے کہ میں تم سے واقف ہوں۔ ابھی ابھی میں نے تو تمہارا نام تک لیا تھا۔

تائمن:۔ اپی مانتوس۔ تم میں غرور بڑھتا جاتا ہے۔

اپی مانتوس:۔ اگر مَیں مغرور ہوں تو صرف اس بات میں ہوں کہ تائمن کی مثل نہیں۔

تائمن:۔ آپ کہاں جا رہے تھے؟

اپی مانتوس:۔ ایک بڑے ایماندار اتھنزی کا سر پھاڑنے۔

تائمن:۔ اگر ایسا کیا تو خود بھی جان سے جانا پڑیگا۔

اپی مانتوس:۔ ایسا نہ کرنا بھی قانون کی نظر میں موت کے برابر سمجھا گیا ہے۔

تائمن:۔ آپ اس تصویر کو پسند کرتے ہیں؟

اپی مانتوس:۔ ہاں معصومیت کے اعتبار سے دلکش ہے۔

تائمن:۔ کیا مصوّر کا کمال اس میں کم ہے؟

اپی مانتوس:۔ کیا جس نے مصوّر کو بنایا تھا اُس سے بھی بہتر صنعت اس میں دکھائی ہے؟ بہرکیف وہ ایک ناپاک مخلوق ہے جسے مصوّر نے اپنی تصویر میں دکھایا ہے۔

مصوّر:۔ اپی مانتوس۔ تم تو بالکل ہی کُتّے ہو گئے ہو۔

اپی مانتوس:۔ تیری ماں بھی اُسی نسل کی ہے، تو پھر تو ہی بتا کہ میں کُتا ہوا تو میری ماں کون ہوئی؟

تائمن:۔ اپی مانتوس۔ آج تم میرے ساتھ کھانا کھانا۔

اپی مانتوس:۔ نہیں مَیں امیروں کو نہیں کھایا کرتا۔

تائمن:۔ شاید اس خیال سے کہ اگر امیروں کو کھایا تو اُن کی بیگمات خفا ہو جائیں گی۔

اپی مانتوس:۔ امیروں کو نوش کرنا تو بیگمات کی خصلت ہے۔ اسی وجہ سے تو اُن کے پیٹ بڑھ جاتے ہیں۔

تائمن:۔ تمہارا یہ خیال نہایت رکیک ہے۔

اپی مانتوس:۔ اگر آپ کا ایسا ہی خیال ہے تو پھر اُسے وضع حمل کا ایک درد سمجھیں۔

تائمن:۔ آپ اس ہیرے کو پسند کرتے ہیں؟

اپی مانتوس:۔ ایمانداری کا سودا پسند کرتا ہوں جس میں کسی کی کوڑی صرف نہیں ہوتی۔

تائمن:۔ آپکے قیاس میں یہ کتنے کا ہوگا؟

اپی مانتوس:۔ اتنے کا بھی نہیں جتنی کہ میرے قیاس کی قیمت ہوگی۔

شاعر:۔ حکیم اپی مانتوس۔ فرمائیے آجکل کیا شغل ہے؟

اپی مانتوس:۔ شاعر کا شغل جھوٹ بولنا ہے۔

شاعر:۔ کیا آپ جھوٹے نہیں ہیں؟۔

اپی مانتوس:۔ ہوں تو۔

شاعر:۔ تو پھر میں جھوٹا کیسے ہوا؟۔

اپی مانتوس:۔ تو پھر کیا آپ شاعر نہیں ہیں؟۔

شاعر:۔ میرے شاعر ہونے میں کیا کلام ہے۔

تائمن:۔ تو پھر تم جھوٹے ہوئے یا نہیں۔ آپ اپنی آخری نظم پڑھیں۔ کیا اس میں آپ نے تائمن کو ایک لائق آدمی نہیں لکھا ہے ــ؟

شاعر:۔ اس میں جھوٹ کیا ہوا؟ تائمن واقعی نہایت لائق شخص ہیں۔

اپی مانتوس:۔ ہاں وہ تمہارے لئے اور تمہاری محنت کی مزدوری دینے کیلئے بڑے لائق شخص ہیں۔ خوشامدی خوشامد پسند آدمی کی نظر میں اچھا ہوا کرتا ہے۔ خدا ایسا کرتا کہ میں بھی کوئی بڑا امیر ہوتا۔

تائمن:۔ پھر اپی مانتوس بتاؤ تم کیا کرتے؟

اپی مانتوس:۔ وہی جو اب تک کرتا رہا ہوں یعنی اپنی امیری پر ہمیشہ لعنت کرتا۔

تائمن:۔ یعنی اپنے سے آپ متنفر رہتے۔

اپی مانتوس:۔ ہاں۔

تائمن:۔ یہ کیوں؟۔

اپی مانتوس:۔ اس خیال سے کہ مجھ میں ایک امیر کا سا قہر و عتاب نہیں۔ کیا تم تاجر ہو؟

تاجر:۔ جی ہاں، میں تجارت پیشہ ہوں۔

اپی مانتوس:۔ اگر خداؤں کی طرف سے تجھ پر پھٹکار نہ برسے تو پھر تیرا یہ پیشہ تجھے ملعون کرے۔

تاجر:۔ اگر خداؤں کی طرف سے مجھ پر پھٹکار نہ برسی تو پھر تجارت مجھے کیسے ملعون ٹھہرا سکتی ہے؟۔

اپی مانتوس:۔ تجارت تیرا خدا ہے اور یہ خدا تجھ پر لعنت کرے۔

(نفیری کی آواز آتی ہے اور ایک قاصد آتا ہے۔)

تائمن:۔ یہ نفیری کی آواز کیسی؟۔

قاصد:۔ سالارِ فوج الکی بیادیس اور اُن کے جلوس میں دو سو سوار آئے ہیں۔

تائمن:۔ مہربانی کرکے اُن کی خاطر و مدارات کرو اور مجھ تک اُن کی رہنمائی کرو۔

(چند ملازم باہر چلے جاتے ہیں۔)

تائمن:۔ (شاعر اور مصور سے) آپ دونوں صاحب بغیر کھانا کھائے نہ جائیں۔ جب تک میں آپ کا شکریہ ادا نہ کرلوں آپ یہیں قیام کریں۔ کھانا ختم ہونے کے بعد میں آپ دونوں صاحبوں کے کام دیکھوں گا۔ واقعی آپ کو دیکھکر بے انتہا مسرت ہوئی۔

(الکی بیادیس مع اپنے ہمراہیوں کے آتا ہے۔)

آپ کی تشریف آوری باعثِ عزت ہوئی۔

اپی مانتوس:۔ کاش آپکے اِن چوڑے چکلے ہاتھ پاؤں جوڑوں میں درد پیدا ہو جاتا اور وہ کمزور ہو جاتے تاکہ آپ جیسے شیریں حرکات خبیثوں میں میل جول کم ہو جاتا۔ نشست و برخاست کے آئین و قوانین اور اُن کے تکلفات میں انسان کو یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ وہ آدمی سے بندر یا لنگور ہو جاتا ہے۔

الکی بیادیس:۔ مدت کا شوقِ ملاقات آج پورا ہوا۔ آپ کی امداد کا بھوکا ہو رہا تھا۔

تائمن۔ آئیے، کرم فرمائیے۔ رخصت ہونے سے قبل ہم اپنا وقت مختلف قسم کے خوشگن مشاغل اور دلچسپیوں میں بسر کریں گے۔ اندر تشریف لائیں۔

(سوائے اپی مانتوس کے سب اندر جاتے ہیں)

(دو امیر آتے ہیں)

پہلا امیر۔ اپی مانتوس کیا وقت ہوگا؟

اپی مانتوس۔ کیا دیانتدار اور ایماندار رہنے کا وقت پوچھتے ہو؟

پہلا امیر۔ دیانت داری اور ایمانداری تو ہر وقت ہمارے ساتھ ہے۔

اپی مانتوس۔ تو پھر ملعونوں اور خبیثوں میں آپ کا درجہ سب سے بڑھکر ہے کہ اس پر بھی نیک نیتی اور ایمانداری کو آپ ملحوظ نہیں رکھتے۔

دوسرا امیر۔ اپی مانتوس کیا تم بھی امیر تائمن کی ضیافت میں مدعو ہو؟

اپی مانتوس۔ جی ہاں شریک ہوں تاکہ دیکھوں خبیثوں کے پیٹ میں کھانا کیونکر اترتا ہے۔ اور شراب ان کے اپنے معدوں میں کیونکر بھرتے ہیں۔

دوسرا امیر۔ اچھا خدا حافظ، خدا حافظ۔

اپی مانتوس۔ واہ آپ بھی بڑے احمق ہی نکلے کہ دو مرتبہ مجھ کو خدا حافظ کہتے ہیں۔

دوسرا امیر۔ اس میں حماقت کیا ہوئی؟

اپی مانتوس۔ دوسرا خدا حافظ اپنے ہی پاس رہنے دیتے کیونکہ رخصت کے وقت میں تو کوئی جملہ آپ سے ایسا کہونگا نہیں۔

پہلا امیر۔ اپی مانتوس۔ گلے میں رسّی کا پھندا ڈال کر مر کیوں نہیں جاتے؟

اپی مانتوس۔ آپ کا یہ کہا میں تو کبھی کرونگا نہیں۔ بہتر ہوتا کہ یہ درخواست آپ اپنے دوستوں سے کرتے۔

دوسرا امیر۔ دور ہو سگ پلید۔ تیرا بھونکنا تو کسی طرح بند ہوگا نہیں۔ یہاں سے دفع ہو ورنہ ٹھوکریں مار کر نکال دونگا۔

اپی مانتوس۔ بہت بہتر۔ لیجئے میں بھی ایک کتے کی طرح گدھے کی دم کے پیچھے بھاگتا ہوں۔

پہلا امیر۔ یہ بدبخت تو تمام بنی نوع انسان کا دشمن اور بدخواہ ہے۔ فرمائیے، کیا اندر چلیں اور امیر تائمن کی فیاضی سے بہرہ اندوز ہوں۔ تائمن کا شوق مہمان نوازی تو اتنا بڑھا ہے کہ مہر و وفا کی روح تک قربان کر دینے میں انہیں دریغ نہیں۔

دوسرا امیر۔ اس کے سامنے تو خدائے زر پلوتو بھی اس کا ایک خادم معلوم ہوتا ہے۔ کوئی کام بھی جو اس کے لئے کیجئے ایسا نہیں کہ جس کی سات گنی سے بھی زیادہ اجرت وہ نہ دیدیتا ہو۔ اور کوئی تحفہ اسے پیش کیجئے تو ایسا نہیں جس کے بدلے میں اس سے کہیں زیادہ قیمت کا تحفہ نہ دیتا ہو۔

پہلا امیر۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی شریف اور فیاض طبیعت نے انسان کے دل میں اتنی جگہ نہیں کی ہے جیسے کہ اس امیر نے اپنی سخاوت سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔

دوسرا امیر۔ خدا اس کو اتنا ہی زردار اور دولتمند ہمیشہ رکھے۔ اندر چلئے میں آپ ہی کے پاس بیٹھونگا۔

(دونوں امیر اندر کمرے میں جاتے ہیں۔)

دوسرا منظر۔ (چوبی نفیر بجتے ہیں۔ موسیقی کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ اندر والے کمرے میں ضیافت کا سامان میزوں پر چنا ہے۔ تائمن کا داروغہ فلے ویس اور ملازم اپنی اپنی خدمت پر حاضر ہیں۔ اب امیر تائمن اور فوجی سالار الکی بیادیس، شہر کے امراء اور مجلس کے رکن اور ونٹیڈیوس آتے ہیں۔)

ونٹیڈیوس۔ نہایت شریف اور معزز تائمن۔ خداؤں کو منظور تھا

کہ آپ میرے والد کی ضعیفی کا خیال کریں اور اس کو مدتِ دراز تک زندہ وسلامت رہنے دیں۔ مرتے وقت وہ بہت خوش تھے۔ آپ کی فیاضی اس امر کی مقتضی ہے کہ جو رقم حضور نے میری رہائی کے لئے عنایت فرمائی تھی اُسے اپنے شکریہ کے ساتھ دو چند کر کے پیش کروں۔ میں جناب والا کا ہمیشہ مطیع وخدمتگزار رہونگا۔ یہ جناب کی امداد تھی جس سے مجھے قید سے رہائی نصیب ہوئی۔

تائمن:۔ نہیں ایماندار ونتیدیوس ہرگز نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ تم نے میری شفقت اور محبت کا اندازہ کرنے میں غلطی کی ہے۔ جو کچھ میں نے دیا تھا اُسے واپس لینے کا خیال مطلق نہ تھا۔ اگر کوئی چیز دیتے وقت اُس کی واپسی کا خیال آئے تو اُسے دینا نہیں کہتے ہمارے بزرگوں کو شاید اِس بات کا خیال نہ رہا ہو۔ لیکن اُن کی تقلید ہم پر لازمی نہیں۔ دولت کے عیوب بھی خوبیاں ہوا کرتے ہیں۔

ونتیدیوس:۔ واہ کیا شریف طبیعت پائی ہے۔

تائمن:۔ نہیں میرے معزز دوست یہ آدابِ مجالس اور آئینِ بزم آرائی شروع میں اس لئے وضع کئے گئے تھے کہ خفیف کاموں کو بھی ایک طرح کی جِلا اور رونق بخشدیں۔ یہ خیر مقدم کے پُرزور جُملے، مبارکباد اور مرحبا کے نعرے خالی خُولی آوازیں ہیں۔ بھلائی کر کے بھلائی کا متوقع ہونا اور بھلائی کرنے سے پہلے فکر اور افسوس کرنے لگنا جہاں سچی دوستی اور خلوص ہو وہاں نہیں ہوا کرتے۔ آپ کا یہاں تک تکلیف فرمانا میری دولت واقبال کیلئے اتنا مبارک ہے کہ میری دولت میرے حق میں اتنی مُبارک نہیں۔

پہلا امیر:۔ ہمارے معزز امیر۔ اسی خیال کا ہماری زبان سے بھی ہمیشہ اقرار ہوتا رہا ہے۔

اپی مانتوس:۔ واہ کیا خوب اقرار ہے۔ یہ کیوں نہیں فرماتے کہ اِس خیال کا آپ گلا گھونٹ رہے ہیں۔ کیا آپنے گلا نہیں گھونٹا۔

تائمن:۔ اپی مانتوس۔ تشریف لائیے۔ آپ کے آنے سے بڑی مسرت ہوئی۔

اپی مانتوس:۔ نہیں کچھ نہیں۔ میرا خیر مقدم بالکل غیر ضروری ہے۔ میں تو یہاں اِس لئے آیا ہوں کہ تھوڑی دیر میں آپ مجھے دروازے سے باہر کر دیں۔

تائمن:۔ اپی مانتوس۔ آپ کو تو غصہ بہت جلد آجاتا ہے۔ آپ میں کوئی خلط ایسی ہے جو انسان کو زیب نہیں دیتی۔ اور یہی نقص آپکی طبیعت کا عجیب ہے۔ دوستو، کسی کا مقولہ ہے کہ "غصہ تھوڑی دیر کا جنون ہے" مگر یہ صاحب تو ہر وقت غصے اور خفگی میں رہتے ہیں۔ اگر یہی خفگی ہے تو آپکو اختیار ہے کہ علیحدہ میز بچھوا کر اُس پر کھانا تناول کریں۔ کیونکہ انسان کی صحبت نہ تو آپکی طبیعت کو لگاؤ ہے اور نہ ایسی صحبت کے آپ لائق ہیں۔

اپی مانتوس:۔ میری غرض یہاں آنے سے صرف اتنی ہے کہ آپ کو خطروں سے آگاہ کرتا رہوں۔ اور صرف اِسی غرض سے آپ مجھے جہاں بیٹھا ہوں بیٹھا رہنے دیں۔ میں تو صرف یہاں کا حال دیکھنے آیا ہوں اور جو کچھ دیکھوں گا آپکو اُس سے متنبہ کر دونگا۔

تائمن:۔ مجھے آپ کی تنبیہ یا ہدایت کی ضرورت نہیں۔ چونکہ آپ اسی شہر اتھنز کے رہنے والے ہیں اِس لئے آپ کو ضیافت میں شریک کرنا میں نے ضروری سمجھا۔ میرا آپ پر کوئی بس تو ہے نہیں۔ ممکن ہے کھانے میں مصروف ہو کر آپ کی زبان تالو سے لگے۔

اپی مانتوس:۔ آپکے اِس کھانے سے میری طبیعت بیزار ہے۔ کھاؤں گا بھی تو حلق میں نوالہ پھنسے گا کیونکہ میں کبھی آپ کی خوشامد تو کرونگا نہیں۔ اے خداؤ! دیکھتے ہو کہ اِس امیر تائمن کو کتنے آدمی کھائے جاتے ہیں۔ اور اُسے اِس کی مطلق خبر نہیں۔ جب دیکھتا ہوں کہ کتنے آدمی اس کے خون میں لقمے ڈبو ڈبو کر کھا رہے ہیں تو مجھے سخت صدمہ ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑھکر دیوانگی یہ ہے کہ تائمن اپنے خون چُوسنے والوں کو خُوش بھی رکھنا چاہتا ہے۔ مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کا اعتبار کیسے کر لیتا ہے۔ میرے خیال میں تو اِن مہمانوں کو ضیافت میں شریک کرنے سے پہلے کھلا

بھیجا ہوتا کہ کھانے پر چھریاں نہ ہونگی۔ یہ بات کھانے کے لئے بھی
اچھی ہوتی اور اُن کی جانوں کو بھی خدشہ نہ رہتا۔ اور اُس کی مثال
بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ صاحب جو تائمن کے پہلو میں بیٹھے
ایک ہی روٹی سے نوالے توڑ توڑ کر کھاتے ہیں اور ایک ہی پیالے
سے دونوں شراب پیتے ہیں، یہ صاحب وہ ہیں جو سب سے پہلے اپنے
میزبان کی جان لینے کو تیار ہو جائیں گے۔ اور میرا یہ خیال ایسا ہے
جس کا ثبوت بھی مل چکا ہے۔ اگر آج کو میں بڑا آدمی ہوتا تو کھانے
پر شراب پینے سے ڈرتا کہ کہیں میرے گلے سے کوئی خوفناک آواز
نہ پیدا ہونے لگے۔ بڑے آدمی جب شراب پیا کریں تو انہیں
چاہیئے کہ گلے سے نمدہ لپیٹ لیں کہ کہیں کوئی اُن کا گلا نہ کاٹ
ڈالے۔

تائمن:۔ حاضرین، دل وجان سے عرض ہے کہ اب احباب کے جام
صحت کا دَور چلے۔

دوسرا امیر:۔ بہتر ہے کہ اُدھر سے شروع ہو۔

اپی مانتوس:۔ نہیں جناب بہتر ہو کہ ادھر سے شروع ہو۔ یہ
حضرت تو مے کشی کے مدوجزر پر کامل قدرت رکھتے ہیں۔ تائمن،
یہ جامِ صحت کے دَور تو تجھے اور تیری حیثیت کو بگاڑ کر چھوڑیں گے۔
سادہ پانی بھی تو موجود ہے۔ یہ اتنا کمزور ہے کہ اُسے پی کر آدمی گناہ
کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ اور کبھی آدمی کی یہ نوبت نہیں آنے دیتا کہ
وہ کیچڑ میں پڑا لوٹے۔ یہ پانی اور میری غذا سادگی میں ایک ہی سی
ہے۔ ضیافتوں میں تو غرور ونخوت کے وہ وہ جلوے ہوتے ہیں کہ خداؤں
کا شکر بھی نہیں کیا جاتا۔

(اپی مانتوس کھانے سے پہلے دعا پڑھتا ہے)

غیر فانی خداؤ! میں تم سے نہ دولت کا خواہاں ہوں اور نہ
اپنی بھلائی کے سوا دوسرے کی بھلائی چاہتا ہوں۔ خداؤ! مجھے کبھی
اتنا عقل کا دشمن نہ بنانا کہ میں بھولے سے بھی کسی انسان کے قول
قرار، کسی عورت کی گریہ وزاری کا یا کسی خاک پر پڑے سوتے کتے،
یا نیند سے اپنی رہائی کے لئے کسی پاسبان یا دوستوں کی ضرورت
ہوئی تو کسی دوست کے وعدوں کا اعتبار کروں۔ آمین!

اب کھانا شروع کرتا ہوں۔ گناہ کرنے والے اپنے گناہوں
میں مصروف ہیں اور مجھے کھانا نصیب ہے۔ (اپی مانتوس کھاتا پیتا
ہے۔) ان باتوں سے اپی مانتوس تیرا دل ٹھنڈا ہوتا ہے۔

تائمن:۔ سردار الکی بیادیس آپ کا دل تو اِس وقت لڑائی کے
میدان میں پڑا ہوگا۔

الکی بیادیس:۔ نہیں جناب والا۔ میرا دل تو جناب کے قدموں میں شکر
گزاری کیلئے پڑا ہے۔

تائمن:۔ دوستوں میں بیٹھکر کھانا تو کیسا آپ کا دل تو اس وقت یہ
چاہتا ہوگا کہ آپ اس وقت دشمنوں کا ناشتہ کرتے ہوتے۔

الکی بیادیس:۔ دشمن گھائل پڑے ہوں، اُن سے خون جاری
ہو، اس سے بہتر غذا کیا ہو سکتی ہے۔ میں تو اپنے عزیز سے عزیز دوست
کا ایسی ضیافتوں میں شریک ہونا پسند کرونگا۔

اپی مانتوس:۔ کاش یہ جتنے بڑے بڑے خوشامدی یہاں جمع ہیں
یہ سب تائمن تیرے دشمن ہوتے اور انہیں تو قتل کر ڈالتا اور مجھے
بھی یہ کشت وخون کا تماشہ دیکھنے کیلئے اصرار کرتا۔

پہلا امیر:۔ اے امیر۔ کیا ہمیں بھی وہ دن نصیب ہو سکتا ہے کہ ہمارے
دلی آرزوؤں سے حضور آگاہ ہوتے اور ہمارے دل بھی اپنا جوش
محبت کا اظہار کر سکتے۔ اگر ایسا موقع نصیب ہوا تو ہم اپنے کو انسانیت
کا کامل سمجھیں گے۔

تائمن:۔ بلاشبہ۔ خداؤں نے ایسا اہتمام کر دیا ہے کہ میں آپ سے مدد
کا طالب ہوں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو پھر آپ میرے دوست کیونکر ہو سکتے تھے
فیاض اور سخی ہونے کا لقب آپ نے ہزاروں دلوں سے پا رکھا ہے
تو پھر کیا آپ کی جگہ میرے دل میں نہ ہوگی۔ میں نے تو اپنے دل سے
آپ کی اتنی تعریفیں کی ہیں کہ خود میری نسبت آپ کے دل میں وہ تعریفیں
نہ ہونگی۔ خداؤ! میرا یہ قول درست ہے کہ اگر دوست سے کوئی ضرورت

نہ پڑے تو پھر دوست کا ہونا ہی بے ضرورت ہو جاتا ہے۔ اگر دوستوں سے کوئی دوست کبھی کام نہ لے تو پھر دوست ایک غیر ضروری اور بیکار چیز رہ جاتا ہے۔ پھر تو اُس کی مثال ایسی ہوگی کہ موسیقی کے ساز ہیں کہ اپنے اپنے غلافوں میں بند دیوار پر لٹک رہے ہیں اور انکی خوشنوائیاں انہیں تک ہیں۔ میں نے تو اِس کوشش میں کہ آپکے دل سے اور قریب ہو جاؤں اپنے تئیں مفلس و تنگدست بنایا ہے۔ ہم پیدا ہی اس لئے ہوتے ہیں کہ دوسروں کے ساتھ وقت پر بھلائی کریں۔ اور اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ دوست، دوست کی دولت کو اپنا ہی سمجھے۔ اور یہ بات انسان کے قلب کو کس قدر اطمینان دے سکتی ہے کہ سب بھائی ایک دوسرے کے مال و متاع پر قابو رکھتے ہوں۔ لیکن یہ مسرت وہ ہے جو پیدا ہونے سے پہلے ہی غائب ہو جاتی ہے۔ میرے آنسو اب آنکھوں میں نہیں ٹھیرتے اور اپنے دوستوں کے عیوب کو دل سے محو کر کے میں آپ کا جامِ صحت نوش کرتا ہوں۔

اپی مانتوس:۔ تائمن تو اِس لئے روتا ہے کہ دوست شراب پئیں۔

پہلا امیر:۔ اور یہی مسرت ہماری آنکھوں میں بھی ایک نوزائیدہ معصوم کی طرح پیدا ہو گئی ہے۔

اپی مانتوس:۔ واہ وا۔ جب سوچتا ہوں کہ یہ معصوم نوزائیدہ حرامی ہے تو کیسی ہنسی آتی ہے۔

تیسرا امیر:۔ حضور کی اِس وقت کی تقریر نے عرض نہیں کر سکتا کہ دل پر کیسا اثر کیا ہے۔

اپی مانتوس:۔ اس میں کیا شک ہے۔ آپکے دل پر تو بڑا ہی زبردست اثر پڑا ہے۔ (اندر سے آوازیں آتی ہیں۔)

(ایک نوکر آتا ہے۔)

تائمن:۔ یہ شور کیسا ہے؟

نوکر:۔ آقا۔ چند عورتیں آئی ہیں جو اندر آنے کی اجازت چاہتی ہیں ——!

تائمن:۔ مستورات ہیں۔ آخر وہ کیا چاہتی ہیں؟

نوکر:۔ اُنکے ساتھ اُن کا ایک نقیب ہے جس کا کام یہی ہے کہ جو کچھ وہ چاہتی ہیں اُسے بیان کرے۔

(کیوپڈ ایک حسین لڑکے کی صورت میں خدائے عشق کا رُوپ بھرے آتا ہے۔)

کیوپڈ:۔ مبارک مبارک تائمن۔ اور یہی مبارکباد اُن کو بھی پہنچے جو اِس امیر کی پیش کردہ نعمتوں سے متمتع ہیں، اے امیر، انسان کے حواسِ خمسہ آپ کو اپنا بہترین مُربی اور سرپرست سمجھتے ہیں۔ آپکا جُود و سخا آپ کو آفرین کہنے کو حاضر ہوا ہے۔ سامعہ، ذائقہ، شامہ، لامسہ، سب آپکے خوانِ نعمت سے لذت اور عزت پاکر اُٹھتے ہیں لیکن یہ مستورات محض آپکے دیدار سے محظوظ ہونے کو حاضر ہوئی ہیں۔

تائمن:۔ اُن کا یہاں تک تکلیف کرنا ہمارے لئے مبارک ہو۔ مہربانی کر کے انہیں اندر لائیے اور آمد کی خوشی میں موسیقی کے نغمے جاری ہوں۔

(کیوپڈ پھر آتا ہے اور اس کے ساتھ چند نہایت قوی ہیکل عورتیں زرہ جوشن پہنے، کمر میں تلواریں لگائے آتی ہیں۔ ہر عورت کے ہاتھ میں ایک ایک بانسری ہے جسے وہ بجاتی چلتی ہیں۔)

اپی مانتوس:۔ ارے رے رے یہ ناز و نخوت کا کیسا غول کا غول اِدھر آرہا ہے۔ واہ وا یہ تو چلتی کیا ہیں ناچتی ہیں۔ واللہ، جب زندگی کی شان و شوکت کا مقابلہ اِن چکنی چپڑی نسلِ آدم کی بیخ و بُنیاد سے کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی تمام زیبائش اور تکلفات محض جنون اور دیوانگی کا نام ہیں۔ لہو و لعب میں مُبتلا کر کے ہمیں یہ سب احمق بناتی ہیں۔ پہلے تو دوستوں میں شرابیں بھرتی ہیں اور پھر انہیں نکال کر اُن کی جگہ زہریلی نفرت اور شقاوت

بھر دیتی ہیں۔ دُنیا میں کون ایسا ہے جو خود نہیں بگڑتا یا دوسروں کو نہیں بگاڑتا۔ کون ایسا ہے جو دوست کے تحفے کو لینے میں حقارت کے ساتھ انکار کرتا ہو اور قبر میں بھی اُسے اپنے ساتھ نہ لے جاتا ہو۔ ڈر لگتا ہے کہ یہ عورتیں جو ناچنے میں زمین کو پامال کرتی ہیں کہیں مجھے بھی پامال نہ کر ڈالیں۔ اور یہی ہو بھی رہا ہے۔ ڈوبتے سُورج کو دیکھکر لوگ گھروں کے دروازے بند کر لیتے ہیں۔

(اُمرا میزبان کی تعریفیں کرتے کھانے کی میزوں سے اُٹھتے ہیں اور تائمن کے پاس آکر اپنا خلوص جتاتے ہیں، اور ہر امیر پھر ایک ایک عورت کو پسند کر کے بانسریوں کی اُونچی لَے پر ناچتا ہے۔ چوبی نفیر بجتے ہیں اور یہ تماشہ ختم ہو جاتا ہے۔)

تائمن:۔ اے حسین و پری جمال نازنینوں آپنے ہماری اِس خوشی پر شریک ہو کر سب کو نہایت محظوظ و مسرور کیا۔ اور آپنے اِس موقع پر تشریف لا کر ہمارے جلسے کو وہ رونق بخشی جو آپکے حُسن و جمال سے کم نہ تھی۔ آپنے اس محفل کو اور زیادہ روشن اور حسین کر دیا۔ جس کی وجہ سے میں آپ سب کا بیحد شکر گزار ہوں۔

عورتیں:۔ حضور یہ کیا کم ہے کہ جناب نے ہمیں ہمارے بہترین حُسن و جمال میں قبول فرمالیا۔

اپی مانتوس:۔ دُرست ہے، اگر بدترین حال میں قبول فرماتے تو پھر اِن کی غلاظت و گندگی کی انتہا نہ رہتی۔ اور پھر آپ قبول کرنے کے قابل بھی نہ ہوتیں۔

تائمن:۔ خاتونوں۔ ابھی آپ کے لئے ایک اور ضیافت باقی ہی۔ مہربانی فرما کر اس طرف متوجہ ہوں۔

عورتیں:۔ نہایت شکریہ کے ساتھ

(کیوپڈ اور عورتیں چلی جاتی ہیں۔)

تائمن:۔ فلے ویوس۔ وہ ہمارا جواہرات کا صندوقچہ یہاں لاؤ۔

فلے ویوس:۔ بہت مبارک۔ (علیحدہ کہتا ہے) ابھی اور جواہرات نذر دینے ہیں۔ جب آقا پر کوئی دُھن سوار ہوتی ہے تو پھر بیچ میں دخل دینا بس غضب ہو جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ فیاض آدمی کو اُسکی سخاوت پر ٹوکنا اُسے سخت شاق گزرتا ہے۔ لیکن جب سب دولت اُڑ جائیگی تو پھر مزاج اور بھی بگڑے گا۔ افسوس ہے کہ فیاض آدمیوں کی آنکھیں اُن کی پُشت پر نہیں ہوا کرتیں کہ جو حرکتیں وہ کر چکے ہیں اُن سے آئندہ خبردار رہیں۔

(فلے ویوس چلا جاتا ہے۔)

پہلا امیر:۔ ہمارے آدمی کہاں ہیں؟

ملازم:۔ حضور سب حاضر ہیں۔

دوسرا امیر:۔ ہماری سواری کے گھوڑے کہاں ہیں؟

(فلے ویوس صندوقچہ لیکر آتا ہے)

تائمن:۔ میرے دوستو۔ مجبو۔ صرف ایک بات عرض کرنی رہ گئی ہے۔ جناب والا سے درخواست ہے کہ یہ ہیرے کی انگوٹھی قبول فرمانے کی مجھے عزت بخشیں، اور اپنی انگلی میں اِسے پہن لیں۔

پہلا امیر:۔ اس کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو پہلے ہی بہت سے تحائف سے سرفراز ہو چکا ہوں۔

سب امیر:۔ اور یہی ہم سب کا حال ہے۔

(ایک مُلازم اندر آتا ہے)

مُلازم:۔ آقا مجلسِ سیاسی کے چند معزز اراکین تشریف لا رہے ہیں۔ گھوڑوں سے اُتر کر حضور سے ملاقات چاہتے ہیں۔

تائمن:۔ ضرور تشریف لائیں۔ اُنکی آمد تو باعثِ آبادی ما۔

فلے ویوس:۔ حضور مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ بات ایسی ہے جو حضور کی ذات سے بیحد متعلق ہے۔

تائمن:۔ اگر میری ذات سے متعلق ہے تو پھر تمہاری بات کسی اور وقت سُنوں گا۔ مہربانی کر کے ایسا اہتمام کرو کہ مہمانوں کی خاطر و مدارات میں کمی نہ ہو۔

(دوسرا مُلازم آتا ہے)

دوسرا ملازم۔ حضور! امیر لوکوس نے چار نقرئی گھوڑے مع چاندی کے ساز و سامان کے حضور کے ساتھ خلوص رکھنے کی وجہ سے پیش کئے ہیں۔

تائمن۔ میں دوست کے اس ہدیہ کو قبول کرتا ہوں۔ گھوڑوں کی نگہداشت کا انتظام اچھی طرح کیا جائے۔

(تیسرا ملازم آتا ہے)

کیوں کیا خبر ہے؟

تیسرا ملازم۔ امیرِ والاقدر لوکوس نے کل صید و شکار میں حضور کو مدعو فرمایا ہے اور یہ عمدہ نسل کے دو شکاری کتے بطور پیشکش حضور کو بھیجے ہیں۔

تائمن۔ اچھا کہدو کہ کل میں امیرِ موصوف کے ساتھ شکار میں شریک ہونے حاضر ہونگا۔ پھر ہم بھی اپنی طرف سے کوئی اچھی تقریب یا جلسہ کریں گے۔

فلے ویوس۔ دیکھئے ان باتوں کا انجام کیا ہوتا ہے حکم تو دیا جاتا ہے کہ سب کی خاطر و مدارات ہوتی رہے۔ بڑے بڑے تحائف اور بھاری بھاری رقمیں مہیا رہیں۔ اور خزانہ ہے کہ وہ بالکل خالی ہے۔ مہیا کروں تو کہاں سے؟ آقا اپنی مالی حالت سے واقف ہونا چاہتے نہیں۔ اتنی بھی اجازت نہیں کہ اپنا دل کھولکر ان کے سامنے رکھدوں اور دکھاؤں کہ وہ کیسا بے بس اور بے زر ہے۔ اب اس میں اتنی طاقت نہیں رہی کہ آقا کے حکموں کو بجا لاسکے۔ دوستوں سے آقا کے وعدے اپنے مقدور سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ سمجھئے کہ اب جو لفظ اُن کے منہ سے نکلتا ہے وہ ایک قرضہ ہوتا ہے۔ اور آقا دل کے ایسے فیاض اور نیک ہیں کہ اس قرضے کا سُود بھی ادا کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ زمینیں اور املاک جس قدر تھی وہ سب رہن ہو چکی ہے۔ بجائے اس کے کہ مجھے عزت سے اُن کی خدمت سے علیحدہ کیا جاؤں، بہتر ہوتا کہ اس وقت خود ہی آساقی سے علیحدہ ہو جاتا۔ وہ انسان بھی کیسا خوش قسمت ہوگا جس کے پاس کوئی دولت مفت کھلانے کو نہ ہو۔ چہ جائیکہ بہت سے مفت خورے دوست رکھتا ہو جو دشمنوں سے بھی بدتر ہوں۔

تائمن۔ دوستو۔ آپ اپنے حق میں بے انصافی اور اپنی خوبیوں میں کمی کرتے ہیں۔ لیجئے ہماری محبت کی یہ ناچیز نشانی قبول فرمائیے۔

دوسرا امیر۔ معمولی شکریہ نہیں بلکہ تہِ دل سے جو شکریہ نکل سکتا ہے اُسکے ساتھ میں حضور کا یہ تحفہ قبول کرتا ہوں۔

تیسرا امیر۔ حضور تو واقعی سخاوت و فیاضی کی رُوح بن گئے ہیں۔

تائمن۔ ہاں خوب یاد آیا۔ لے امیر میں ایک دن ایک عمدہ گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔ آپ نے اُس رہوار کی بہت تعریف کی تھی۔ چونکہ وہ جانور آپ کو پسند تھا اس لئے آج وہ آپ کی نذر ہے۔

تیسرا امیر۔ التماس ہے کہ اب معاف رکھا جاؤں۔

تائمن۔ جنابِ من۔ یقین فرمائیں کہ میرے علم میں کوئی انسان ایسا نہیں جو کسی سے بغیر محبت رکھے اُس کی کسی چیز کی تعریف کرتا ہو۔ میں دوست کی محبت کا اندازہ اپنی محبت سے کرتا ہوں۔ اور جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بالکل درست ہے میں کل آپ سے ملاقات کرنے حاضر ہونگا۔

تمام اُمرا۔ اس سے بڑھکر مسرت اور عزت ہمارے لئے کیا ہو سکتی ہے کہ حضور ہمارے گھر تشریف لائیں۔

تائمن۔ آپکے اس وقت تشریف لانے سے دل بہت خوش ہوا۔ جو کچھ میں نے پیش کیا وہ ہرگز کافی نہیں۔ میرے خیال میں تو اگر آج کو بادشاہتیں بھی میرے قبضہ میں ہوتیں تو دوستوں کو انہیں نذر کر دینے میں تامل نہ ہوتا۔ الکی بیادیس آپ سپاہی ہیں، سپاہی شاذو نادر ہی دولتمند ہوتا ہے۔ اس کی روزی کشت و خون اور اسکی املاک میدانِ جنگ ہے۔

الکی بیادیس۔ حضور، اُس کی یہ روزی اور املاک ویرانی اور بربادی

کا نمونہ ہوتی ہے۔

پہلا امیر:۔ امیر تائمن، ہم سب حقیقت میں آپ کے بیحد شکر گزار ہیں — !

تائمن:۔ اور یہی حال میرا ہے۔ میں آپ سب کا بیحد منت گزار ہوں۔

دوسرا امیر:۔ ہم واقعی آپکے لُطف وکرم کے بیحد ممنون ہیں۔

تائمن:۔ یہ سب آپکی نوازش ہے۔ روشنی لاؤ، روشنی لاؤ۔

پہلا امیر:۔ مسرت و شادمانی نصیب رہے۔ اقبال و دولت ہمیشہ ساتھ دے۔

تائمن:۔ احباب کی خدمت کیلئے یہ ناچیز ہر وقت حاضر ہے۔

(سب چلے جاتے ہیں، صرف تائمن اور اپی مانتوس رہ جاتے ہیں۔)

اپی مانتوس:۔ سُبحان اللہ۔ یہ بھی کیا دُھوم دھڑکا تھا۔ جُھک جُھک کر سلام ہو رہے ہیں۔ آداب و کورنشات بجالائی جارہی ہیں۔ خالی ڈھول پٹ رہے ہیں۔ مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ جن ٹانگوں سے چل کر یہ لوگ یہاں آئے تھے اُن کی قیمت ان چیزوں کے برابر بھی ہو جو انہیں نذر دی گئی ہیں۔ دوستی میں تلچھٹ کے سوا کچھ نہیں۔ جُھوٹے دلوں کو پائے ثبات کہاں۔ یہ تائمن سچا اور ایماندار احمق ہے۔ خاطر و مدارات میں اپنی کُل دولت صرف کئے ڈالتا ہے۔

تائمن:۔ اپی مانتوس اگر تم یاوہ گو اور گستاخ نہ ہوتے تو میں ضرور تم پر مہربان ہوتا۔

اپی مانتوس:۔ معاف کیجئے۔ مجھے آپ کی مہربانی کی مُطلق ضرورت نہیں۔ کیا مجھے بھی رشوت دینے کا ارادہ ہے۔ پھر آپ کی غلطیوں سے آپ کو روکنے والا اتنا بھی نہ رہیگا۔ پھر تو آپ اور بھی دل کھولکر اپنے کو تباہ و برباد کرینگے۔ تائمن، آپ لوگوں کو اتنا دیتے ہیں کہ ڈرتا ہوں کہیں آپ اپنے تئیں بھی کسی دستاویز میں لکھکر دوسرے کے حوالے نہ کر دیں۔

تائمن:۔ اپی مانتوس۔ اگر تم ہماری خوش صُحبتوں پر مُنہ آنا بند نہ کروگے تو میں ہرگز تمہاری طرف ملتفت نہ ہونگا۔ اُمید ہے کہ اکیلے آؤگے تو اچھا گلا لیکر آؤ گے۔

اپی مانتوس:۔ تائمن۔ تو نہ میری بات اب سُنتا ہے اور نہ آئندہ سُنیگا۔ اچھا، اب میں نہ آؤں گا۔ اِس طرح تو اپنا دروازہ مجھ پر بند کرتا ہے۔ افسوس، اچھی باتیں سُننے کیلئے لوگوں کے کان بہرے ہو جاتے ہیں اور خوشامد سُننے کیلئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔

(چلا جاتا ہے۔)

جُزوِ ثانی

پہلا منظر:۔ ایک رُکنِ مجلسِ سیاسی کا مکان۔

رُکنِ مجلس:۔ یہ آخری رقم پانچ ہزار تو علیحدہ رہی۔ وارو اور السیدور کے نو ہزار آتے ہیں۔ سب رقمیں ملکر پچیس ہزار ہو جاتی ہیں۔ اس پر بھی وہی پہلے سے اللّے تللّے، فضول خرچیوں کے طوفان جاری ہیں۔ یہ بات کبتک چلے گی؟ ہرگز نہیں چل سکتی۔ روپے کی مجھے بھی ضرورت رہتی ہے۔ مگر حال یہ ہے کہ اگر فقیر کا کُتا تک چُرا کر روپیہ پیدا کروں تو بھی تائمن ہی کی نذر کروں۔ ظاہر ہے کتا تو روپیہ گھڑنے سے رہا۔ اگر اپنا گھوڑا بیچکر بیس گھوڑے اس سے بھی اچھے خریدوں تو انہیں بھی تائمن کے حضور میں پیش کر دوں۔ مانگوں ایک تو ملتا نہیں، جو آئے بس دیئے جاؤں۔ دروازوں پر کوئی دربان ایسا نہیں جسکے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ نہ رہتی ہو، اور جو اُدھر سے نکلنے والوں کو خاطر و تواضع کیلئے بُلاتا نہ ہو۔ یہ حالت آخر کب تک رہیگی؟ میں

نہیں سمجھتا کہ اس کی جائداد کی حالت بھی اب تک محفوظ رہی ہو گی۔
ارے کافوس سنتا ہے۔ ذرا ادھر آ۔

(کافوس اندر آتا ہے)

کافوس:۔ حاضر ہوں۔ کیا حکم ہے؟

رکنِ مجلس:۔ ذرا کپڑے درستی سے پہن کر آ۔ اور فوراً امیر تائمن کے گھر جا کر میرے روپیہ کا تقاضا کر۔ اگر یونہی سا انکار ہو تو خاموش نہ رہنا اور نہ اُس وقت چُپ رہنا۔ جب وہ کہے کہ "اپنے آقا سے میرا اسلام کہنا" جب تک سامنے رہنا برابر سر سے ٹوپی اتارے دائیں ہاتھ میں لئے کھڑے رہنا۔ دیکھو ٹوپی ہاتھ میں اِس طرح لئے رہنا اور کہنا کہ مُنافع جو کچھ تھا وہ گیا خاک میں زرِ اصل ہی وصول ہو جائے تو غنیمت جانیں۔ کافوس سمجھا بھی۔ امیر کی بہار کا وقت اب نکل چکا ہے۔ تمسکات کی تاریخیں گزر چکی ہیں۔ اب زیادہ انتظار کرنے میں میری ساکھ بگڑتی ہے۔ اتنا اور کہنا کہ مالک کے دل میں حضور کی محبت اور عزت وہی ہے جو تھی۔ لیکن حضور کی انگلی کی چوٹ کو اچھا کرنے کیلئے وہ اپنی کمر تو نہیں توڑ سکتے۔ روپیہ ہمارا ادا ہونا چاہیئے۔ کافوس سُنتا ہے۔ مجھے تو اس بات کا پورا یقین ہے کہ کوا جس جس کے پر لگا کر طاؤس بنا ہے جب یہ پر اُکھڑ کر انکے بازوؤں میں پہونچ جائیں گے جس کے دراصل وہ ہیں تو پھر یہ نواب صاحب جو اب مُرغِ زریں بنے پھرتے ہیں نری پر نُچی ٹیری رہ جائیں گی۔ کافوس بس اب تقاضے کو جا۔

کافوس:۔ سرکار ابھی جاتا ہوں۔

رکنِ مجلس:۔ ہاں جا اور دستاویزیں بھی ساتھ لیتے جانا۔ ادائگی کی تاریخیں بھی پاس رکھیو۔ سمجھا؟

کافوس:۔ بہتر ہے سب چیزیں لئے جاتا ہوں۔

رکنِ مجلس:۔ اچھا بس اب جا۔

دوسرا منظر: تائمن کے محل کا ایک بڑا کمرہ۔

فلے ویوس بہت سے کاغذ ہاتھ میں لئے آتا ہے۔ یہ قرضخواہوں کے مطلوبے ہیں۔

فلے ویوس:۔ مزاج میں احتیاط مطلق نہیں رہی۔ ہاتھ کسی طرح نہیں رُکتا۔ خرچ کی طرف سے مطلق ہوش نہیں اور نہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دولت کی حفاظت کس طرح کی جاتی ہے۔ نہ اس کا برباد کرنا بند کرتے ہیں۔ اور نہ کبھی حساب دیکھتے ہیں کہ معلوم تو رہے کس طرح روپیہ ہاتھ سے نکلا چلا جاتا ہے۔ اور نہ اس کی فکر ہے کہ کیا ہونا چاہیئے کیا نہ ہونا چاہیئے۔ یہ بات تو ذہن میں آتی ہی نہیں کہ یہ فیاضی کتنی خلافِ عقل ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ نہ کبھی بات سُنتے ہیں اور نہ سُننے کا کچھ اثر ہوتا ہے۔ اب تو مجبوراً صاف صاف کہنا ہی پڑے گا۔ شکار سے واپس آ گئے ہیں۔ افسوس کے سوا اور کیا رکھا ہے۔

(کافوس مع وارو اور ایسیدور کے نوکروں کے آتا ہے۔)

کافوس:۔ (وارو کے نوکر سے) سلام۔ کیا روپیہ لینے آئے ہو؟

وارو کا ملازم:۔ کیا تمہاری غرض بھی یہی ہے؟

ایسیدور کا ملازم:۔ ہاں بھیا ہمارا مطلب بھی یہی ہے۔

کافوس:۔ کیا اچھا ہوتا کہ ہم سب کا روپیہ ادا ہو جاتا۔

وارو کا ملازم:۔ مجھے خوف ہے کہ ایسا نہ ہو سکیگا۔

کافوس:۔ لیجئے وہ امیر تائمن آ رہے ہیں۔

(تائمن۔ الکی بیادیس اور چند اُمرا مع چند معززین کے آتے ہیں۔)

تائمن:۔ (ہمراہیوں سے) کھانے کے بعد ہی پھر شکار کو چلنا چاہیئے۔ الکی بیادیس آپ میرے ساتھ رہیں۔ فرمائیے سب کی کیا رائے ہے۔؟

کافوس:۔ امیر بعض قرضوں کی یہ دستاویزیں ہیں۔

تائمن:۔ کہاں سے آئے ہو؟

کافوس:۔ اِسی شہر ایتھنز سے حاضر ہوا ہوں۔

تائمن:۔ اچھا ہمارے داروغہ کے پاس جاؤ۔

کافوس:۔ حضور، داروغہ صاحب نے ہمیں اسی مہینے میں کئی بار یہ کہکر ٹال مٹال دیا کہ فلاں دن آنا، فلاں دن آنا۔ ہمارے مالک کو روپیہ واپس لینے کی بہت جلد ضرورت ہے، اور انہوں نے بہت لجاجت سے عرض کیا ہے کہ جہاں سب پر حضور کی مہربانیاں ہیں اُن کا روپیہ بھی جن سے لیا تھا ادا کر دیا جائے۔

تائمن:۔ میرے مہربان دوستو۔ تم مہربانی کر کے کل صبح آؤ۔

کافوس:۔ حضور، یہ ممکن نہیں۔

تائمن:۔ بھلے مانس، صبر سے کام لے۔

وارو کا ملازم:۔ حضور ہم وارو کے پاس سے آئے ہیں۔

ایسیدور کا ملازم:۔ حضور، میں ایسیدور کے پاس سے آیا ہوں۔ انہوں نے بڑی عاجزی سے عرض کیا ہے کہ ان کا روپیہ ادا کر دیا جائے۔

کافوس:۔ کاش حضور کو علم ہوتا کہ میرے آقا کو روپے کی کیسی شدید ضرورت ہے۔

وارو کا ملازم:۔ جو مال رہن تھا اُس کی ضبطی کی تاریخ کو بھی چھ ہفتے گزر گئے ہیں۔

ایسیدور کا ملازم:۔ حضور کا داروغہ ہمیں ٹالے بالے بتا دیتا ہے۔ اس لئے مالک نے خاص طور پر ہمیں حضور کے پاس بھیجا ہے۔

تائمن:۔ مجھے ذرا دم تو لینے دو۔ (ہمراہیوں سے) آپ چلیں میں ابھی آتا ہوں۔

(الکی بیادیس اور اُمرا چلے جاتے ہیں)

(فلے ویوس سے) اِدھر آؤ۔ مہربانی کر کے بتاؤ تو یہ حال کیا ہے۔ اتنے آدمی کیوں شور مچاتے ہوئے میرے پیچھے پڑے ہیں؟ کوئی قرضہ کا روپیہ مانگتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ دستاویز کی پابندی نہیں ہوئی، کوئی روتا ہے کہ قرضے تو مدت کے واجب الادا ہو چکے ہیں اُن کی بے باقی ابھی تک نہیں ہوئی۔

فلے ویوس:۔ (قرضخواہوں کے نوکروں سے) شریفو۔ یہ وقت معاملات کے طے کرنے کیلئے مناسب نہیں۔ جبتک سرکار خاصہ تناول نہ فرمالیں خاموش رہو۔ تاکہ اس اثنا میں قرضوں کے ادا نہ ہونے کی وجہ میں سرکار کو سمجھا سکوں۔

تائمن:۔ ہاں دوستو، ایسا ہی کرو۔ فلے ویوس اِن لوگوں کی خاطر و تواضع کرتے رہو۔

(تائمن چلا جاتا ہے۔)

فلے ویوس:۔ اب سب صاحب مہربانی کر کے اُدھر بیٹھ جائیں۔

(اپی مانتوس اور ایک مسخرہ آتا ہے۔)

کافوس:۔ یارو ٹھہر جاؤ ٹھہر جاؤ۔ ابھی جاؤ نہیں۔ دیکھو یہ مسخرا اور اپی مانتوس اِدھر آ رہے ہیں۔ آؤ اُن سے باتیں کر کے ذرا جی بہلائیں۔

وارو کا ملازم:۔ جانے بھی دو۔ دُور کرو۔ کوئی دم جاتا ہے کہ یہ مسخرا ہم سب کو گالیاں دینے لگیگا۔

ایسیدور کا ملازم:۔ اِس کُتے کو تو موت لے جائے تو بھلا ہو۔

وارو کا ملازم:۔ کہو میاں مسخرے کیا حال ہے؟

اپی مانتوس:۔ کیا اپنی ہی پرچھائیں سے بات کرتے ہو؟

وارو کا ملازم:۔ میں نے آپ سے تو بات نہیں کی۔ (مسخرے سے) میاں مسخرے تم اِدھر کھسک آؤ۔

ایسیدور کا ملازم:۔ اجی واہ اپی مانتوس اچھے مسخرے کو چڑھی دی۔

اپی مانتوس:۔ تُو تو ابھی اکیلا ہی، کسی پر سوار نہیں۔

کافوس:۔ مسخرا کہاں ہے؟

اپی مانتوس:۔ یہ سوال تو پہلے ہی ہو چکا ہے۔ ارے بدمعاشو، سُود خواروں کے نوکرو! تم تو افلاس اور دولت کے درمیانی قرم اور دلال ہو۔

سب ملازم:۔ اپی مانتوس، بتاؤ ہم کون ہیں؟

ایپی مانتوس:۔ تم سب گدھے ہو۔
سب ملازم:۔ یہ کیوں؟
ایپی مانتوس:۔ یہ اس لئے کہ مجھ سے پوچھتے ہو کہ تم کون ہو۔ خود نہیں جانتے کہ کون ہو۔ مسخرے، بس تم ہی ان سے بات کرو۔
مسخرا:۔ شریفو آپ کا مزاج کیسا ہے؟
سب ملازم:۔ خدا کا فضل ہے۔ کہو تمہاری جورو کیسی ہے؟
مسخرا:۔ چولھے پر پانی چڑھایا ہے کہ ذرا کھولنے لگے تو تم مرغی کے بچوں کو اس میں اُبال ڈالے۔ کاش کورنتھ میں تم سب سے ملاقات ہوتی، پھر تماشہ دیکھتے۔
ایپی مانتوس:۔ خوب کہا۔ خدا معاف کرے۔
(ایک نوعمر غلام آتا ہے)
مسخرا:۔ دیکھو۔ یہ ہمارے آقا کا غلام ہے۔
غلام:۔ کہو کپتان کیسے ہو؟ ان عقل کے دشمنوں میں تمہارا کیا کام۔ ایپی مانتوس آپ کا کیا حال ہے؟
ایپی مانتوس:۔ میں تو دُعا مانگا کرتا ہوں کہ منہ میں زبان کی جگہ ایک ڈنڈا پیدا ہو جائے تاکہ تمہاری بات کے جواب میں ڈنڈے سے تمہاری خوب خبر لوں۔
غلام:۔ ایپی مانتوس ان خطوں پر جو پتے لکھے ہیں انہیں مہربانی کرکے پڑھ دو۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس کس کے یہ خط ہیں۔
ایپی مانتوس:۔ کیا تجھے پڑھنا نہیں آتا۔
غلام:۔ نہیں۔
ایپی مانتوس:۔ اچھا ہے۔ تجھے پھانسی ہوئی تو علم کو کوئی نقصان نہیں پہونچے گا۔ تو تو حرامی پیدا ہوا تھا اور حرامی ہوکر مریگا۔
غلام:۔ ارے جا۔ تو تو کتا پیدا ہوا تھا اور کتے ہی کی طرح فاقوں سے جان توڑے گا۔ جواب نہ دے۔ میں تو چلتا بنتا ہوں۔
ایپی مانتوس:۔ جا بے ایمان اسی طرح خدا کی برکتوں سے بھی بھاگیو۔ مسخرے میں تیرے ساتھ امیر تائمن کے پاس چلونگا۔

مسخرا:۔ کیا آپ مجھے وہیں چھوڑ جائینگے۔
ایپی مانتوس:۔ اگر تائمن گھر پر ہوا۔ تم تینوں آدمی تو سود خوروں کے نوکر ہونا؟
سب ملازم:۔ کاش سود خوار ہمارے نوکر ہوتے۔
ایپی مانتوس:۔ میں بھی یہی کہتا ہوں۔ یہ تمہاری نوکری تو ایسی اچھی ہے جیسے پھانسی دینے والے کی خدمت جو وہ کسی چور کی بجا لاتا ہے۔
مسخرا:۔ کیا تم تینوں سود خواروں کے نوکر ہو؟
سب ملازم:۔ ہیں تو۔ ارے مسخرے پوچھتا کیوں ہے۔
مسخرا:۔ میرے خیال میں سود خوار کا نوکر ہمیشہ کوئی بیوقوف ہوا کرتا ہے۔ میری جورو بھی قرض بتا دیتی ہے اور میں اس کا بیوقوف نوکر ہوں۔ جب لوگ تمہارے آقاؤں کے گھر روپیہ قرض لینے آتے ہیں تو بڑی غمگین صورت بنائے ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہاں سے نکلتے ہیں تو خوش خوش نکلتے ہیں۔ بھلا اس کی وجہ تو بتاؤ۔
وارو کا ملازم:۔ اس کی وجہ میں بتا سکتا ہوں۔
ایپی مانتوس:۔ ہاں ضرور بتاؤ تاکہ ہم تمہیں بیسواؤں کا اُستاد اور پکا بدمعاش سمجھیں مگر باوجود اس کے تمہاری عزت میں کچھ خلل نہ آئے۔
وارو کا ملازم:۔ مسخرے یہ تو بتا کہ بیسواؤں کا اُستاد کسے کہتے ہیں؟
مسخرا:۔ بیسواؤں کا اُستاد اُسے کہتے ہیں جو کپڑے اچھے پہنتا ہو اور صورت تم میں ملتی ہو، وہ ایک چھلاوا ہوتا ہے جو کبھی کسی امیر کا بھیس، کبھی جدید قانون داں، کسی بڑے فلسفی یا حکیم کا روپ بھر لیتا ہے۔ اکثر وہ ایک شہسوار کی شکل میں نظر آتا ہے اور بالعموم اُس کی روح انسان کی ہر صورت میں اسّی برس بلکہ تیرہ برس کی عمر تک نظر آتا ہے۔

وارو کا ملازم:۔ ارے مسخرے تُو نرا بیوقوف نہیں ہے۔

مسخرا:۔ اور تو بھی بالکل عقلمند نہیں ہے۔ جتنی بیوقوفی مجھ میں بھری ہو اتنی ہی عقل تجھ میں کم ہے۔

اپی مانتوس:۔ یہ جواب تو اپی مانتوس کے دینے کے لائق تھا۔

سب ملازم:۔ (بلند آواز میں) ہٹو بچو، ہٹو بچو۔ امیر تائمن آرہے ہیں ۔

(تائمن اور فلے ویوس پھر آتے ہیں۔)

اپی مانتوس:۔ (مسخرے سے) آ میرے ساتھ چل۔

مسخرا:۔ میں کسی عاشق یا کسی عورت یا بڑے بھائی کی دُم کے پیچھے نہیں لگا رہتا۔

(اپی مانتوس اور مسخرہ چلا جاتا ہے۔)

فلے ویوس:۔ (قرضخواہوں کے آدمیوں سے) مہربانی کر کے آپ سب یہیں ٹھیریں۔ میں ابھی آپ سے بات کرتا ہوں۔

(نوکر چلے جاتے ہیں۔)

تائمن:۔ مجھے تو حیرت اس بات پر آتی ہے کہ تم نے آج سے پہلے کبھی مجھے میری حالت سے آگاہ نہیں کیا۔ اگر پہلے سے کہدیتے تو میں اپنے مصارف آمدنی کے اندازے سے رکھتا۔

فلے ویوس:۔ میری گزارش حضور سُنتے کب تھے۔ میں نے بار بار عرض کیا کہ میرے لئے کوئی وقت مقرّر کیا جائے کہ مَیں عرضِ حال کروں۔

تائمن:۔ جاؤ بھی۔ ایسے وقت کہا ہوگا جبکہ میرا مزاج حاضر نہ ہوگا۔ پھر تم بھی چُپ ہو کر بات ٹالتے رہے اور اب عذر پیش کرنے لگے۔

فلے ویوس:۔ نہیں میرے اچھے آقا۔ میں بار بار حساب لایا اور پیش کیا۔ مگر حضور نے ہمیشہ کاغذات یہ کہکر سامنے سے اٹھا پھینکدیئے کہ ہمیں تم پر پورا اعتبار ہے۔ پھر جب حضور نے روپیہ کیلئے حکم دیا اور میں نے عرض کیا کہ نہیں ہے تو اس پر گو خلافِ ادب تھا، میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور حضور سے عرض کیا کہ خدا کیلئے ہاتھ روک کئے۔ جب کبھی میں نے آمدنی کی کمی اور قرضوں کی زیادتی کا تذکرہ کیا تو حضور نے پروا نہ کی اور اپنے اخراجات جو تھے وہی رکھے۔ مجھے بھی کچھ کم تکلیفیں نہیں برداشت کرنی پڑی ہیں۔ میرے فیاض امیر گو آپ دقت نکلنے کے بعد اس طرف متوجہ ہوتے ہیں مگر پھر بھی کچھ وقت ہے۔ حالت اِس وقت یہ ہے کہ اگر حضور کا کُل مال و متاع قرضوں میں لگا دیا گیا تب بھی نصف قرضہ ادا ہونا باقی رہ جاتا ہے۔

تائمن:۔ میری جس قدر املاک اور زمینیں ہیں سبکو فروخت کردو۔

فلے ویوس:۔ حضور وہ سب رہن ہیں۔ بعض قرضخواہوں نے انہیں نیلام کرا کے اپنا قرضہ وصول بھی کر لیا ہے۔ غرض بہت سی قبضہ سے نکل چکی ہیں۔ اور جو باقی ہیں وہ اتنی نہیں کہ موجودہ قرضوں کیلئے کافی ہوں۔ آنے والا زمانہ باقی ہے اور رنج کے زمانے کی فکر ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔

تائمن:۔ ہماری زمینیں تو لکدیمون تک پھیلی تھیں۔

فلے ویوس:۔ اگر حضور کو میری طرف سے کچھ شبہ ہو تو حضور حساب جانچنے والوں کو طلب کر کے کُل حساب پڑتال کرالیں۔ خدا ہمارے حال پر رحم کرے۔ حضور کے قصر میں کوئی چپہ ایسا نہیں جہاں مُفت خورے ہر وقت موجود نہ رہتے ہوں۔ اور کوئی خم خانہ ایسا نہیں جو شرابیوں کی مے نوشی پر نہ روتا ہو۔ کوئی کمرہ ایسا نہیں جہاں روشنیاں تیز نہ جلتی ہوں اور ہر وقت گانے بجانے کی آواز نہ گونجتی رہتی ہوں۔ تو پھر فرمایئے میرے لئے سوائے اسکے چارہ ہی کیا تھا کہ دولت کے اِس طرح لٹنے پر بیٹھا آنسو بہایا کروں۔

تائمن:۔ فلے ویوس، اب زیادہ کچھ نہ کہو۔

فلے ویوس:۔ خُدایا! یہ حضور کی فیاضی سی فیاضی ہے۔ آج ہی شب کو غلاموں اور دہقانوں نے کیا کچھ زیر بار نہیں کیا۔ کھاتے جاتے تھے اور حضور کا نام لیتے جاتے تھے۔ کون ہے جو تائمن کا دَم

نہیں بھرتا۔ کونسا دل و دماغ، طاقت یا مقدرت ہے جو تائمن کی تعریف میں زبان نہ خشک کرتی ہو۔ لیکن جس دن وہ معتدور جس سے یہ نام شہرت خریدی جاتی ہے نہ رہا، جہاں تیز جاڑے کی گھٹا برسنی شروع ہوئی پھر اِن مکھیوں کا پتہ بھی نہ چلے گا کہ کدھر گئیں۔

تائمن:۔ اچھا بس اب زیادہ نصیحتیں نہ کرو۔ کوئی فیاضی جس کا مقصد نیک نہ ہو یا جو خلافِ عقل و شرافت ہو مَیں نے نہیں کی۔ تم روتے کیوں ہو؟ کیا تمہیں اتنی بھی سمجھ نہیں رہی۔ آخر دوستوں کی مجھے کمی تو نہیں ہے۔ دل کو آشتی دو۔ جب مَیں خلوص و محبت کے قرابوں سے شراب اُنڈیلونگا اور دل کا حساب لوں ہوگا تو پھر جتنا چاہونگا دوستوں سے روپیہ قرض لے لونگا۔ پھر میرے ملنے والوں کی دولت میری خدمت کو حاضر ہو جائیگی۔

فلےویوس:۔ اِس کا یقین حضور ہی کے دل کو کچھ تسکین دے تو دے۔

تائمن:۔ اس وقت کی ضرورتوں کو بھی میں ایک طرح کی برکت سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس طریقے سے مَیں اپنے دوستوں کی آزمائش کر سکوں گا۔ پھر تم پر روشن ہوگا کہ میری دولت کے اندازہ کرنے میں تمہیں کس قدر غلط فہمی ہوئی ہے۔ میری دولت میرے دوست ہیں۔ دیکھو تو کیا فلیمی نیوس اور سرویلیوس، یہاں آرہے ہیں؟

(فلیمی نیوس اور سرویلیوس مع اور ملازموں کے آتے ہیں۔)

سب ملازم:۔ آقا کیا حکم ہے۔ کیا ارشاد ہے؟

تائمن:۔ مَیں تم دونوں کو مختلف دوستوں کے پاس بھیجوں گا۔ تم امیر لوکیوس کے پاس جاؤ اور تم امیر لوکیلس کے پاس جاؤ، جن کے ساتھ آج مَیں شکار میں گیا تھا۔ اور تم سمپرونیوس کے پاس جاکر میرا اسلام کہو اور کہو کہ آج تائمن کو اِس بات کا فخر حاصل ہوتا ہے کہ چند ضرورتوں کی وجہ سے وہ آپ سے روپیہ مُہیا کرنیکی درخواست کرے اور تم اُن سے پچاس ٹیلنٹ مانگنا۔

فلیمی نیوس:۔ جیسا ارشاد ہوا تعمیل ہوگی۔

فلےویوس:۔ (علیحدہ) امیر لوکیوس اور امیر لوکیلس۔ واہ کیا بات ہے!۔

تائمن:۔ اور تم مجلسِ سیاست کے رکنوں کے پاس جاؤ۔ یہ لوگ ریاست کی حفظ و سلامتی کے خیال سے میری درخواست کی طرف متوجّہ ہونگے۔ اور اُن سے کہنا کہ وہ ایک ہزار ٹیلنٹ فوراً میرے پاس بھیجدیں۔

فلےویوس:۔ گو میں پہلے ہی جانتا تھا، پھر بھی جرأت کرکے آپکی مُہر اور نام سے میں نے ان امیروں سے روپیہ قرض مانگا۔ مگر سب نے سر ہلا دیا اور مجھے کچھ بھی اُن سے نہ مل سکا۔

تائمن:۔ کیا یہ بات سچ ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے!

فلےویوس:۔ ان سب نے متفق ہو کر ایک زبان ہو کر کہا کہ آجکل وہ خود تنگدست ہو رہے ہیں۔ روپیہ کی خود انہیں ضرورت ہے اور اِس صورت میں جو کچھ ہم چاہتے ہیں کر نہیں سکتے۔ سخت افسوس ہے۔ تائمن بڑا معزز امیر ہے۔ مگر نہیں معلوم کوئی غلطی اگر ضرور ہوئی ہے۔ بعض وقت نیک طبیعتوں کو بھی جھکا لگ ہی جاتا ہے۔ کاش سب خیریت رہتی۔ سخت افسوس ہے۔ غرض اسی طرح کی چند باتیں کہہ کر اور بے لطفی کے ساتھ آنکھیں دکھا کر، ادب سے مگر ادھورے طور پر ٹوپیاں سر سے بار بار اُتار کر سرد مہری کے اشاروں سے انہوں نے مجھے خاموش کر دیا۔

تائمن:۔ اے خدا ان کو اپنے اِس کردار کی سزا دے۔ فلےویوس تم اپنی طبیعت کو افسردہ نہ کرو۔ خوش رہو۔ ان پرانے ملنے والوں میں ناشکر گزاری موروثی ہے۔ ان کا خون سرد ہو کر جم گیا ہے۔ وہ اُن کی رگوں میں اب بہتا نہیں۔ اُن میں محبت و خلوص کی گرمی باقی نہیں رہی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُلفت و مُروّت انکے دل میں نہ رہی۔ اور فطرت جب اپنے مرجع خاک کی طرف سفر

پرآمادہ ہوتی ہے تو یہ سفر اس کے لئے سفر کا نمونہ بن جاتا ہے۔
(ایک ملازم سے) ونتیدیوس کے پاس جاؤ۔ (فلے ویوس سے) کیوں اتنا رنج کرتے ہو۔ مَیں اچھی طرح آزمائش کے بعد کہتا ہوں کہ تم سچے اور ایماندار آدمی ہو۔ (نوکر سے) ونتیدیوس کا باپ حال میں مرا ہے اور اُس کی موت نے اُسے کثیر جائداد کا مالک کر دیا ہے۔ جب وہ مفلس تھا، نہ مقدور رکھتا تھا اور نہ کوئی دوست، اُس وقت میں نے پانچ ٹیلنٹ قرضہ ادا کرکے اُس کا معاملہ طے کرا دیا تھا۔ میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ ایک خاص ضرورت کے پیدا ہو جانے سے آپکے دوست تائمن چاہتے ہیں کہ وہ پانچ ٹیلنٹ آپ انہیں بھیجدیں۔ (نوکر چلا جاتا ہے) جب یہ روپیہ آجائے تو اُن تقاضا کرنے والوں کو دیدیا جائے جن کے قرضے واجب الادا ہو چکے ہیں۔ کبھی خیال نہ کرنا کہ تائمن کے دوست جو فی الحقیقت اُسکی دولت ہیں کبھی اس سے پہلو تہی کرینگے۔

فلے ویوس:۔ کاش یہی خیال میرا بھی ہوتا۔ یہی خیال فیاضی کا دشمن کا دشمن ہوتا ہے۔ چونکہ آقا خود دل صاف رکھتا ہے اس لئے سمجھتا ہو کہ دوسروں کے دل بھی ایسے ہی ہونگے۔

جزوِ ثالث

پہلا منظر:۔ امیر لوکیلس کے مکان کا ایک کمرہ۔
تائمن کا ملازم فلے مینیوس انتظار کر رہا ہے۔
لوکیلس کا ایک ملازم آتا ہے۔

ملازم:۔ میں نے اپنے آقا سے آپ کا ذکر کر دیا ہے۔ وہ خود ہی تشریف لارہے ہیں۔

فلے مینیوس:۔ شکریہ۔

(لوکیلس اندر آتا ہے)

ملازم:۔ لیجئے۔ یہ ہیں ہمارے آقائے نامدار۔

لوکیلس:۔ (علیحدہ) کیا یہ تائمن کا آدمی ہے۔ غالباً کوئی پیش کش لایا ہوگا۔ یقیناً یہی بات ہے۔ آج ہی شب کو میں نے چاندی کا ایک طشت اور آفتابہ خواب میں دیکھا ہے۔ فلے مینیوس، فلے مینیوس میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ (اپنے ملازم سے) شراب لاؤ۔ فرمائیے ہمارے معزز رئیس اعظم، پاک باز و پاک نہاد امیر کا مزاج کیسا ہے؟ یعنی آپ کے فیاض اور نیک امیر تائمن کیسے ہیں۔؟

فلے مینیوس:۔ حضور، اُن کو مزاج بخیر ہے۔

لوکیلس:۔ یہ سُنکر دل خوش ہوا کہ وہ بخیر ہیں۔ فلے مینیوس، یہ آپ کی بغل میں کیا ہے؟ فلے مینیوس کچھ بتائیے تو۔

فلے مینیوس:۔ حضور کچھ نہیں۔ ایک خالی صندوقچہ ہے۔ اور اپنے آقا کی طرف سے حضور سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اس وقت انہیں پچاس ٹیلنٹ کی سخت ضرورت درپیش ہے۔ حضور یہ رقم انہیں ہبہ فرمادیں۔ اور آپ کی اس امداد میں انہیں مطلق شبہ نہیں ہے۔

لوکیلس:۔ ہائیں! کیا یہ فرمایا ہے کہ میری امداد میں انہیں مطلق شبہ نہیں ہے؟ افسوس، لائق اور مہربان تائمن۔ اگر وہ اتنی تکلف اور شان سے نہ رہتے ہوتے تو اُن کے تلف ہونے میں کس کو شبہ ہو سکتا تھا۔ میں نے اکثر اُن کے ہاں کھانا کھایا ہے اور اس خاص مضمون کے متعلق اُن سے گفتگو بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ دوسری مرتبہ بھی اُن کے ہاں ضیافت میں اسی خیال سے گیا کہ اُن سے کہوں گا کہ اب حضور اپنے اخراجات میں احتیاط سے کام لیں، لیکن انہوں نے کسی کی بھی صلاح اس بارے میں نہ مانی۔ میرے جانے اور کہنے سے بھی کچھ نہ ہوا۔ ہر شخص میں کوئی نہ کوئی

عیب ضرور ہوتا ہے۔ میں نے کئی بار اس بات پر انہیں ٹوکا۔ لیکن وہ کبھی اس طرف متوجہ نہ ہوئے۔

(نوکر شراب لئے آتا ہے)

نوکر:۔ حضور شراب حاضر ہے۔

لوکیلس:۔ فلے مینیوس، میں نے تمہیں ہمیشہ عاقل و زیرک سمجھا ہے۔ لو تمہارا جام صحت پیتا ہوں۔

فلے مینیوس:۔ حضور کو جو جواب دینا ہو وہ فرمائیں۔

لوکیلس:۔ میں نے ہمیشہ یہ بات دیکھی ہے کہ تم کام میں بے عُذر ہو۔ جو بات تعریف کی ہو گی وہ میں تمہارے مُنہ پر کہونگا۔ اور تم اُن میں سے ہو جو عقل کی بات سمجھتے ہیں۔ اگر وقت اور موقع مُساعدت کرے تو ہر بات کو خُوب نبھالے جاتے ہو۔ تمہاری خُوبیاں (نوکر سے کہتا ہے "کھڑا کیوں ہے، جاتا کیوں نہیں" نوکر چلا جاتا ہے۔) فلے مینیوس، ذرا پاس آجاؤ۔ تمہارا آقا فی الواقعی بڑا سخی اور فیاض ہے۔ تم بڑے سمجھدار ہو۔ میرے حال سے خوب واقف ہو۔ گو اس وقت تم میرے پاس چلے آئے ہو مگر تمہیں علم ہے کہ یہ زمانہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی کسی کو محض دوستی کے بھروسے پر بلاضمانت روپیہ قرض دے۔ لو یہ تین دینار تمہاری نذر کرتا ہوں۔ تم تو بڑے اچھے ملازم ہو۔ بات ٹال جاؤ۔ اور کہدینا کہ گیا تھا مگر وہ ملے نہیں۔ اچھا خُدا حافظ۔

فلے مینیوس:۔ کیا ممکن ہے کہ دُنیا آناً فاناً میں اس طرح بدل جائے! ارے شیطان وشقی دینار تو تم اُسی کے پاس رہو جو تمہاری پرستش کرے۔

(فلے مینیوس دینار پھینکدیتا ہے)

لوکیلس:۔ اچھا اب سمجھ میں آیا کہ تم بالکل ہی احمق و بدتمیز ہو اور اپنے آقا ہی کی طرح تم بھی ہو۔

(لوکیلس چلا جاتا ہے)

فلے مینیوس:۔ کاش۔ یہ دینار وہ ہوتے جو گرم ہو کر تیرے جسم پر آبلے ڈالتے۔ خُدایا آگ میں پگھلتے سکوں سے ایسے عذاب دے۔ یہ شخص ہرگز میرے آقا کا دوست نہ تھا بلکہ دوستی کا ایک آزار و مرض تھا کیا دوستی اتنی کمزور تھی کہ دو راتیں بھی نہ گزرنے پائی تھیں کہ وہ بالکل بدل گیا۔ خُداوندا! میں اس وقت اپنے میں وہی غصہ اور ملال پاتا ہوں جو میرے آقا تائمن میں ہے۔ کیا یہ غلام اپنی عزّت کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہے کہ میرے آقا کا کھلایا ہوا کھانا اُس میں ابتک موجود نہیں ہے؟ جب یہ غلام خود زہر بن گیا تو وہ کھانا کیوں جُزوِ بدن ہو کر اُس کے اَن لگے۔ خُدا کرے کہ طرح طرح کی بیماریاں اُسے تکلیف پہونچائیں اور جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہو تو اُس کی فطرت کا وہ حصّہ جو میرے آقا کے روپے سے بنا ہے اتنی طاقت نہ رکھتا ہو کہ اُس کے امراض کو وہ دُور کر سکے اور اسی حال میں وہ سِسک سِسک کر مرے۔

دوسرا منظر:۔ شارعِ عام۔

(لوکیوس اور تین اجنبی شخص آتے ہیں۔)

لوکیوس:۔ کیا آپ امیر تائمن کو دریافت کرتے ہیں؟ وہ میرے بڑے دوست اور نہایت معزز رئیس ہیں اور بڑے شریف ہیں ——؛

پہلا اجنبی:۔ ہمیں بھی اُن کی نسبت یہی معلوم ہوا ہے۔ ہم یہاں پردیسی ہیں۔ لیکن ایک افواہ ہم نے سُنی ہے اور آپ سے کہنے کی جُرأت کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اب امیر تائمن کا وہ پہلا سا زمانہ نہیں رہا۔ مال و دولت اب اُن سے مُنہ پھیرنے لگے ہیں۔

لوکیوس:۔ نہیں، یہ بات غلط ہے۔ مجھے یقین نہیں ہو سکتا۔ دولت مال کی اُنہیں کمی نہیں ہے۔

دوسرا اجنبی:۔ نہیں، آپ یقین مانیں کہ تائمن کے آدمی میر لوکیلس کے پاس کچھ روپیہ قرض مانگنے گئے تھے۔ اور بہت

اصرار کے ساتھ اُنہوں نے یہ قرضہ مانگا تھا۔ کیونکہ کسی وجہ سے امیر
تائمن کو روپے کی سخت ضرورت درپیش تھی۔ مگر اس پر بھی امیر
لوکیلس نے روپیہ قرض دینے سے صاف انکار کیا۔

لوکیوس۔ یہ کس طرح ممکن ہے۔

دوسرا اجنبی۔ جنابِ والا! مَیں عرض کرتا ہوں کہ امیر موصوف نے
روپیہ قرض نہیں دیا۔

لوکیوس۔ یہ تو سخت حیرت کی بات ہوئی۔ مَیں خُداؤں کے سامنے
اپنی شرمندگی ظاہر کرتا ہوں کہ ایسے مُعزز شریف کو قرض دینے سے
انکار کیا گیا۔ امیر لوکیلس نے اگر ایسا کیا تو اپنی شان و عزت
کے خلاف کیا۔ رہا مَیں، تو مَیں آپ سے اتنا ضرور کہونگا کہ امیر تائمن
نے مجھے بھی قیمتی ظروف، روپیہ، زیورات اور اسی قسم کی بیکار
چیزیں دے کر خفیف سی عنایات مجھ پر بھی کی ہیں۔ لیکن امیر لوکیلس
کو جو کچھ اُنہوں نے دیا اُس کے مقابلے میں یہ چیزیں کچھ بھی نہ تھیں۔
امیر تائمن اگر میرے پاس اپنا آدمی بھیجتے تو جس قدر روپیہ اُنہوں نے
مانگا تھا اُسکے قرض دینے سے ہرگز انکار نہ کرتا۔

(سرویلیوس اندر آتا ہے)

سرویلیوس۔ واللہ! یہ محض حُسنِ اتفاق تھا کہ حضور سامنے
ہی کھڑے مل گئے۔ میں تو سخت پریشان تھا کہ جناب سے کیونکر
مُلاقات ہو۔ جنابِ والا بڑے معزز امیر ہیں۔

لوکیوس۔ اِسوقت خوب مُلاقات ہوگئی۔ فرمائیے اچھے رہے۔
اپنے نیکدل اور فیاض آقا سے جو میرے بڑے مُعزز دوست ہیں میرا
بہت بہت سلام کہدیجیے گا۔

سرویلیوس۔ اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔ جناب کے پاس
آقا نے بھیجا ہے۔

لوکیوس۔ کیا بھیجا ہے؟ مجھے تو امیر تائمن نے اپنے دامِ محبت
میں ایسا گرفتار کیا ہے کہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ بھیجتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن
معلوم نہیں کیا بھیجا ہے۔

سرویلیوس۔ حضور! اِس وقت تو آقا نے مجھے ایک کام سے
آپکے پاس بھیجا ہے اور وہ یہ ہے کہ اتنے ٹیلنٹ کی اُنہیں
فوری ضرورت پیش آئی ہے۔ یہ رقم آپ اُنہیں قرض دیں۔

لوکیوس۔ مَیں خُوب جانتا ہوں کہ بعض وقت امیر تائمن مجھ سے
مذاق بھی کیا کرتے ہیں۔ بھلا خیال تو کرو پچپن ٹیلنٹ کی اُنہیں
کیا ضرورت پیش آسکتی ہے۔

سرویلیوس۔ ممکن ہے کہ اس سے کم کی ضرورت ہو۔ اگر
ضرورت شدید نہ ہوتی تو مَیں بھی اُن کے حکم کی تعمیل پر اتنی توجہ
نہ کرتا۔

لوکیوس۔ سرویلیوس کیا واقعی سچ کہہ رہے ہو؟

سرویلیوس۔ حضور، واللہ! بالکل صحیح عرض کرتا ہوں۔

لوکیوس۔ ارے غضب! مجھ سے بھی کیا حماقت ہوئی ہے۔ کیسے
بُرے موقع پر اپنا کُل روپیہ دوسری جگہ لگا دیا۔ اور دوست
کی ضرورت رفع کرنے کی عزت سے محروم رہ گیا۔ تقدیر کی بات
ہے کہ ایک ہی دن پہلے میں نے وہ جائداد خریدلی اور اِسوقت
کی عزت نصیب نہ ہوئی۔ سرویلیوس واقعی مَیں مجبور ہوں۔
ہائے ہائے کیسی حماقت ہوئی ہے۔ مَیں تو خود ہی امیر تائمن کی
ضرورت کے خیال سے روپیہ بھیجنے والا تھا۔ چنانچہ یہ صاحب
اِس بات کے شاہد ہیں۔ لیکن اب تو جو کچھ ہوگیا وہ ہوگیا۔
میں کچھ نہیں کرسکتا۔ امیر سے میرا دست بستہ سلام کہنا اور
کہنا کہ اس مجبوری میں مجھے معاف فرمائیں گے۔ کیونکہ اِسوقت
روپیہ قرض دینا میری قوت سے باہر ہے اور میری طرف سے یہ بھی
کہنا کہ یہ میری سخت بدقسمتی ہے کہ میں ایسے مُعزز دوست کا حکم
بجا نہیں لاسکا۔ اچھے سرویلیوس اِتنا سُلوک تم میرے ساتھ
ضرور کرنا کہ جو بات جس طرح میں نے کہی ہے اُسی طرح اپنے
آقا کو پہونچا دینا۔

سرویلیوس۔ جنابِ والا جس طرح آپنے فرمایا ہے اُسی طرح

کُل باتیں عرض کردونگا۔

لوکیوس۔ سرویلیوس ایسا ہی کرنا۔ مَیں بھی اس کا بدل کر دونگا۔

(سرویلیوس چلا جاتا ہے) واقعی آپ صحیح کہتے تھے۔ امیر تائمن بگڑ چلا، اور جو ایک دفعہ گرا پھر نہیں سنبھلتا۔

(چلا جاتا ہے)

پہلا اجنبی۔ ہوسٹیلیس۔ آپنے دیکھا۔

دوسرا اجنبی۔ جی ہاں خُوب دیکھا۔

پہلا اجنبی۔ دُنیا کی یہی چال ہے۔ اور ہر خوشامدی کی طبیعت کا یہی حال ہے۔ اور دوست بھی کیسا جس کے ساتھ ہم پیالہ و ہم نوالہ رہا ہو۔ جہاں تک مجھے علم ہے تائمن اِس امیر لوکیوس کے باپ کے برابر تھا۔ ہمیشہ روپے سے، جب کبھی لوکیوس کو اپنی جائداد کیلئے ضرورت ہوئی، مدد کرتا تھا۔ تائمن ہی کے روپے سے وہ اپنے نوکروں کو تنخواہیں دیا کرتا تھا۔ کام لگاتا تھا تو مزدوروں کی مزدوری بھی تائمن ہی کے روپے سے دیتا تھا۔ لوکیوس بالعموم شراب نہیں پیتا ہے مگر جب پیتا ہے تو اُسکے لبوں پر چکنائی تائمن ہی کی چاندی کی ہوتی تھی۔ اس پر بھی اِس خباثت و ناشکری کو دیکھیے کہ تائمن کو اُس کی ضرورت کے وقت روپیہ دینے سے انکار کر دیا۔ اتنی بھی مدد کرنی گوارا نہ کی جتنی خیر خیرات والے فقیروں کی کر دیتے ہیں۔

تیسرا اجنبی۔ یہی باتیں دیکھکر تو آدمی کا ایمان لرز جاتا ہے۔

پہلا اجنبی۔ گو میں نے آج تک تائمن کے ہاں کبھی کھانا نہیں کھایا اور نہ اُس کی سخاوت اور فیاضی سے بہرہ پایا کہ اسکی دوستی کا دم بھر سکتا لیکن اس پر بھی مَیں امیر تائمن کو ایسا شریف مخیّر و مُعزز شخص سمجھتا ہوں کہ مجھ سے وہ کوئی ضرورت اپنی بیان کرتا تو اگر اپنی کُل دولت نہیں تو اُس کا نصف تو ضرور اُسے نذر کر دیتا۔ افسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ چالبازی اور ریاکاری کو اپنے ایمان اور ضمیر سے بالاتر رکھتے ہیں۔

تیسرا منظر۔ سمپرونیوس کے گھر کا ایک کمرہ۔

سمپرونیوس اور امیر تائمن کا نوکر آتا ہے۔

سمپرونیوس۔ کیا اِس معاملے میں سب سے زیادہ مجھی کو تکلیف دینی گوارا فرمائی گئی۔ اور بڑے بڑے لوگ بھی تو تھے۔ امیر لوکیلیس تھا۔ امیر لوکیوس تھا۔ اُن سے قرض مانگنے کی کوشش کی گئی ہوتی) اور اب تو ونتیدیوس بھی جسے تائمن نے قید سے چھڑا دیا ہے بڑا روپیہ والا ہو گیا ہے۔ یہ سب بھی بہت کچھ تائمن ہی کے بنائے ہوئے لوگ ہیں۔

تائمن کا ملازم۔ جناب والا۔ اِن سب کو پرکھا گیا مگر ایک بھی کھرا نہ نکلا۔ سب کھوٹے ثابت ہوئے کیونکہ سب نے روپیہ دینے سے انکار کیا۔

سمپرونیوس۔ کیوں انکار کیوں کیا؟ کیا ونتیدیوس اور لوکیلیس نے بھی انکار کیا؟ اور اس پر بھی تمہیں میرے پاس روپیہ کیلئے بھیجا۔ یہ تینوں تو تائمن کے بڑے پکے دوست تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محبّت اور صحیح فیصلہ کرنے کی قوّت تائمن میں کم رہ گئی ہے۔ تو پھر کیا آخری پناہ مجھی کو سمجھا گیا۔ جب اُسکے دوست جو شہر کے طبیبوں کی طرح مالدار ہیں جواب دے چکے تو اب علاج میرے سپرد ہوا۔ اِس سوال میں تائمن نے درحقیقت میری توہین کی ہے۔ مجھے ذلیل سمجھا۔ مَیں اُس سے خفا ہوں۔ اُسے میرے مرتبہ کا خیال نہ ہوا۔ میں تو اس میں کوئی بات عقل کی اسکی طرف سے نہیں پاتا۔ اگر ضرورت پیدا ہوئی تھی تو پہلے مجھ سے کہلا بھیجتا۔ کیونکہ میرا ایمان مجھے جتا رہا ہے کہ پہلا شخص جس نے تائمن کا تحفہ قبول کیا وہ مَیں تھا۔ کیا تائمن کی نظروں میں مَیں ایسا حقیر ہو گیا کہ اس تحفے کا بدل نہ کر سکتا تھا۔ نہیں، مَیں کچھ نہیں دے سکتا۔ میرے دوست میری اِس ذلیل پر جیسے چاہے قہقہے لگائیں اور اُمرائے ایتھنز مجھے کیسا ہی بیوقوف سمجھیں۔ اگر میرے پاس پہلے کہلا بھیجا تو جتنی رقم مانگی تھی اُس سے تگنی بھیجدیتا۔ مَیں اُسکی

بھلائی کے لئے دل میں ہمیشہ آمادہ رہتا ہوں۔ لیکن اب تم واپس جاؤ اور جو جواب اوروں نے دیئے ہیں اُنہیں میں میرا جواب بھی شامل کر دینا۔ جو میری عزت کم کرے گا اس کے لئے میرا روپیہ نہیں ہو سکتا۔

(چلا جاتا ہے)

تائمن کا ملازم:۔ سبحان اللہ! کیا خوب جواب ہے۔ یہ امیر تو بڑے ہی نیکبخت اور سچے بدمعاش نکلے۔ جس وقت شیطان نے انسان کو مکار اور چالباز بنایا تھا تو اُس وقت اُسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیا چیز تیار کر رہا ہے۔ اس کام میں شیطان نے اپنی ذرّیات میں اضافہ کیا ہے۔ اور مجھے اس میں شبہ نہیں کہ انسان کی بدمعاشیاں اور ریاکاریاں آخر میں درست کر دیں گی۔ اس امیر نے تو واقعی نہایت معقول دلیلوں سے اپنے تئیں بد اور زشت خو ثابت کیا ہے۔ ایسے نیکوں کی تقلید کو ان لوگوں کی سی شرارت سمجھنا چاہیئے جنہیں بڑی بڑی سلطنتوں میں آگ لگا کر اُنہیں پھونک دینے سے دریغ نہ ہو۔ اِس امیر کی ریاکاری کی محبت بھی اِسی قسم کی شرارت ہے۔ میرے آقا کو سب سے زیادہ بھروسا اِسی امیر پر تھا۔ یہی اُن کی آخری اُمید تھے۔ اب سب ہی تو رفوچکر ہوئے۔ صرف خدا رہ گیا۔ دوست سب مر لئے۔ وہ دروازے جو برسوں کی فیاضیوں میں کبھی پاسبان نہ رکھتے تھے اب اپنے مالکوں پر پاسبانی کریں گے۔ اور یہی سخاوت و فیاضی کا انجام ہے۔ جو دولت کی حفاظت کرنی نہیں چاہتے پھر اُنہیں اپنی حفاظت میں گھر سے نکلنا نہیں پڑتا۔

چوتھا منظر:۔ تائمن کے محل کا ایک کمرہ۔ وارو کے دونوں نوکر آتے ہیں۔ لوکیوس کا نوکر تائمن کے قرضخواہوں کے ملازموں تی لن اور ہورتن تیوز سے مُلاقات کرتے ہیں، اور یہ سب تائمن کے انتظار میں اُس کے دروازے پر موجود ہیں۔

وارو قرضخواہ کا پہلا ملازم:۔ خُوب مُلاقات ہوئی۔ تی لن اور ہورتن تیوس آپ دونوں صاحبوں کو سلام۔

ہورتن تیوس:۔ اچھا آپ لوکیوس کے ملازم ہیں۔ اتفاق ہے کہ آپ سے پھر مُلاقات ہوئی۔

لوکیوس کا ملازم:۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب ایک ہی کام کے لئے یہاں آئے ہیں۔ میرا کام تو روپیہ مانگنا ہے۔

تی لن:۔ اور یہی کام آپ کا اور ہمارا ہے۔

(فلوتس اندر آتا ہے۔)

لوکیوس کا ملازم:۔ اچھا آپ فلوتس بھی آ گئے۔

فلوتس:۔ سب صاحبوں کو سلام۔

لوکیوس کا ملازم:۔ بھائی صاحب ذرا آگے آیئے۔ آپکے خیال میں کیا بجا ہوگا۔

فلوتس:۔ نو بجنے کو ہونگے۔

لوکیوس کا ملازم:۔ اوہو! اتنا وقت آگیا۔

فلوتس:۔ کیا ابھی تک امیر تائمن برآمد نہیں ہوئے! تعجب ہے۔ وہ تو ہمیشہ سات بجے گھر سے نکلکر چلنے لگتے تھے۔

لوکیوس کا ملازم:۔ مگر اب اُن کے دن چھوٹے ہوگئے ہیں۔ مُسرف کا راستہ بھی سورج کا سا راستہ ہوتا ہے مگر فرق اتنا ہے کہ سورج اپنے راستے پر چل کر جہاں سے چلا تھا وہاں آ جاتا ہے لیکن مُسرف اپنے راستے پر چلکر پھر اس پر پلٹ کر نہیں آسکتا۔ مجھے خوف ہے کہ امیر تائمن کے خزانوں میں کڑکڑاتا جاڑا پڑنے لگا ہے۔ کتنا ہی نیچے تہ خانوں میں اترئیے ہاتھ کچھ نہیں لگتا۔

فلوتس:۔ مجھے بھی یہی خوف ہے۔

تی لن:۔ یہ بھی عجیب تماشے کی بات ہے۔ آپکے آقا نے روپیہ کیلئے آپ کو یہاں بھیجا ہے نا؟

ہورتن تیوس:۔ جی ہاں روپیہ کیلئے۔

تی لن:۔ اور آپ کے آقا تائمن کے جواہرات پہنے پھرتے ہیں،

اور انہی جواہرات کی قیمت ادا کرنے کے لئے میں روپیہ کے انتظام میں ہوں۔

ہورتن تیوس:۔ ہمارے دل کو تو یہ بات بھلی نہیں لگتی۔

لوکیوس کا ملازم:۔ دیکھئے یہ بھی کیا عجیب بات ہے یوں سمجھئے کہ اس معاملے میں جس قدر روپیہ فی الواقع تائمن پر واجب الادا ہے اُس سے کہیں زیادہ رقم لوکیوس پر واجب الادا ہو جاتی ہے۔ اور صورت یہ پیدا ہوتی ہے کہ آپ کے آقا لوکیوس تائمن کے جواہرات بھی پہنے پھرتے ہیں اور اُن کی قیمت بھی طلب کرتے ہیں۔

ہورتن تیوس:۔ مجھے تو یہ بات بہت بُری معلوم ہوتی ہے۔ واللہ مجھے خوب معلوم ہے کہ تائمن کی سب دولت آپکے آقا لوکیوس نے لوٹی ہے۔ اب آپکے آقا کی یہ احسان فراموشی تو چوری سے بھی بدتر معلوم ہوتی ہے۔

وارو کا پہلا ملازم:۔ ہاں ہماری تین ہزار اشرفیاں ہیں۔ یہ ہمیں وصول کرنی ہیں۔ تمہارا کیا چاہیئے؟

لوکیوس کا ملازم:۔ پانچ ہزار اشرفیاں مجھے لینی ہیں۔

وارو کا ملازم:۔ رقم سے معلوم ہوتا ہے کہ قرضہ بہت بڑھ چکا ہے۔ اور اس رقم سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے آقا کو تائمن کا اعتبار میرے آقا سے زیادہ تھا۔ ورنہ وہ بھی ہزار سے زیادہ نہ دیتا۔

(فلیمانوس آتا ہے۔)

فی لن:۔ یہ امیر تائمن کے ملازموں میں ہیں۔

لوکیوس کا ملازم:۔ فلیمانوس ذرا ایک بات سننا۔ کیا تمہارے آقا برآمد ہونے والے ہیں؟

فلیمانوس:۔ نہیں۔ واقعی آج وہ باہر نہیں آئیں گے۔

فی لن:۔ ہم سب امیر کے انتظار میں ہیں۔ مہربانی کرکے اسکی اطلاع کردو۔

فلیمانوس:۔ مجھے اِس بات کی اطلاع کرنے کی ضرورت نہیں۔ اُنہیں معلوم ہے کہ آپ سب تقاضے کیلئے آئے ہوئے ہیں۔

(فلے ویوس سر سے پاؤں تک قبا میں لپٹا ہوا آتا ہے۔)

لوکیوس کا ملازم:۔ واہ وا۔ تائمن کا داروغہ بھی قبا میں مُنہ چھپائے آرہا ہے۔ آقا تو چھپے بیٹھے ہی تھے آپ بھی مُنہ لپیٹے آئے ہیں۔ لیجئے وہ تو مُنہ ڈھانکے قدم بڑھاتے نکلے جارہے ہیں۔ انہیں آواز دو۔ پکارو۔

فی لن:۔ اجی حضرت آپ سُنتے ہیں۔

وارو کا دوسرا ملازم:۔ کچھ کہنے کی اجازت دیجئے۔

فلے ویوس:۔ دوست، مجھ سے کیا کہتے ہو؟

فی لن:۔ ہم یہاں روپے کے انتظار میں کھڑے ہیں۔

فلے ویوس:۔ اگر روپے کا ملنا بھی ایسا ہی یقینی ہوتا جیسا کہ تمہارا یہاں انتظار کرنا تو پھر روپیہ یقینی مل جائیگا۔ اُس وقت آپنے اپنے مطالبات کیوں پیش نہیں کئے جبکہ آپکے آقا میرے آقا کے ہاں ضیافت کھاتے تھے۔ اس وقت تو قرضوں کا ذکر بھی آتا تو سب ہمارے آقا کی خوشامد کرکے کہنے لگتے "اِس کا کیا ہے" اور قرضوں کا سُود اپنے پھٹے حلق سے نگلتے جاتے۔ یہ تمہاری غلطی ہے کہ مجھے رستے میں روکتے ہو۔ مجھے اپنی راہ جانے دو۔ مگر اتنا سمجھ لو کہ جو کام میرے یا میرے آقا کے کرنے کا تھا وہ سب ختم ہو چکا ہے۔ یعنی نہ مجھے اب حساب رکھنا ہے اور نہ آقا کو کچھ خرچ کرنا۔

لوکیوس کا ملازم:۔ مگر یہ جواب تو کافی نہیں ہے۔

فلے ویوس:۔ جواب بیشک کافی نہیں ہے کیونکہ وہ تمہاری طرح کمینہ نہیں ہے۔ تم تو بدمعاشوں کی خدمت کرتے ہو۔

(چلا جاتا ہے)

وارو کا پہلا ملازم:۔ کہو یہ دیوالئے داروغہ صاحب کیا فرما گئے۔

وارو کا دوسرا ملازم۔ کہ جو کچھ گئے ہوں مفلس ہو گئے ہیں۔ پھر یہ ہمارا انتقام کیا کچھ کم ہے۔ جس کے پاس گھر تک رہنے کو نہ رہا ہو وہ جو جی میں آئے کہے۔ بڑی بڑی عالیشان عمارتوں پر بھی وہ آوازے کسے تو کون منہ بند کر سکتا ہے۔

(سروِلیوس آتا ہے)

تی لن۔ سروِلیوس۔ اب جو کچھ جواب ہو گا ہمیں دریافت ہو جائے گا۔

سروِلیوس۔ شریفو۔ میری درخواست ہے کہ آپ کسی اور وقت آئیں تو بہتر ہو۔ اس وقت قسمیہ کہتا ہوں کہ آقا کا مزاج بہت ہی برہم ہے۔ وہ پہلی سی خوش مزاجی اب اُن میں نہیں رہی ہے۔ وہ سکے مزاج بھی ناساز ہے۔ آج وہ خوابگاہ سے باہر نہیں آئیں گے۔

لوکیوس کا ملازم۔ یہ کیا ضرور ہے کہ جو کمرے سے باہر نہ نکلیں وہ بیمار ہی ہوں۔ اور اگر تندرستی بہت ہی خراب اور لاعلاج ہو چکی ہے تو بہتر ہو کہ جس قدر قرضے ہوں اُنہیں جلد سے جلد بیباق کر کے خدا تک پہونچنے کا سیدھا راستہ نکالیں۔

سروِلیوس۔ آسمان کے خداؤ تم سنتے ہو؟

تی لن۔ یہ بات تو ایسی نہیں جسے ہم جواب سمجھیں۔

فلیمانوس۔ (اندر سے چلاتا ہے) سروِلیوس مدد کرو۔ آقا۔ آقا۔

(تائمن غصے میں بے تاب باہر آتا ہے۔ فلیمانوس پیچھے پیچھے ہے۔)

تائمن۔ کیا مجھے اپنے گھر سے باہر نکلنے کا راستہ نہ ملیگا۔ کیا کبھی میں آزاد نہ تھا۔ کیا میرا ہی گھر دشمن بنکر میرے لئے قید خانہ بنیگا۔ یہی وہ گھر ہے جس میں میں ضیافتیں کیا کرتا تھا۔ کیا وہ ضیافتیں کھانے والے بھی انسان کی طرح بے رحم اور تنگدل ہو گئے۔

لوکیوس کا ملازم۔ تی لن اپنا مطلوبہ پیش کرو۔

تی لن۔ حضور یہ میرا مطلوبہ ہے۔

لوکیوس کا ملازم۔ اور حضور یہ میرا۔

ہورتی تیوس۔ اور حضور یہ میرا ہے۔

وارو کے دونوں ملازم۔ اور حضور یہ ہمارے بل ہیں۔

تائمن۔ بس ان ہی سے مجھے مارو۔ گرا کر میرے ڈھکڑے کر دو۔

لوکیوس کا ملازم۔ حضور سخت افسوس کا مقام ہے۔

تائمن۔ میرے دل کے ٹکڑے کر کے ان ٹکڑوں سے اپنی اپنی رقمیں بنا لو۔

تی لن۔ حضور میرے پچاس ٹیلنٹ آتے ہیں۔

تائمن۔ میرا خون کر ڈالو۔

لوکیوس کا ملازم۔ حضور میری پانچ ہزار اشرفیاں ہیں۔

تائمن۔ اچھا۔ میرے خون کے پانچ ہزار قطرے بنا لو۔ انہی سے تمہارا حساب بے باق ہو جائے گا۔ تمہارا کیا آتا ہے، اور تمہارا کیا؟

وارو کا پہلا ملازم۔ حضور کیا فرماتے ہیں؟

وارو کا دوسرا ملازم۔ بھلا یہ حضور کے کہنے کی بات ہے۔

تائمن۔ مجھے پھاڑ کھاؤ۔ گرفتار کر لو۔ خدا تم پر لعنت کرے۔

(چلا جاتا ہے۔)

ہورتی تیوس۔ میرے خیال میں تو ہمارے آقاؤں کو ان قرضوں سے جو درحقیقت ان کے دل کے زخم میں ہاتھ دھو لینا چاہیئے۔ یہ قرضے لاعلاج ہیں، کیونکہ اب وہ ایک مجنوں اور دیوانے کے ذمہ نکلتے ہیں۔

(تائمن اور فلے ویوس پھر آتے ہیں۔)

تائمن۔ میرا تو ان بے ایمان قرضخواہوں نے دم ناک میں کر دیا۔

فلے ویوس۔ میرے آقا۔

تائمن۔ کیا یہاں گت بنی تھی۔

فلے ویوس۔ آقا۔ خداوند۔

تائمن:۔ اچھا تو پھر یہی ہوگا۔ سنا تو نے فلے ویوس۔

فلے ویوس:۔ کیا، پھر یہی حضور؟

تائمن:۔ ہاں مجھے اپنے دوستوں کو ایک بار پھر ضیافت میں بلانا ہے۔ یعنی لوکیوس، لوکیلس اور سمپرونیوس کو بلایا جائے۔

فلے ویوس:۔ یہ حضور کیسا حکم دے رہے ہیں۔ حضور اس وقت جو کچھ فرما رہے ہیں وہ غصہ میں کہہ رہے ہیں۔ اب تو اتنا بھی نہیں بچا کہ معمولی دسترخوان چنا جا سکے۔

تائمن:۔ اس کی مطلق پروا نہ کرو۔ فوراً بندوبست کرو۔ اسی کو ہمارا حکم سمجھو۔ ان سب کو بلاؤ۔ ایک دفعہ پھر ان بدمعاش خبیثوں کا مجمع ہو۔ باقی ہم اور ہمارے باورچی سب کچھ دیکھ لیں گے۔

پانچواں منظر:۔ تین ارکانِ مجلسِ سیاست آتے ہیں۔

پہلا رکنِ مجلس:۔ مجھے آپ کی رائے سے اتفاق کلی ہے۔

دوسرا رکن:۔ بالکل درست فرمایا۔ قانون کا فرض ہے کہ اُسے سزا دے۔

(الکی بیادیس مع ملازموں کے آتا ہے۔)

الکی بیادیس:۔ درخواست جاں بخشی کے ساتھ دعائے صحت و اقبال مجلس کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔

پہلا رکن:۔ اچھا کپتان آپ ہیں۔

الکی بیادیس:۔ میں ایک ادنیٰ فریادی ہوں اور آپ کی نیکدلی پر بھروسا کرتا ہوں۔ قانون کا سب سے بڑا وصف رحمدلی ہے۔ اور کوئی شخص بجز ظالم و جفاکار کے قانون کو سختی سے کام میں نہیں لاتا۔ اس لئے عرض کرتا ہوں کہ میرے ایک دوست پر تقدیر اور فلک نے برا وقت لایا ہے۔ یہ دوست غصے کی حالت میں قانون کی گرفت میں آگیا ہے۔ اور جو لوگ قانون کے گہرے پانی میں جا گھستے ہیں اُن کو ڈوبنا ہی پڑتا ہے۔ قطع نظر اُس کی بدقسمتی کے وہ ایک نیکبخت آدمی ہے۔ اور نہ اُس نے اپنے معاملے کو بزدلی دکھا کر خراب کیا ہے۔ اُس کے قصور میں عزت و غیرت دونوں اتنی شامل ہیں کہ انہی سے اس کے جرم کی پاداش ہو جاتی ہے۔ شریفانہ غصے اور اچھی نیت کے ساتھ یہ دیکھ کر کہ اُس کی نیکنامی خاک میں مل جاتی ہے وہ دشمن سے لڑا اور جب غصہ کم ہوا تو اُس نے ضبط و تحمل سے کام لیا جسے اب وہ اپنی صفائی کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔

پہلا رکن:۔ آپ باطل کو حق بنانے میں بہت کوشش کر رہے ہیں اور ایک بدنما واقعے کو اچھی شکل میں ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اپنی اس تقریر میں اتنی زحمت اٹھا رہے ہیں کہ قتل انسان کے وقوعے کو ایک جائز فعل سمجھا جائے۔ آپ ایک نامعقول نزاع کو ہمت و مردانگی کا سر کا تاج بناتے ہیں۔ یہ ہمت و مردانگی ناجائز طریقے پر پیدا ہوتی ہے۔ اس قسم کی جرأت و مردانگی نے اُس وقت دنیا میں قدم رکھا تھا جبکہ اس میں مختلف فرقے اور فریق نئے نئے پیدا ہو رہے تھے۔ بہادری یہی ہے جو عقل کے ساتھ تکلیف برداشت کرے۔ سب سے بڑی بات جو انسان اپنی زبان سے نکال سکتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی غلط کاریوں کو اپنا ظاہر بنا کر انہیں پوشاک کی طرح پہنے پھرے اور وہ بھی بے احتیاطی کے ساتھ۔ کبھی اپنے دل کو خطرے سے بچانے کے لئے اُن نقصانات پر غور نہ کرے جو اُس نے دوسروں کو پہونچائے ہیں۔ اگر جرائم بڑی حرکتیں ہیں اور ہمیں موت کا حکم دینے پر مجبور کرتے ہیں تو پھر کیسی غلطی ہوگی کہ بری حرکت سے کسی کی جان کو خطرہ ہو۔

الکی بیادیس:۔ حضور بجا ہے۔

پہلا رکن:۔ آپ سنگین گناہوں کو اچھی شکل میں نہیں دکھا سکتے۔ انتقام لینا مردانگی نہیں ہے بلکہ تحمل اور برداشت سب سے بڑی مردانگی ہے۔

الکی بیادیس:۔ ارکانِ مجلس۔ اگر میں اس وقت ایک فوجی کپتان

کی حیثیت سے تقریر کروں تو آپ مہربانی کرکے مجھے معاف فرمائینگے۔
بیوقوف کیوں لڑائی پر جاتے ہیں۔ کیوں دشمنوں کی دھمکیاں برداشت
نہیں کرتے۔ کیوں ایسی باتوں سے قطع نظر نہیں کرتے۔ کیوں اس
اُمید میں خاموش نہیں بیٹھے رہتے کہ دشمن خود اپنا گلا کاٹ ڈالیگے۔
اگر برداشت و تحمل ہی میں مردانگی ہے تو پھر ملک سے باہر جاکر
لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر یہی بات ہے تو عورتیں مردوں سے
زیادہ دلیر اور باہمت ہیں کہ وہ گھر میں بیٹھی سب کچھ برداشت کرتی
ہیں۔ اور ایک گدھا بہ نسبت ایک شیر کے زیادہ لائق سالارِ فوج
بن سکتا ہے۔ اور وہ مجرم جو زنجیروں کے بوجھ میں مر رہا ہے
قاضی سے زیادہ عاقل و دانشمند ہے۔ اگر عقل اسی میں ہے کہ
تکلیف اُٹھائی جائے۔ تو اے اربابِ مجلس چونکہ آپ بڑے آدمی
ہیں اس لئے رحم کے ساتھ بھلائی کیجیے۔ وہ کون ہے جو دن دہاڑے
کے قتل میں بے جا جرأت و جسارت کو بُرا نہ سمجھتا ہو۔ قتل کرنا میں
تسلیم کرتا ہوں کہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ ہے، لیکن اگر
اپنی حفاظت میں ہو تو رحم بتاتا ہے کہ وہ انصاف ہے۔ غصہ و غضب
میں آنا خدا ترسی کے خلاف ہے۔ مگر وہ کون ہے جسے غصہ نہیں آتا۔
انہی باتوں کو خیال میں رکھکر جرم کا اندازہ فرمائیں۔

دوسرا رُکن:۔ آپ کی یہ تقریر لاحاصل ہے۔

الکی بیادلیس:۔ لاحاصل۔ مجرم کی خدمات پر نظر کی جائے۔
لکدیمون اور بیہر نطیہ میں اُس نے ملک کی کیسی کیسی خدمتیں کیں۔
یہ باتیں اس کی جان بخشی کیلئے کافی ہیں۔

پہلا رکن:۔ وہ خدمتیں کیا تھیں؟

الکی بیادلیس:۔ معزز ارکان۔ مَیں عرض کرتا ہوں کہ اُسکی خدمتیں
اچھی تھیں۔ آپ کے بہت سے دشمنوں کو اُس نے لڑائی میں قتل
کیا۔ پچھلی لڑائی میں اُس نے بڑی جوانمردی سے کام کیا اور دشمنوں
میں سے بہت لوگوں کو زخمی کیا۔

دوسرا رُکن:۔ اُس نے ضرورت سے زیادہ لوگوں کو زخمی کیا۔ وہ
تو مشہور و معروف فسادی اور فتنے برپا کرنے والا آدمی ہے۔ وہ
ایک ایسے گناہ کا خوگر ہے جس میں وہ ہمیشہ غرق رہتا ہے اور
ہمت و مردانگی کو بھی اُس کا یہ گناہ معدوم کردیتا ہے۔ اگر دشمن
بھی نہ ہوں تو یہ گناہ اُس پر غلبہ پانے کیلئے کافی ہوتا ہے اور اسی
گناہ کی مدہوشی میں اُس نے بہت سے قتل کئے ہیں اور سازشیں
برپا کی ہیں۔ ہم سے بھی کہا گیا ہے کہ اُس کی زندگی بڑے شور و شغب
کی ہے اور اُسکی شراب خواری خطرناک ہے۔

پہلا رُکن:۔ ہم مجرم کو سزائے قتل کا حکم دیتے ہیں۔

الکی بیادلیس:۔ یہ اُس کی سخت بدقسمتی ہے۔ بہتر ہوتا کہ وہ لڑائی
میں کہیں مارا جاتا۔ معزز اراکین اگر اس میں کوئی خوبی نہ ہو مگر
یہ سچ ہے کہ وہ اپنے قوی بازو سے اپنی جان خرید سکتا ہے۔ اور
کسی کا احسان ماننے کی اُسے ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن اب میری
التجا ہے کہ اگر اُس کے کچھ حقوق نہیں ہیں تو میرے حقوق کا لحاظ
فرماکر اُس پر رحم کیا جائے۔ بہرکیف میں جانتا ہوں کہ آپ کی
بزرگی و سیادت اِس امر کی مقتضی ہے کہ ریاست میں امن و
سلامتی قائم رہے۔ میں نے بھی اپنے ملک کیلئے چند فتوحات کی ہیں۔
اور مَیں اپنی عزت کو ضامن کرکے کہتا ہوں کہ آئندہ اُس کی حالت
بہتر ہوجائے گی۔ اگر قانوناً اِس وقت وہ سزائے موت کا مستوجب
ہے تو بہتر ہے کہ کسی لڑائی میں بھیجکر اُسے لڑکر مرجانے دیا
جائے۔ اور اگر قانون سختی سے اتنا پابند کرتا ہے تو لڑائی میں
بھی کچھ کم پابندی نہیں ہوتی۔

پہلا رُکن:۔ ہم پر تو قانون کی پابندی لازمی ہے۔ پس مجرم کے
لئے موت کی سزا تجویز ہوچکی۔ اب آپ مطلق اِس مقدمے میں
اصرار نہ کریں ورنہ ہم آپ سے سخت ناراض ہوجائیں گے بھائی
ہو یا دوست۔ جو دوسرے کا خون کرے اُس کی جان جانی
ضروری ہے۔

الکی بیادلیس:۔ کیا یہ مجلس کا قطعی فیصلہ ہے؟ اے اربابِ مجلس

ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا۔ معزز ین التماس ہے کہ آپ مجھے جانتے ہیں کہ مَیں کیسا آدمی ہوں۔

دوسرا رُکن:۔ اِس سے آپکا کیا مطلب ہوا؟

الکی بیادیس:۔ میری خدمات نہ بھُولی جائیں۔

دوسرا رُکن:۔ یہ آپنے کیا کہا؟۔

الکی بیادیس:۔ معلوم ہوتا ہے کہ زمانے نے آپکے دِلوں سے مجھے فراموش کر دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ مَیں آپ سے کوئی التجا کرتا اور اُس پر التفات نہ ہوتا۔ میرے پُرانے زخم پھر ہرے ہو جاتے ہیں۔

پہلا رُکن:۔ کیا تم میں اتنی تاب و طاقت ہے کہ ہمارا قہر و عتاب برداشت کرسکو۔ اگر ہے تو سنو۔ ہمارا عتاب نہایت مختصر اور پُرمعنی الفاظ میں یہ ہے کہ ہم تم کو ہمیشہ کیلئے یہاں سے جلاوطن کرتے ہیں۔

الکی بیادیس:۔ مجھے اور جلاوطنی کا حکم! بہتر تو یہ ہے کہ آپ اپنی کمزوریوں کو اپنے سے دُور کریں۔ سُود خواری بند کریں جس نے تمام مجلس کو دُنیا میں بدنام کر رکھا ہے۔

پہلا رُکن:۔ اگر دو دن کے بعد تم پھر اتھینز کے شہر میں نظر آئے تو ہمارا عتاب تم پر نہایت سختی سے ظاہر ہوگا۔ ہمیں زیادہ غصہ نہ دلاؤ ورنہ تم فوراً قتل کر دئے جاؤ گے۔

(مجلس کے سب رُکن اجلاس سے اُٹھ جاتے ہیں۔)

الکی بیادیس:۔ خُدا تمہیں اتنی عمریں دیں کہ تم ہڈی اور چمڑا رہ جاؤ اور لوگوں کو تمہاری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ ہو۔ میری حالت اِس وقت ایک مجنوں شخص سے بھی بدتر ہے۔ مَیں وہ ہوں جس نے تمہارے دُشمنوں کو اُس وقت تم سے دُور رکھا جبکہ تم اپنے گھروں میں چین سے بیٹھے روپوں اور اشرفیوں کی تھیلیاں گنتے تھے۔ اور بھاری شرح سُود پر لوگوں کو قرضے دیتے تھے۔ میری ساری دولت اُس وقت میرے جسم کے زخم تھے۔ کیا یہ سب کچھ اسی دن کیلئے کیا تھا۔ کیا یہی مرہم ہے جو سُود خوار اربابِ مجلس اپنی فوجی سالار کے زخموں پر رکھتے ہیں۔ جلاوطنی۔ یہ حکم میرے لئے بُرا نہیں ہے اور نہ میں جلاوطن ہونے سے ناخوش ہوں کیونکہ یہ میرے قہر و غضب کے پورا کرنے کیلئے اچھی سبیل ہوگی۔ پھر میں اتھینز پر حملہ کرکے اُسے غارت اور ویران کرسکوں گا۔ میں اپنی فوج سے جو اِس وقت مجلس سے ناراض ہے کہونگا کہ جوش میں آکر ہمت سے کام لو۔ مُلکوں اور حکومتوں سے اختلاف کرکے لڑائی لڑنی ہمارے لئے باعثِ عزت ہے۔ سپاہی کو اپنے ساتھ کسی کی بدسلوکی ایسی ہی شاق گزرتی ہو جیسی بندے کی نافرمانی خُدا کو۔

چھٹا منظر:۔ تائمن کے محل میں ضیافت کا کمرہ۔

موسیقی جاری ہے۔ مُلازمین حاضر ہیں۔ اُمراء، عمائد

ارکانِ مجلسِ سیاست اور اَور لوگ مختلف دروازوں

سے کمرے میں آتے ہیں۔

پہلا امیر:۔ تسلیمات عرض ہے۔

دوسرا امیر:۔ میں بھی آداب بجالاتا ہوں۔ میرے خیال میں اُس روز ہمارے معزز امیر تائمن نے ہم لوگوں کی محض آزمائش کی تھی۔

پہلا امیر:۔ مَیں بھی اسی خیال میں حیران و پریشان تھا کہ جناب سے اِس وقت مُلاقات ہوگئی۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ تائمن کی حالت اتنی خراب تھی جتنی کہ اُس دن چند دوستوں کے آزمانے کیلئے اُس سے ظاہر ہوئی تھی۔

دوسرا امیر:۔ ہاں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ورنہ آج یہ نئی ضیافت کس طرح ممکن تھی۔

پہلا امیر:۔ میرا خیال بھی یہی ہے کیونکہ کل ضیافت کا جو رُقعہ آیا تھا اُس میں بہت ہی اصرار کے ساتھ شرکت کی درخواست تھی۔ مجھے چند ضروری کام بھی ایسے تھے کہ مَیں اِس دعوت کو ٹالنا چاہتا تھا۔ مگر تائمن نے کچھ ایسا اصرار کیا کہ سب کام بالائے طاق رکھکر

مجھے حاضر ہونا ہی پڑا۔

دوسرا امیر۔ ایسے ہی چند ضروری کام مجھے بھی تھے۔ عذر بھی کیا، مگر تائمن نے نہ مانا۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ جب روپیہ قرض لینے کو اُس نے اپنا آدمی بھیجا تھا تو اُسوقت میرا کل روپیہ اور کاموں میں صرف ہو چکا تھا۔

پہلا امیر۔ مجھے بھی سخت ندامت ہے۔ دُنیا میں انسان کو ضرورت ہوا ہی کرتی ہے۔

دوسرا امیر۔ دُرست ہے۔ دُنیا اِسی کا نام ہے۔ آپسے کتنا روپیہ قرض مانگا تھا؟

پہلا امیر۔ اور آپسے کتنا طلب کیا تھا؟

دوسرا امیر۔ اُن کا آدمی میرے پاس آیا تھا۔ لیجئے وہ خود تائمن آرہے ہیں۔

(تائمن اور اُس کے ساتھ مُلازم آتے ہیں۔)

تائمن۔ دونوں صاحبوں کو تسلیم عرض ہے۔ فرمائیے مزاج بخیر ہے؟

پہلا امیر۔ اچھا ہوں۔ آپ کو خیریت سے دیکھکر دل بہت خوش ہوا۔

دوسرا امیر۔ موسم گرما کے جاتے ہی شاید ابابیلیں بھی اسمان پر اڑنے کی اتنی شائق نہیں ہوتیں جیسے کہ ہم آپ سے ملنے کے مشتاق تھے۔

تائمن۔ (علیحدہ) اور شاید جاڑا آجاتے ہی ابابیلوں کے ہوجانے کے بھی لیسے ہی آرزومند تھے۔ یہ انسان بھی بس گرما کے آنے جانے والے پرندے ہیں۔

شریفو۔ آج ہمارے کھانے لتنے انتظار کی تلافی نہ کر سکیں گے۔ اگر مُطربوں کی بے سُری تانیں ناگوار گزرتی ہوں تو کچھ دیر کیلئے موسیقی کی دل آویز صدائیں سُنکر کانوں کو محظوظ کریں۔

پہلا امیر۔ مجھے اُمید ہے کہ جناب کو یہ بات ناگوار نہ گزری ہوگی کہ میں نے آپکے مُلازم کو خالی ہاتھ واپس کر دیا تھا۔

تائمن۔ نہیں اِس کا مطلق خیال نہ کریں۔

دوسرا امیر۔ میرے شریف تائمن۔

تائمن۔ میرے نہایت عزیز دوست فرمائیے کیا خبر ہے؟

دوسرا امیر۔ میرے نہایت مُعزز امیر۔ میں بیحد شرمندہ ہوں کہ جس دن آپنے اپنا آدمی بھیجا تھا۔ میری حالت اُس دن بالکل ایک بدقسمت تنگدست اور محتاج کی سی ہو رہی تھی۔

تائمن۔ نہیں اِس کا خیال کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔

دوسرا امیر۔ کاش حضور دو گھنٹے پہلے اپنا آدمی بھیجتے۔

تائمن۔ آپ کی طبیعت پر یہ بات ہرگز گراں نہ گزرنی چاہیئے۔ ہمیشہ اچھی طرح مجھے یاد فرماتے رہیں۔

(ضیافت کا کھانا لایا جاتا ہے۔)

دوسرا امیر۔ کھانے کی کُل قابوں پر یہ سرپوش کیسے ڈھکے ہیں ــــ؟۔

پہلا امیر۔ شاہانہ سامان ہیں۔

تیسرا امیر۔ اس میں کیا شک ہے۔ اگر دولت پاس ہو اور موقع نصیب ہے تو سامان کے شاہانہ ہونے میں کِسے کلام ہے۔

پہلا امیر۔ فرمائیے مزاج کیسا ہے۔ کوئی نئی خبر تو سُنائیے۔

تیسرا امیر۔ جی ہاں۔ آپ نے نہیں سُنا کہ الکی بیادیس جلاوطن کر دیا گیا۔ کیا آپکو ابھی تک اطلاع نہیں ہوئی؟

پہلا اور دوسرا امیر۔ کیا واقعی الکی بیادیس جلاوطن کردیا گیا؟۔

تیسرا امیر۔ جی ہاں۔ واقعی یہ خبر بالکل صحیح ہے۔

پہلا امیر۔ وجہ کیا ہوئی؟

دوسرا امیر۔ مہربانی فرماکر اِس جلاوطنی کی کوئی وجہ تو بتائیں۔

تائمن۔ میرے لائق دوستو۔ آپ ذرا قریب آجائیں۔

تیسرا امیر:۔ میں اور باتیں بھی انکی بیاد لیس کے متعلق عرض کرونگا۔ ضیافت شروع ہونے والی ہے۔

دوسرا امیر:۔ ان حضرت کا تو وہی بزرگانہ انداز اب تک چلا آتا ہے۔

تیسرا امیر:۔ مگر کیا جلا وطنی کا حکم چل سکیگا؟

دوسرا امیر:۔ جی ہاں چلے گا کیوں نہیں۔ مگر زمانہ وہ چیز ہو کہ۔

تیسرا امیر:۔ میں بھی کچھ ایسا ہی خیال کرتا ہوں۔

تائمن:۔ ہر صاحب اپنی اپنی کرسی پر تشریف رکھیں۔ اور اس عجلت سے اپنی کرسیوں پر جائیے جیسے کوئی اپنی محبوبہ کا بوسہ لینے دوڑ کر بڑھتا ہو۔ کھانا سب جگہ ایک سا ہے۔ پورے شہر کی ضیافت سمجھکر اتنی دیر نہ لگایئے کہ کھانا ٹھنڈا ہوجائے۔ کون کہاں بیٹھے کون کہاں اس میں تاخیر نہ فرمائیں۔ بس سب تشریف رکھیں اور خدا کا شکر کریں۔ (کھانے سے پہلے تائمن دعا مانگتا ہے) اے خداؤ کارسازو۔ ہم میں شکر گزاری کا مادہ پیدا کردو۔ جو نعمتیں تم نے بخشی ہیں ان کی منت گزاری میں ہم سے اپنی حمد و ثنا سنو۔ ہر شخص کو صرف اتنا مستعار دو کہ وہ دوسرے کو مستعار نہ دے سکے۔ کیونکہ خداؤ اگر تم نے خود انسان سے کچھ مستعار مانگا تو وہ تمہاری پرستش تک چھوڑ دیگا اور تم سے منکر ہوجائیگا۔ کھلانے والے کو زیادہ عزیز اس کھانے کو کرو۔ بیس آدمیوں کا مجمع بھی کوئی ایسا نہ ہو جس میں اتنے ہی آدمی بدمعاش ہوں۔ اگر کسی میز کے گرد بارہ عورتیں بھی کھانے بیٹھیں تو وہ سب ایسی ہی ہوں جیسے کہ عورتیں فی الحقیقت ہوا کرتی ہیں۔ خداؤ، باقی مزدو تمہاری محنت کی یہ ہے کہ تم سیاسی مجلس ایتھنز کے رکنوں کو اور اس کے قبضہ کرنے والوں کو جو ان کے پیچھے گھسٹتے آتے ہیں ان کو اور انکے جرائم کو ایسا کردو کہ ان کی سزا میں وہ سب غارت ہوجائیں رہے یہ میرے اس وقت کے موجودہ دوست تو یہ میرے لئے سب ہیچ ہیں۔ اور جو برکت "ہیچ" کو ہوسکتی ہے وہی تو انہیں دے۔ اور ایسے ہی "ہیچ" پر میں ان کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ سرپوش اٹھاؤ کتو، لو، چاٹو۔

بعض لوگ:۔ امیر تائمن کا ان باتوں سے کیا مطلب ہے؟

بعض دوسرے لوگ:۔ ہمیں نہیں معلوم۔ (قابوں پر سے سرپوش اُٹھائے جاتے ہیں تو دیکھا جاتا ہے کہ ان میں گرم پانی بھرا ہے۔)

تائمن:۔ خدا کرے کہ اس سے بہتر ضیافت تمہیں کھانی نصیب نہ ہو۔ اے رکابی کے یارو، تم دھواں ہو، گنگنے پانی ہو۔ اور بس یہی تمہارا کمال ہے۔ یہ تائمن کی آخری ضیافت ہے۔ تائمن جو شہر میں خوشکلامی اور تعریفوں سے تمہیں آراستہ و پیراستہ کرتا تھا اب وہ تم سب کو دھوئے ڈالتا ہے۔ اور تمہاری بدمعاشیوں کا رنگ اُٹھا تمہارے چہروں پر چھڑکتا ہے۔ (اتنا کہکر تائمن گرم پانی مہمانوں کے چہروں پر پھینکتا ہے) زندہ رہو مگر کریہہ اور قابل نفریں صورت بنکر۔ جیو اور اسی برے حال میں مدت تک زندہ رہو۔ اے دوستوں کا خون چوس کر ہنسنے اور خوش ہونے والو، مفت خورو، خلیق غارتگرو، ملنسار بھیڑیو، تقدیر کے بنائے ہوئے احمقو، رکابی کے یارو، وقت کی مکھیو، ٹوپی اتار اتار کر زمین پر گھٹنے ٹیکنے والے غلامو، تم محض بھاپ ہو، ایک غبار ہو۔ انسان اور حیوان دونوں کے حق میں ایک لاعلاج مرض اور وبا ہو۔ خدا کرے کہ تمہارے تن بدن پر پیپڑیاں جم جائیں۔ کہاں جاتے ہو؟ پہلے اپنے مرض کی یہ دوا تو لیتے جاؤ۔ تم بھی اور تم بھی۔ ذرا ٹھہرو تو میں تمہیں روپیہ قرض دیتا ہوں پھر کسی سے قرض نہ مانگنا۔ ہائیں، کیا سب بھاگ چلے۔ خدایا۔ آج سے کوئی ضیافت ایسی نہ ہو جس میں کوئی لچا بدمعاش مہمان نہ ہو اور ایسے لچے کا آنا مبارک نہ سمجھا جائے۔ اے گھر جل جا آگ ہوجا۔ ایتھنز کے شہر ڈوب جا اور دعا ہے آج سے تائمن کو انسان و انسانیت دونوں سے قلبی نفرت ہوجائے۔

(امراء اور اراکین مجلس وغیرہ وغیرہ پھر یک جا نظر آتے ہیں۔)

دوسرا امیر۔ آپ کو کچھ معلوم ہے کہ تائمن کے اس قہر و غضب کی وجہ کیا ہوئی؟

تیسرا امیر۔ ذرا ٹھیرئیے تو۔ میری ٹوپی آپنے دیکھی ہے؟

چوتھا امیر۔ میری تو قبا کہیں گم ہوگئی۔

پہلا امیر۔ امیر تائمن تو بالکل پاگل ہوگیا ہے۔ دماغی خلل کے سوا اب کچھ اس میں باقی نہیں ہے۔ کل ایک ہیرا مجھے دیا تھا۔ آج میں اپنی ٹوپی میں اُسے لگائے تھا۔ کوئی چیز ایسی تاک کر لگائی کہ وہ ہیرا ٹوپی سے کہیں گر گیا۔ آپ نے تو کہیں وہ ہیرا نہیں دیکھا؟۔

تیسرا امیر۔ آپنے میری ٹوپی تو نہیں دیکھی۔

دوسرا امیر۔ لیجئے وہ تو یہاں پڑی ہے۔

چوتھا امیر۔ اور لیجئے میری قبا یہاں ہے۔

پہلا امیر۔ اب یہاں زیادہ ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔

دوسرا امیر۔ امیر تائمن دیوانہ ہوگیا ہے۔

تیسرا امیر۔ دیوانہ ہونے میں کیا شک ہے۔

چوتھا امیر۔ ایک دن ہیرے اور جواہرات بخشتا ہے دوسرے دن پتھر مارتا ہے۔

(سب چلے جاتے ہیں۔)

جُزوِ رابع

پہلا منظر۔ شہر ایتھنز کی فصیل کے باہر تائمن نظر آتا ہے۔

تائمن۔ اے شہر مجھے ایک مرتبہ اور اپنی طرف دیکھ لینے دے۔ شہر کی فصیلوں جنہوں نے اپنے اندر بھیڑیوں کو بند کر رکھا ہے زمین میں دھنس جاؤ۔ ایتھنز کی حفاظت نہ کرو۔ شہر کی عورتیں بانجھ ہو جائیں۔ اولاد نافرمان اُٹھے۔ شہر کے غلام اور شہدے مجلس سیاسی کے بڈھے رُکنوں کو اُن کی کرسیوں سے گھسیٹ کر نیچے گرا دیں اور خود اُن کی جگہ بیٹھکر شہر کے حاکم اور کارگزار بنیں۔ کنواریوں کے کنوارپتے کو انکے ماں باپ کی آنکھوں کے سامنے گندگی میں تبدیل کریں۔ دیوالیو اپنے قرضے برقرار رکھو۔ ایک قرضہ بھی ادا نہ کرو۔ کمر سے چھریاں نکال کر اپنے قرضخواہوں کے گلے کاٹ ڈالو۔ آقاؤں کے نوکرو خوب چوریاں کرو۔ کیونکہ تمہارے متین مہذب آقا خود بڑے بڑے قزاق اور رہزن ہیں۔ جوان ماماؤ تم اپنے آقاؤں کے بستر پر جالیٹو۔ اور بیگمو تم بیسوا بنکر کوٹھوں پر جا براجو۔ سولہ برس کا فرزند اپنے لنگڑے بڈھے باپ کی بغل سے اسکی لٹھیا کھینچکر اُسی سے اُس کا سر پھاڑ ڈالے۔ پرہیزگاری، خوفِ خدا، دین و مذہب، تم سب خداؤں کے پاس چلے جاؤ۔ امن و انصاف، سچائی، گھر میں چھوٹوں کو بڑوں کا ادب، رات کا آرام، ہمسایہ کی پاسداری، تعلیم و تربیت، صنعت و حرفت، آئین و قوانین، رسم و رواج، تم سب تنزل کرکے اپنی متضاد شکلیں اختیار کرلو۔ شورش اور ابتری ہمیشہ اپنا بازار گرم رکھو۔ امراض جو انسان کو لاحق ہوتے ہیں اپنی ہیئت اور اپنے متعدی اثر سے ایتھنز کو جو اب خدا کا قہر نازل ہونے کا سزاوار ہے مسموم کر دو۔ مجلس کے رُکنوں کو درد قولنج اُٹھے اور اُنکی ہڈیوں کے گُودے کا جُزو ہو جائے۔ تاکہ نیکی کے چشموں کو بند کرکے انہی میں انہیں ڈوب مرنے دے۔ طرح طرح کے جلدی امراض ایتھنز والوں میں حلول کرکے آخر کار انہیں جذامی بنا دیں۔ ایک کا سانس دوسرے کے سانس میں زہر بنکر اثر کرے تاکہ اُن کی صحبتیں (جیسی کہ انکی دوستیاں ہیں) زہر ہلاہل بن جائیں۔ اے موذی شہر میں تجھ سے سوائے برہنگی کے اور کچھ نہیں لے جاتا۔ اگر چاہے تو یہ بھی نئے

نئے احکام و فرامین جاری کر کے مجھ سے چھین لے۔ تائمن تو اب
جنگل اور صحراؤں میں جاکر رہے گا جہاں ظالم سے ظالم درندے کو
بھی وہ انسان سے زیادہ رحم دل پائے گا۔ اے شہر کاش اربابِ
فلک تجھے غارت کر دیتے۔ میرے مہربان خداؤ تم اور ایتھنز کے
اندر اور ایتھنز کے باہر جس قدر لوگ ہیں تائمن کی دعائے بد سنو!
جوں جوں تائمن کی عمر دراز ہو اُس کی نفرت و عداوت نسلِ آدم
سے جس میں اعلیٰ اور ادنیٰ سب ہی شامل ہوں برابر ترقی کرتی
رہے۔ آمین۔

دوسرا منظر۔ ایتھنز کا شہر۔ تائمن کا قصر۔

فلے ویوس داروغہ دو تین ملازموں کے ساتھ
آتا ہے۔

پہلا ملازم۔ داروغہ صاحب بتائیے تو آقا کہاں ہیں۔ کیا ہم
بالکل ہی بے روزگار ہوگئے؟ کیا برطرف کر دئے گئے؟ کیا
اب کچھ باقی نہ رہا؟

فلے ویوس۔ افسوس میرے دوستو۔ کیا بتاؤں۔ خدا دیکھتا ہے
کہ میں بھی تمہاری طرح مفلس و محتاج ہوگیا ہوں۔

پہلا ملازم۔ ہائے کیسا گھر بگڑا ہے۔ کیسے شریف آقا کے ساتھ زمانے
نے بیوفائی کی ہے۔ سب کچھ ہاتھ سے جاتا رہا۔ کوئی بھی دوست نہ رہا
کہ اُس کا بازو پکڑ کر اُسے سنبھالتا۔

دوسرا ملازم۔ جیسے قبر میں کسی دوست کے مُردے کو رکھکر
اُدھر سے منہ پھیرتے ہیں اسی طرح آقا کے دوستوں نے بھی جب
اُس کی دولت خاک میں ملتی دیکھی تو اُس سے کنارہ کشی کی۔ اور
اپنے جھوٹے قول و اقرار اس طرح پیچھے چھوڑ گئے جیسے کوئی روپوں
کی خالی تھیلیاں زمین پر پھینک جائے۔ اور وہ غریب خود فقیر
ہو کر کہیں نکل گیا۔ اور اب افلاس میں مبتلا جس سے سب بچتے
ہیں۔ ذلیل و خوار پڑا پھرتا ہوگا۔ لیجئے اور ساتھی بھی آگئے۔
(تائمن کے اور نوکر بھی آتے ہیں)

فلے ویوس۔ افسوس یہ اس گھر کی چیزیں تھیں جو برباد ہوگیا۔

تیسرا ملازم۔ لیکن ہمارے دل ابھی تک آقا ہی میں پڑے ہیں۔
ہماری صورتوں سے ظاہر ہے کہ ہم اپنے اُسی آقا کے ابھی تک
ملازم اور نمک خوار ہیں اور رنج و مصیبت میں ایک دوسرے
کا ساتھ دینے والے ہیں۔ مگر اب ہماری ناؤ میں پانی بھرنے لگا
ہے اور اسی ناؤ کے تختے پر ہم کھڑے موجوں کا شور اور اُن کی
دھمکیاں سُن رہے ہیں۔ اور کوئی دم جاتا ہے کہ فضا کی اِن ہواؤں
میں سب بچھڑ جائیں گے۔

فلے ویوس۔ اچھے دوستو سب سُنو جو کچھ دولت میرے پاس
بچی ہے وہ میں تم سب میں تقسیم کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اپنے
آقا تائمن کی خاطر جب کبھی ہمارا آپس میں ملنا ہو ہم ایک دوسرے
کو ساتھی اور اسی آقا کا نوکر سمجھیں۔ آؤ ہم سب مل کر یہی بات کہیں
اور اس میں ہماری آواز آقا کی دولت کا جرس موت ہوگی۔ گویا ہم نے
بھی کبھی اچھے دن دیکھے تھے۔ اس طرح اس دولتِ مُردہ سے ہر
ایک کو حصہ ملے۔ اپنے اپنے دامن سے ہاتھ باہر نکالو مگر زبان سے
کوئی بات نہ نکلے۔ اور اس طرح رنج و الم کی دولت سے تونگر بنکر
ہم حالتِ افلاس میں ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ (سب
نوکر آپس میں گلے ملتے ہیں اور پھر ہر ایک اپنی اپنی راہ لیتا ہے)
افسوس دولت کے شان و تجمل کے بعد یہ بُرا وقت اور خواری
کے دن آئے ہیں۔ انہیں دیکھکر کون ہے جو اپنے کو شستہ نہ رکھنا
چاہے گا۔ جب مال و دولت، مصیبت و ذلت کی منزل تک پہنچا کر
ختم ہو جاتے ہیں تو پھر کون ایسا ہے جو دولت کی تمنا کریگا۔ گویا
خود اپنے کو منہ چڑانا پسند کریگا۔ یا دوستی کے جھوٹے خواب دیکھکر
زندہ رہنا چاہے گا۔ یا اپنی دولت کی شان یا جو کچھ جاہ و حشم
دولت اپنے ساتھ لاتی ہے اُسے بھی اپنے جھوٹے دوستوں کی طرح
عارضی رنگ و روغن میں دیکھنا پسند کریگا۔ ہائے میرا نیکدل اور
مفلس آقا خود اپنی ہی بھلائیوں کی بدولت یہ بُرے دن دیکھ رہا ہے۔

دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے میں خود بگڑ گیا۔ یہ حالت بھی عجیب ہے کہ دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا بھی انسان کا بدترین گناہ ہو جائے۔ کون ہے جو میرے آقا تائمن سے اس کا آدھا سلوک بھی کر سکے جو اس نے دوسروں کے ساتھ کیا ہے۔ کیوں سخاوت، خیر و خیرات جو خود آسمان کے خداؤں کی بڑی خوبیاں ہیں انسان کے حق میں تباہی و بربادی کا باعث ہو جائیں۔ کیا ہمارے آقا کو یہی انعام ملنا تھا کہ وہ سب سے زیادہ مصیبت اور آفت زدہ ہو جائے۔ کیوں اس کی دولت اس کی مصائب کی وجہ ہو گئی۔ افسوس اے میرے مہربان آقا تو غصے اور طیش میں آ گیا اور نااہل و بیوفا دوستوں کی محسن کشی دیکھکر دنیا چھوڑ بیٹھا۔ اپنے ساتھ گزارے کیلئے بھی کچھ نہیں رکھا۔ اور نہ کوئی ایسا سامان ساتھ لیا جس سے چندے زندگی بسر ہو سکے۔ میں تو اب تجھے تلاش کرنے نکلتا ہوں اور اپنے بہترین قصد و ارادے سے تیری خدمت کروں گا۔ جب تک میرے پاس کھانے کو ہے تیرا ہی داروغہ اور تیرا ہی وفادار ملازم اپنے کو سمجھتا رہونگا۔

(چلا جاتا ہے۔)

تیسرا منظر۔ جنگل۔ تائمن آتا ہے۔

تائمن: آفتاب جو سب چیزوں کو زندہ رکھتا ہے زمین سے اس سڑی ہوئی رطوبت کو خشک اور کرۂ ماہتاب سے نیچے کی ہوا کو زہر آمیز کر دے۔ ایک ہی بطن سے دو جڑواں بھائی پیدا ہوتے ہیں جنہیں بہ لحاظ پیدائش، سکونت، تعلقات جدا نہیں کر سکتے۔ تقدیر انہیں دولت دیتی ہے، ایک کو زیادہ دوسرے کو کم۔ زیادہ دولت والا کم دولت والے کو حقیر و ذلیل سمجھتا ہے۔ خود فطرت بھی (جسے دنیا کے سب دکھ گھیرے رہتے ہیں) دولت کی متحمل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خود اپنی تذلیل و تحقیر نہ کرے۔ اس فقیر کو تونگر کر دے کیونکہ احساس غیرت اس میں جبلی ہے۔ اس صاحب سیاست امیر کو فقیر کر دے کیونکہ اس میں دوسروں کو ذلیل و خوار کرنیکا مادہ موروثی ہے۔ عمدہ چراگاہ میں بیل کے پٹھے تیار ہو جاتے ہیں چرائی کی کمی سے وہ دبلا ہو جاتا ہے۔ کس کی مجال و ہمت ہے کہ مردانہ وار تن کر کھڑا ہو اور کہے کہ "فلاں شخص خوشامدی ہے"۔ اگر ایک آدمی خوشامدی ہے تو کل انسان خوشامدی ہیں۔ کیونکہ دولت میں اوپر کی سیڑھی پر آنے کے لئے نیچے کی سیڑھی آسانی پیدا کرتی ہے۔ صاحب علم و فضل بھی اپنا سر زر دار احمق کے سامنے جھکاتا ہے۔ دنیا کی سب باتوں میں کجی اور پیچیدگی ہے۔ ہماری نالائق طبیعتوں میں ہمواری مطلق نہیں۔ جو کچھ وہ صریح شرارت اور خالص خباثت ہے۔ بس آج سے تمام ضیافتوں، جلسوں، انسانی مجمعوں سے بالکہ آدمی کی صورت، یہانتک کہ خود تائمن، تائمن سے نفرت کرے۔ خدا کرے کہ کل بنی نوع انسان کو تباہی و بربادی سانپ کی طرح ڈسے۔ (تائمن زمین کھود رہا ہے اور کہتا ہے) اے زمین اگر تیرے پاس کھانے کے لئے کوئی بہتر چیز نہ ہو تو کوئی جڑی کھانے کو دے جس سے بھوک مٹاؤں۔ اس سے زیادہ میں تجھ سے نہیں مانگتا۔ خوش ذائقہ بنانے کیلئے چاہے تو اپنا تیز سے تیز زہر بھی کیوں اس پر نہ چھڑک دے، مگر کچھ کھانے کو دے۔ ارے یہ کیا ہے۔ لو یہ تو اشرفیاں ہیں۔ زرد زرد چمکتا ہوا قیمتی سونا۔ خدایا میں زر پرست نہیں ہوں۔ جو کچھ اس وقت مانگتا ہوں وہ کھانے کی کوئی جڑی ہو جس سے بھوک رفع کروں۔ سونا بھی اتنا جو سیاہ کو سپید، بد کو نیک، جھوٹ کو سچ، کمینے کو شریف، بڈھے کو جوان، بزدل کو جوانمرد بنا سکتا ہے۔ اے آسمان کے خداؤ تم نے یہ کیوں دیا ہے، کس لئے دیا ہے۔ یہ تو تمہارے پرستاروں اور بندوں کو بھی تمہارے پہلو سے جدا کر دیگا۔ مضبوط سے مضبوط آدمی کے سر کے نیچے سے تکیہ نکال لیگا۔ یہ زرد زرد چیز تو بڑی بلا ہے۔ یہ دنیا کی سلطنتوں کو کبھی ملائیگا کبھی جدا کرے گا۔ ملعونوں کا شفیع و دستگیر بنے گا۔ سیاسی مجلس کے رکنوں کے ساتھ چوروں کو کرسی نشین کریگا۔ اور پھر ان چوروں اور سارقوں کو بڑے بڑے خطاب دے گا۔

دوسروں سے اُن کی تعظیم و تکریم کرائیگا۔ یہ بدبخت تو وہ ہے جو
جھگی جھگتائی رانڈ کو دوسری شادی پر مجبور کرتا ہے جس کی صورت
ایسی ہوتی ہے کہ دیکھکر گھِن آئے۔ مگر یہ زر وہ چیز ہے جو بھدّی
بدصورت کو بھی ایک معطّر اور دلربا نازنین بنا دیتا ہے۔ اے
دُنیا تجھ پر لعنت ہو، تُو تو کُل بنی نوعِ انسان کی بیسوا ہے جس کا کام
یہ ہے کہ قوموں کے راستے میں طرح طرح کی ٹھوکریں پیدا کرے۔
مَیں تجھے مجبور کرتا ہوں کہ اپنی اصلی اور سچّی خدمت بجالا۔

(دُور سے سپاہیوں کے مارچ کرنے کی آواز سُنتا ہے)

اے یہ نقارے کی آواز کیسی ہے؟ ارے زر، گو تو زندہ
ہے مگر مَیں تجھے زندہ کو درگور کرتا ہوں۔

(کچھ اشرفیاں باہر نکالتا ہے۔ باقی کو زمین میں دفن
کر دیتا ہے۔)

(الکی بیادیس طبل و بُوق کے ساتھ مع فوج کے
جو جنگی صفوں میں آراستہ ہے، دو بیسوائیں فرینیا
اور تیماندرا اُس کے ہمراہ ہیں۔)

الکی بیادیس:۔ (پکار کر کہتا ہے) جو کوئی آدمی یہاں ہو وہ جواب دے۔
تائمن:۔ اے یہاں تیری ہی طرح کا ایک جانور ہے۔ تیرے کلیجے
میں ناسُور پڑیں۔ بدبخت تُو نے مجھے انسان کی آنکھیں دیکھنے کا
پھر موقع دیا۔
الکی بیادیس:۔ تیرا نام کیا ہے؟ کیا انسان تیری نظر میں اتنا
قابلِ نفرین اور ذلیل ہے کہ تو اُسے دیکھنا تک نہیں چاہتا۔ آخر
تُو بھی تو انسان ہے۔
تائمن:۔ مَیں انسان نہیں ہوں بلکہ انسان سے نفرت کرنے والا اور
نسلِ آدم کا دُشمن ہوں۔ رہا تُو۔ تو سُن سچّے دل سے مجھے تمنّا تھی کہ
اگر تُو کُتّا ہوتا تو مَیں تجھ سے محبت کرتا۔
الکی بیادیس:۔ مَیں تجھ سے واقف ہوں لیکن تیرے مقسوم سے
واقف نہیں کہ تُو اِس حال کو کیسے پہونچا اور تیری یہ حالت دیکھکر
مجھے سخت تعجب ہوتا ہے۔
تائمن:۔ مَیں بھی تجھ سے واقف ہوں اور اتنا واقف ہوں کہ خود
اپنے سے اتنا واقف نہیں۔ جا اپنے طبل اور نقارے کے پیچھے پیچھے
جا۔ چلا جا اور آدمیوں کے گلے کاٹ کاٹ کر اُن کے خون سے خوب
زمین کو رنگ۔ دین اور دُنیا داری کے قاعدے آئینِ جنگ و
پیکار کے کُشت و خُون سے بھی زیادہ سخت اور ظالم ہیں۔ اور یہ کسبی
جو تیرے ساتھ ہے گو اسکی نظر فرشتوں کی سی ہے مگر قتل و غارت
میں وہ تیری تلوار سے بھی زیادہ قاتل ہے۔
فرینیا:۔ تیرے لب سڑ جائیں۔
تائمن:۔ جب بھی مَیں انہی سے تجھے پیار کرونگا اور میرے سڑے
لبوں کا زہر تیرے لبوں تک پہونچیگا۔
الکی بیادیس:۔ افسوس امیر تائمن کی حالت کیسی تبدیل ہوئی ہے!
تائمن:۔ تبدیلی بھی ایسی جیسی ماہتاب میں ہوتی رہتی ہے جو دوسروں
کو روشنی پہونچانے کیلئے خود روشنی نہیں رکھتا۔ اب چاند کی طرح
مجھ میں بھی روشنی نہیں کیونکہ سُورج کے نُورانی چشمے اب مجھے اپنا نُور
مُستعار نہیں پہونچاتے۔
الکی بیادیس:۔ شریف تائمن۔ کیا کوئی دوستانہ خدمت میں آپکی
کر سکتا ہوں۔ کچھ فرمایئے۔
تائمن:۔ میری خدمت یہی کر سکتے ہو کہ دوست رہنے کا وعدہ کرو
مگر کبھی اِس وعدے کو ایفا نہ کرو۔ اور اگر تم نے وعدے کو ایفا
کر دیا تو پھر خدا سے میری دُعا ہوگی کہ وہ تم پر طرح طرح کی بلائیں
نازل کرے کیونکہ تم انسان ہو۔
الکی بیادیس:۔ کچھ کچھ یاد آتا ہے کہ میں نے آپ کی مُصیبتوں کا
کچھ حال سُنا تھا۔
تائمن:۔ میری مُصیبتیں تو اُس وقت دیکھنے کے قابل تھیں جبکہ میں
خوشحال اور صاحبِ اقبال تھا۔
الکی بیادیس:۔ نہیں، اصلی مُصیبتیں تو مَیں اِس وقت دیکھ رہا

ہوں۔ وہ وقت تو تمہارا ثروت و اقبال مندی کا تھا۔

تائمن:۔ ایسا ہی اقبال مندی کا زمانہ تھا جیسے کہ اب تمہارا جلاوطنی کا زمانہ ہے کہ دُو بیسوائیں تمہیں سہارا دے رہی ہیں۔

تیماندرا:۔ کیا، یہ ایتھنز کے وہی شخص ہیں جنکی ساری دُنیا شد و مد سے تعریفیں کیا کرتی تھی۔

تائمن:۔ کیا تو تیماندرا ہے؟

تیماندرا:۔ ہاں تیماندرا ہوں۔

تائمن:۔ اچھا تو بیسوائی کئے جا۔ جو تجھ سے کام نکالتے ہیں وہ تجھ سے عشق نہیں رکھتے۔ ان میں بیماریاں پیدا کرتی رہ اور وہ اپنے ہوائے نفس کی نشانیاں تجھ میں چھوڑتے جائیں۔ اپنی لذت و حلاوت کا وقت نہ گنوا۔ اور ان سب کو بیمار ڈال کر صحت کی غرض سے حماموں کی طرف روانہ کر۔ گل چہرہ نوجوانوں کو ایسا مریض بنا کہ وہ پسینہ لیکر اپنا علاج کرائیں اور پرہیزی غذا پر اُن کو ملتی رہیا۔

تیماندرا:۔ ارے وحشی جانور۔ خدا تجھے غارت کرے۔

الکی بیادیس:۔ پیاری تیماندرا انہیں معاف کرو۔ ان پر اتنی مصیبتیں پڑی ہیں کہ ان کی عقل میں فتور آگیا ہے۔ عالی ہمت تائمن، کچھ عرصے سے میرے پاس روپیہ نہیں رہا ہے۔ اِسکی وجہ سے میری فوج میں آئے دن بغاوتیں اور فتنے برپا رہتے ہیں۔

تائمن:۔ مجھے اِس خیال سے سخت صدمہ ہوتا ہے کہ اس ملعون ناہنجار شہر ایتھنز نے تیری کچھ قدر نہ کی۔ تیری فتح و ظفر کا زمانہ انہوں نے دل سے فراموش کیا، جبکہ قُرب و جوار کی ریاستوں نے اُس پر حملے شروع کئے تھے۔ اگر تیری دولت اور تلوار نہوتی تو یہ شہر کبھی کا پامال ہوگیا ہوتا۔ لیکن اب میں یہی چاہتا ہوں کہ تُو کوچ کا نقارہ بجا اور یہاں سے چلا جا۔

الکی بیادیس:۔ میں تمہارا دوست ہوں اور مجھے تم پر ترس آتا ہے۔ پیارے تائمن۔

تائمن:۔ جسے تو تکلیف پہونچا رہا ہے اُس پر ترس کیونکر کھا سکتا ہے۔ میں اسوقت تنہائی چاہتا ہوں۔

الکی بیادیس:۔ تو اچھا خُدا حافظ۔ خُدا تجھے ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ لے یہ تھوڑی سی اشرفیاں ہیں۔ اِنہیں اپنے پاس رکھ۔

تائمن:۔ انہیں اپنے ہی پاس رہنے دے۔ میں ان اشرفیوں کو کھا کر بھوک نہیں مٹا سکتا۔

الکی بیادیس:۔ جس وقت میں ایتھنز کو غارت کر کے ایک تودہ خاک بنا دونگا۔۔۔۔

تائمن:۔ کیا تم ایتھنز سے لڑکر اُسے غارت کرنے جارہے ہو؟

الکی بیادیس:۔ ہاں یہی قصد ہے اور لڑنے کیلئے وجہ بھی کافی رکھتا ہوں۔

تائمن:۔ خدا کرے کہ تیری فوج کشی سے یہ غارت ہو جائیں۔ اور جب ایتھنز کو تُو غارت کر چکے تو پھر خُدا تجھے بھی غارت کردے۔

الکی بیادیس:۔ یہ کیوں، مجھے کیوں غارت کرے؟

تائمن:۔ وجہ یہ کہ تُو اس لئے پیدا ہوا تھا کہ ان خبیثوں اور شریروں کو مار کر میرے ملک کو فتح کرے۔ لے یہ اپنی اشرفیاں اپنے ہی پاس رکھ۔ یہاں بھی ان کی کمی نہیں ہے۔ جا آسمانی وبا بنکر ایتھنز پر جا اور وبا بنکر اُسے غارت کر جیسے کہ خدائے جوپیٹر جب کسی شہر کو سزا دینے کیلئے اُس شہر کی ہوا میں زہر پھیلا دیتا ہے، تیری تلوار جان لئے بغیر کسی کو نہ چھوڑے۔ بڈھوں پر اُن کی سپید ڈاڑھیاں دیکھکر رحم نہ آنے پائے کیونکہ وہ بڈھے سب سُود خوار ہیں۔ ادھیڑ عمر کی حرامکار عورت کو بھی قتل کر کیونکہ سوائے اُس لباس کے جو وہ پہنے ہے کوئی دوسری چیز پاک نہیں رکھتی۔ نہ اُس پر تجھے رحم آنا چاہیئے اور کسی دوشیزہ لڑکی کے رُخسار دیکھکر اپنی تلوار کو روکیو نہیں کیونکہ وہ چھاتیاں جو اپنی جالی کی کُرتی میں سے مَردوں کی آنکھوں کو جھانکتی ہیں وہ

اُس فہرست سے خارج ہیں جن میں واجب الرحم چیزیں درج ہیں۔ یہ سب چیزیں بڑی خطرناک ہیں۔ ان کا غارت ہونا ضروری ہے۔ اور نہ اُس معصوم بچے کو زندہ چھوڑیو جس کے رخسار میں ہنستے وقت گڑھے پڑتے ہیں۔ سمجھ لے کہ وہ بچہ حرامی ہے اور اُسکی نسبت فال نکل چکی ہے کہ اُس کا گلا کاٹا جائیگا۔ اور بغیر ندامت یا افسوس کے اُس کا قیمہ بنا دیو۔ دُنیا کی چیزوں پر لعنت بھیجکر اپنے کانوں کو بہرا اور آنکھوں کو اندھا کر لیجیو تاکہ ماؤں اور بہنوں کی چیخیں، بچوں کی گریہ وزاری کچھ دل پر اثر نہ کرے۔ پادری جو اپنے مقدس لباس پہنے ہوں اُن سے بھی خون کے فوارے جاری کر لیو۔ اُنکی گریہ وزاری، اور چیخوں کا اثر بھی تیرے دل پر مطلق نہ ہو۔ لے یہاں سونا اور اشرفیاں موجود ہیں انہیں اپنے سپاہیوں کو دے تاکہ وہ دل کھول کر خونریزی اور غارتگری کریں۔ اور جب تیرا قہر و غضب ختم ہو تو پھر تو بھی غارت ہو جا۔

بس اب کچھ بات مت کر اور یہاں سے چلا جا۔

الکی بیادیس۔ تائمن کیا تمہارے پاس ابتک دولت موجود ہے؟ جو کچھ روپیہ تم دوگے وہ میں لے لونگا۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ جو کچھ تم کہتے ہو اُس پر عمل بھی کروں۔

تائمن۔ چاہے تم میری بات سنو۔ چاہے نہ سنو۔ بہرحال میں خدا کی تم پر لعنت ہو۔

فری نیا اور تیماندرا۔ روپے اور اشرفیاں ہمیں بھی دو۔ ہمارے اچھے تائمن کیا اشرفیاں تمہارے پاس اور بھی ہیں؟

تائمن۔ ہاں، میرے پاس تو اتنی دولت ہے کہ ایک کسبی کسب کرتے کرتے کٹنی بن جائے۔ اری مُردارو اپنے پیچھے کے دامن اونچے کرو۔ تم اس لائق بھی نہیں کہ کوئی تمہیں گالیاں دے۔ گو خود تمہاری زبان پر ہر وقت گالیاں اور قسمیں رہتی ہیں۔ اور قسمیں بھی بعض ایسی مکروہ اور بیہودہ کہ اگر مرد اپنی نیک نیتی سے تمہاری بہتری بھی چاہے تو اپنے کسب کے کرتب اور دکھا اور اُسے بھی بدراہ کرکے اپنی آگ میں پھونک دینا اور اپنی گرمی سے اُسکے دھوئیں اڑا دینا۔ مگر اپنی حرامکاری سے باز نہ آنا۔ اپنے چہروں کو رنگے جاؤ جبتک کہ گھوڑا تمہارے منہ پر لید کرکے تمہاری ان رنگ آمیزیوں کو داغ نہ لگائے۔

فری نیا اور تیماندرا۔ بس ہمیں تو تم روپے اور اشرفیاں دے جاؤ اور یقین مانو کہ روپیہ کے لئے جو کچھ تم کہوگے ہم وہی کرینگے۔

تائمن۔ اپنے ملنے والوں کی ہڈیوں کا گودا خالی کرکے ان میں تپ دق بھر دو۔ اور ان کی پنڈلیوں پر اتنی لاتیں لگاؤ کہ وہ کچھ کر نہ سکیں۔ قانون داں کا گلا بٹھا دو، اس کے حلق سے اتنی آواز نہ نکلے کہ وہ اپنے جھوٹے دعووں پر بحث کر سکے اور تقریر میں موشگافیاں کرنی سب بھول جائیں۔ مندر کے پجاری کو قربانی کے گوشت کے بُرے بھلے ہونے پر اتنے دن اعتراض کرنے دو کہ وہ جوان سے بڈھا ہو جائے۔ مگر تم ایک نہ سنو کیونکہ ان باتوں پر وہ خود اعتقاد نہیں رکھتا۔ اُسے ایسا دبوچو کہ اُس کی ناک ٹوٹ جائے اور وہ جو دنیا کے حالات دیکھکر آئندہ کا حکم لگاتے ہیں اُنہیں ایسا پٹخو کہ وہ زمین پر چاروں خانے چت گریں۔ اور وہ چھبیلے جوان جو گھونگروالے بال رکھتے ہیں اُنہیں مارتے مارتے گنجا کر دو۔ لڑائی کے ڈینگیوں کے خون میں جن کے بدن کورے ہیں فساد پیدا کرو تاکہ کوئی نہ کوئی آزار تو تم سے اُنہیں لگے۔ سب کو کریہہ و ناپاک امراض میں مبتلا کرو تاکہ تمہاری کوشش سے ہر قسم کی تیزی بند ہو جائے۔ لو روپیہ حاضر ہے اور لو۔ اور اس سے دوسروں کو درد و عذاب میں ڈالو۔ اور جب تم مرو تو گندگی کے گڑھوں میں دبائی جاؤ۔

فری نیا اور تیماندرا۔ ہاں ہاں فیاض تائمن سب کچھ قبول۔ بس روپیہ دئے جاؤ اور فرمائشیں کئے جاؤ۔ ہمیں کل باتیں منظور ہیں۔

تائمن۔ ہاں خوب کسب کراؤ۔ خوب خرابیاں پیدا کرو۔ اِس

روپے کو تو اپنی ساتی سمجھو۔
الکی بیادیس:۔ سپاہیو نقارہ بجاؤ اور ایتھنز کی طرف کوچ کرو۔
تائمن:۔ خدا حافظ، اگر میں مارا نہ گیا تو میں تم سے پھر ملاقات کروں گا۔
تائمن:۔ اگر میں نے تمہاری خیر بھی منائی تب بھی میں تمہاری صورت پھر نہ دیکھوں گا۔
الکی بیادیس:۔ میں نے تمہیں کبھی کوئی نقصان نہیں پہونچایا ہے۔
تائمن:۔ تم نے میری تعریف تو کی ہے۔
الکی بیادیس:۔ کیا اسکو تم نقصان پہونچانا سمجھتے ہو؟
تائمن:۔ ابتک لوگوں پر ثابت تو یہی ہوا ہے۔ بس اب یہاں سے دُور ہو اور اپنی اِن شطاؤں کو بھی یہاں سے لیجاؤ۔
الکی بیادیس:۔ ہم اب اسے واقعی ناراض اور ناخوش کرتے ہیں۔ طبل بجاؤ۔

(نقارے اور طبل بجتے ہیں۔ الکی بیادیس چلا جاتا ہے اور اُس کے ساتھ فری نیا اور تیماندرا بھی رُخصت ہوتی ہیں۔)

تائمن:۔ گو فطرت انسان کی ناہمواریوں سے عاجز اور تنگ ہے مگر بھوک پھر بھی ستاتی ہے۔ اے زمین تو سب کی ماں ہے تیرے وسعتِ بطن کی انتہا نہیں۔ تو اپنی جان پر ورچھاتیوں سے سب کو دودھ پلاکر پالتی پوستی ہے۔ مگر تیرا یہ بچہ یعنی انسان مغرور بنتا ہے۔ بس تو اپنے بطن سے انسان کی جگہ غوک سیاہ، مارِ قاتل، چکنی چھپکلیاں اور اندھے زہریلے سانپ یا جسقدر کریہہ اور گندے جاندار جو اِس آسمان کے نیچے آسمان کی حرارت اور روشنی میں نظر آتے ہیں یہ سب تیرے ہی پیدا کئے ہوئے ہیں۔ بس اب ایسی ہی کریہہ صورت جانور پیدا کیا کر۔ اے زمین میں جو تیری کُل اولاد سے متنفر ہوں میں تجھ سے صرف ایک جڑی مانگتا ہوں تاکہ اُسے کھاکر بھوک کی تکلیف دُور کروں۔ اور اے زمین تو اپنے شاداب اور مردم خیز بطن کو خشک کر دے اور ناشکرگزار انسان کا پیدا کرنا بند کر دے۔ سبز رنگ کے اژدھے، کالے بھیڑیئے اور ریچھ یا نئے نئے خونخوار درندے ایسے دکھا جو تو نے اِس فلکِ دیریں کے نیچے اپنی سطح پر ابتک نہ دکھائے ہوں۔ مجھ بھوکے غریب کو تو اِس وقت ایک جڑ سے زیادہ تجھ سے درکار نہیں۔ بس ایک جڑ کھانے کو دیدے۔ اور میں تیرا شکرگزار رہونگا۔ اے انگور کی بیلوں اور ہل جتے کھیتوں جن سے ناشکر گزار انسان شرابیں اور روغنی غذائیں تیار کرکے کھاتا پیتا ہے تاکہ عقل اُس کے دماغ سے گم ہوجائے، تم اپنی پیداوار بند کردو۔

(اپی مانتوس آتا ہے۔)

لو ایک انسان اور آیا۔ ارے تو مِٹ جائے، غارت ہوجائے۔
اپی مانتوس:۔ میں یہاں بھیجا گیا ہوں۔ لوگوں نے مشہور کیا ہے کہ تو نے میری روش اختیار کرکے اُس پر چلنا شروع کیا۔
تائمن:۔ یہ اسلئے کہ تیرے پاس کوئی کتا نہیں ہے جسکی میں نقل اُتاروں۔ تو تپ دق سے گھُل گھُل کر مرے۔
اپی مانتوس:۔ تیری طبیعت میں زہر کا یہ ایک اثر ہے اور ایک نامُرادانہ جُنون، تیری تقدیر کے بگڑنے اور دولت کے معدوم ہونے سے پیدا ہوگیا ہے۔ یہ ہاتھ میں کدال کیسی ہے؟ اور یہ جگہ کیسی ہے جہاں تو اِس وقت ہے۔ نظروں سے اتنا فکر اور غم کیوں ٹپکتا ہے۔ ترے خوشامدی تو اب تک ریشم و حریر پہنے ہیں۔ شرابیں پیتے ہیں، نرم بچھونوں پر اپنے مریض لیکن معطر معشوقوں کو لیکر سوتے ہیں اور اب اُن کو اتنا بھی یاد نہیں کہ تائمن بھی کوئی تھا۔ فطرت کا غلط معترض بنکر اپنی موجودگی سے اِن جنگلوں کو شرمندہ نہ کر۔ اب تو خود خوشامد پیشہ بن جا اور

اُسی چیز سے اپنی بھلائی ڈھونڈ جس نے تجھے بگاڑا ہے۔ ہر کس و ناکس کی تعظیم میں گھٹنے جھکایا کر۔ اور جسے تو دیکھے اُس کے ہر سانس پر تیرے سر سے ٹوپی اُٹھ جایا کرے۔ اُس کی بُری سے بُری حرکتوں کی تعریف کر کے بات بات پر واہ وا کہا کر۔ تیری تعریفیں بھی تو اسی طرح ہوا کرتی ہیں۔ جیسے کہ ایک مے فروش ہر خریدار سے جو کیسا ہی بدمعاش اور لچا ہو خیر مقدم کہتا ہے۔ انصاف یہ ہے کہ تو بھی خبیث اور بدمعاش بن جا تاکہ اگر پھر دولت تیرے پاس آئے تو اس وقت بھی وہ خبیثوں اور نابکاروں کو ملتی رہے۔

تائمن۔ اگر میں تجھ جیسا ہوتا تو اپنے تئیں کبھی کا غارت کر دیتا۔

اپی مانتوس۔ جیسا تو تھا ویسا ہو کر تو پہلے ہی تو اپنے تئیں غارت کر چکا ہے۔ پہلے پاگل تھا، اب عقل سے بے بہرہ ہے۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ سرد ہوا کے یہ جھونکے جو اس وقت تیری خدمت میں حاضر ہیں تیری قمیص کو گرم کرنے کیلئے دھوپ میں ڈالیں گے اور کیا یہ ہرے بھرے درخت جن کے تنوں پر ہری ہری کائی جمی ہے وہ غلاموں کی طرح تیرے پیچھے دوڑیں گے۔ کیا یہ سرد پانی کے چشمے جن میں برف کے ٹکڑے تیرتے ہیں رات کے خمار کے بعد تیرے منہ کا مزہ بدل دیں گے۔ اُن جانوروں کو اپنے پاس بلا جو موسم کی تمام تکلیفوں اور صعوبتوں کو آسمان کے نیچے گرمی جاڑے کی بیدردیوں کو برداشت کرتے ہیں۔ اور عناصر کی اذیتوں کو ننگے بدن جھیلتے ہیں۔ جب یہ جانور قریب آئیں تو اُن سے اپنی تعریف اور خوشامد کی فرمائش کر۔ پھر تو دیکھے گا کہ یہ جانور فطرت کے درد و عذاب کا کس صبر و شکر کے ساتھ تجھ سے ذکر کرتے ہیں۔ پھر تو حقیقت کو پہچانے گا۔ اور تجھے معلوم ہوگا کہ تو کیسا احمق ہے۔

تائمن۔ جا اور یہاں سے دور ہو۔

اپی مانتوس۔ اب مجھے بہ نسبت پہلے کے تجھ سے زیادہ محبت معلوم ہوتی ہے۔

تائمن۔ میں بھی اب بہ نسبت سابق کے تجھ سے زیادہ نفرت کرتا ہوں۔

اپی مانتوس۔ یہ کیوں؟

تائمن۔ یہ اس لئے کہ تو ایک مصیبت زدہ کی خوشامد کرتا ہے۔

اپی مانتوس۔ میں خوشامد نہیں کرتا بلکہ کہتا ہوں کہ تو عقل کا دشمن ہے۔

تائمن۔ تو مجھے ڈھونڈنے کیسے نکلا؟

اپی مانتوس۔ تجھے ستانے کو۔

تائمن۔ یہ کام تو تیرا لچوں اور بیوقوفوں کا سا ہوا۔ کیا مجھے ستانے سے تیرا دل خوش ہوتا ہے۔

اپی مانتوس۔ ہاں۔

تائمن۔ واہ وا۔ تو بھی نرا شُہدا ہی نکلا۔

اپی مانتوس۔ اگر مصیبت اور فروتنی کا یہ روپ تو نے اسلئے بھرا ہے کہ تو اپنی پہلی نخوت کو سزا دے تو اچھا ہے۔ لیکن تجھے تو مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔ اگر آج کو تو فقیر و محتاج نہ ہوتا تو تو اپنی کی شان میں ہوتا۔ جان بوجھ کر مصیبت کا رنگ اختیار کرنا ایسا ہوتا ہے جو دنیا کے شان و شوکت کے رخصت ہونے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ مصیبت کا تاج سر پر تو اُس وقت رکھدیا جاتا ہے جبکہ دنیا کی شان و شوکت راج کرتی ہوتی ہے۔ مصیبت کا دور کبھی ختم نہیں ہوتا۔ دنیا کی شان و تجمل سخت پریشان کرنے والی چیزیں ہیں۔ انسان کو وہ ہمیشہ عذاب میں رکھتی ہیں اور اُن سے جو اطمینان ہوتا ہے وہ بدترین اطمینان سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ اب تو تجھے موت کا آرزومند ہونا چاہیے کیونکہ تو سخت مصیبت میں ہے۔

تائمن۔ تیرے کہنے سے ایسا نہیں کرونگا۔ تو تو مجھ سے بھی زیادہ مصیبت اور عذاب میں ہے۔ تو تو وہ کمینہ ہے جسے دولت نے کبھی پیار سے اپنی آغوش میں نہیں لیا۔ اگر تو بھی دنیا میں قدم رکھتے ہی

وہ عزت کے درجے طے کرتا جو دنیا کی اس مختصر زندگی میں انسان کو پیش آتے ہیں تو پھر تو فتنہ و فساد کے طوفان میں اپنے تئیں غرق کر دیتا اور اپنی جوانی کو طرح طرح کے عیش و عشرت کے بستروں پر گزار کر غارت کرتا، اور کبھی اپنے بزرگوں کی خشک نصیحتوں کو نہ سنتا اور نہ اُن کی قدر و قیمت کو سمجھتا بلکہ جو لہو و لعب تیرے سامنے ہوتا اُسی میں محو اور غرق رہتا۔ لیکن میرا حال مختلف تھا۔ میرے لئے دُنیا مٹھائیوں کی دوکان تھی۔ میری خدمت میں بہت سے دماغ، بہت سی زبانیں، بہت سی آنکھیں ہر وقت کمر بستہ رہتی تھیں۔ اور یہ اتنی تھیں کہ میں اُن کے لئے خدمتیں بھی مخصوص نہیں کر سکتا تھا۔ میرے متعلقین اور متوسلین بے شمار تھے اور وہ سب مجھ سے اسی طرح وابستہ تھے جیسے شاہ بلوط کی شاخوں پر پتے لگے ہوں۔ لیکن جب جاڑا آیا تو یہ پتے ٹہنیوں سے جھڑ کر نیچے گر گئے۔ اور جس طرح شاخیں پتوں کے گرتے ہی برہنہ ہو گئیں یہی حال میرا ہوا۔ آندھیاں طوفان جو کچھ آئیں مجھے سہنے پڑتے ہیں۔ مجھ پر اس مصیبت کا آنا جس نے اچھے دن دیکھے تھے کسی قدر گراں گزر رہا ہے۔ تیری زندگی تو تکلیف و مصیبت ہی میں شروع ہی سے گزری ہے، اور وقت نے تجھے ان تکلیفوں کے سہنے میں سخت کر دیا ہے۔ پھر تو کیوں انسان سے نفرت کرتا ہے؟ کبھی کسی شخص نے تیری تعریف یا خوشامد نہیں کی۔ اگر تو نے اپنے باپ کو بُرا کہا تو اس میں دوسروں کو تو نے کیا دیدیا۔ وہ تیرا چھڑوں لگا باپ تیری خوش نصیبی کی سب سے بڑی دلیل ہے جس نے باوجود تنگدستی اور مصیبت کے کسی فقیرنی سے ہم صحبت ہو کر تجھے دنیا میں پیدا کیا۔ اور اس طرح تو پشتینی تنگدست اور قلاش بن گیا۔ بس اب یہاں سے دفع ہو۔ اگر تو بدترین مخلوق نہ ہوتا تو پھر تو بڑا شیطان اور خوشامدی ہوتا۔

اپی مانتوس:۔ کیا تیرا غرور ابھی تک نہیں ٹوٹا۔

تائمن:۔ مجھے جس بات پر غرور یا ناز ہے وہ یہ ہے کہ میں تجھ سا نہیں۔

اپی مانتوس:۔ نہیں میں تو کبھی دولت کا لٹانے والا اور مسرف نہ تھا۔

تائمن:۔ میرا تو ابتک یہی خیال ہے کہ اگر میں اپنی کل دولت تجھ میں بھر دیتا تو پھر خوش ہو کر تجھے اجازت دیتا کہ تو اپنے گلے میں پھانسی ڈال کر مر جا۔ جا یہاں سے دُور رہو۔ اوہو، یہ جڑ خوب ہاتھ لگی (اُسے کھاتا ہے اور کہتا ہے) اگر ایتھنز کی جان اس جڑ کے ٹکڑے میں ہوتی تو میں اُسے اسی طرح چباتا جیسے اس کو چباتا ہوں۔

(جڑ چبا چبا کر کھاتا ہے۔)

اپی مانتوس:۔ لے یہ ایک جڑی میں تجھے بطور چاشنی کے کھانے کو دیتا ہوں۔ لے کھا۔

تائمن:۔ پہلے تو اس وقت کی ملاقات میں ترمیم کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ تو یہاں سے چلا جا۔

اپی مانتوس:۔ اچھا لے۔ میں بھی ترمیم تو کیا اس وقت کی صحبت کی مرمت کرتا ہوں۔

تائمن:۔ یہ تو جوتیوں کی مرمت ہوئی۔ ملاقات میں ترمیم نہیں ہوئی۔

اپی مانتوس:۔ اچھا، اب میں ایتھنز جاتا ہوں۔ اگر کچھ کہنا ہو تو کہہ دے۔

تائمن:۔ ہاں، خوفناک بگولے کی طرح اُڑتا اور غارت کرتا جا، اور وہاں کے آدمیوں سے کہہ کہ میرے پاس روپے اور اشرفیاں بہت ہیں۔ یقین نہ ہو تو اُدھر آ کر تو خود دیکھ لے کہ روپے اور اشرفیاں میرے پاس کثرت سے ہیں۔

اپی مانتوس:۔ مگر اشرفیاں تیرے کس کام کی؟

تائمن:۔ سچا اور حقیقی کام تو سیم و زر یہیں دیتا ہے۔ یہاں دولت یہاں سو رہی ہے۔ اور اپنے صرف سے کسی کو نقصان یا ضرر نہیں پہونچا سکتی۔

اپی مانتوس :۔ تو راتوں میں کہاں پڑتا ہو؟

تائمن :۔ اس کے نیچے جو سر پر ہے۔ اپی مانتوس تو کہاں کھاتا ہے؟

اپی مانتوس :۔ جہاں پیٹ کو روٹی مل جائے یا جس جگہ کھانے بیٹھ جاؤں۔

تائمن :۔ کاش زہر میرے دل سے واقف ہو کر تیرے لئے کھانا ہوتا۔

اپی مانتوس :۔ تو پھر تم کیا کرتے؟

تائمن :۔ جب تو کھانے بیٹھتا تو وہی زہر تیرے کھانے پر چھڑک دیتا۔

اپی مانتوس :۔ متوسط الحال لوگوں سے تو واقف نہیں جو کچھ واقفیت تجھے ہے وہ انتہا درجے کے امیروں یا فقیروں سے ہے۔ جب تو سونے چاندی سے لدا تھا اور عطر کی لپٹیں تجھ سے آیا کرتی تھیں تو یہ اوسط درجے کے لوگ تجھے حیرت اور تعجب سے دیکھا کرتے تھے۔ جب تجھے چیتھڑے لگ گئے تو پھر کسی نے نہ تجھے پوچھا اور نہ تیری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ بلکہ بجائے اسکے تجھ سے نفرت کرنے لگے۔ لے یہ بیچو اکا پھل تجھے دیتا ہوں۔ اسے کھالے۔ اس سے طبیعت میں اعتدال پیدا ہوگا۔

تائمن :۔ جس چیز سے مجھے نفرت ہوئے میں کھاتا نہیں۔

اپی مانتوس :۔ اگر تو پہلے ہی اِن بیچ والوں سے پرہیز کرتا تو آج کو یہ بُرے دن نہ دیکھتا۔ کیا کوئی سخی تیری نظر سے کبھی گزرا ہے جس سے دولت کے معدوم ہونے پر کسی نے محبت کی ہو۔

تائمن :۔ کیا تو نے بغیر دولت کے بھی کسی کو محبوب دیکھا ہے۔

اپی مانتوس :۔ ہاں۔ میں خود موجود ہوں۔

تائمن :۔ ہاں میں سمجھا۔ تجھ میں کبھی اتنا مقدور بھی نہ تھا کہ ایک کتے کو رفیق بنا کر اپنے پاس رکھتا۔

اپی مانتوس :۔ تائمن تو اپنے خوشامدیوں کی شباہت کن میں زیادہ پاتا ہے۔

تائمن :۔ عورتوں میں۔ رہے مرد، تو ان کا تو کام ہی خوشامد ہے۔

اپی مانتوس اگر یہ دُنیا تیرے قبضے میں آجاتی تو تو کیا کرتا؟

اپی مانتوس :۔ درندوں کے سامنے ڈال دیتا کہ وہ کُل مردوں کو چیر پھاڑ کر ختم کر دیں۔

تائمن :۔ تو کیا اس گڑبڑ میں تو خود بھی درندوں کے سامنے آکر جانوروں میں جانور بنجاتا۔

اپی مانتوس :۔ ہاں۔

تائمن :۔ پھر تیری یہ خواہش تو جانوروں کی سی ہوئی۔ خدا تیری یہ دُعا قبول کرے۔ اپی مانتوس تو اگر شیر ہوتا تو لومڑی تجھے دھوکے دیتی۔ اگر تو بھیڑ کا معصوم بچہ ہوتا تو لومڑی تجھے کھا جاتی۔ اگر تو لومڑی ہوتا اور گدھا تجھ پر کوئی الزام رکھتا تو شیر تجھ سے بدگمان ہوجاتا۔ اگر تو گدھا ہوتا تو پھر اپنی سستی اور کاہلی سے ہمیشہ عذاب میں رہتا اور ابتک کسی بھیڑیئے کے پیٹ میں پہونچ چکا ہوتا۔ پھر تیرا لالچ تجھے آزار پہونچاتا۔ اور اپنی غذا بہم پہونچانے کے لئے تجھے اپنی جان خطرے میں ڈالنی پڑتی۔ اگر تو وہ ہرن ہوتا جسکے ماتھے پر ایک سینگ ہوتا ہے تو پھر غرور اور غصہ تجھے پریشان رکھتا۔ اور یہی چیزیں تجھے ہلاک کر دیتیں۔ اگر تو ریچھ ہوتا تو جنگلی گھوڑا تجھے مار ڈالتا۔ اور اگر گھوڑا ہوتا تو چیتا تجھے ایک جست پر ڈھیر کر دیتا۔ اگر تو چیتا ہوتا یعنی جنگل کے بادشاہ شیر کے خاندان سے ہوتا تو پھر تیرے کُنبے والوں ہی کی کھال کے گُل بوٹے اور دھاریاں تیری موت کا فیصلہ کرنے کو حکم بنکر بیٹھ جاتیں۔ پھر تیری جان کا بچنا مُحال ہوتا اور بچاوے کی کوئی صورت نہ نکلتی۔ بھلا بتاؤ تو ایسا کونسا جانور ہو سکتا ہے جو دوسرے جانور کے چنگل میں نہ آجاتا ہو؟ اور تو اب بھی ایسا جانور ہے جو ایک جانور سے دوسرے جانور کی جُون میں آنے سے کوئی نقصان محسوس نہیں کرتا۔

اپی مانتوس :۔ اگر تو مجھ سے بات کرنے میں مجھے خوش کرتا تو

یہ جو کچھ تو نے کہا وہ درست ہوتا۔ ایتھنز کی ریاست تو جانوروں اور حیوانوں کا ایک جنگل ہو رہی ہے۔

تائمن :۔ ایک گدھے نے شہر کی دیوار کیونکر توڑ دی کہ وہ شہر پناہ سے باہر دکھائی دینے لگا۔

اپی مانتوس :۔ سامنے دیکھ۔ ایک شاعر اور ایک مصوّر ادھر آتے نظر آتے ہیں۔ اِن سے ملاقات تیرے حق میں طاعون کا کام دیگی۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ وبا مجھے نہ لپٹ جائے۔ اس لئے میں تو یہاں سے چلتا ہوں۔ اچھا اگر اور کوئی کام نہ ہوا تو میں تجھ سے پھر ملاقات کرونگا۔

تائمن :۔ جب سوائے تیرے کوئی جیتا نہ ہوگا تو پھر تیرا یہاں آنا ضرور مبارک ہوگا۔ میں تو اپی مانتوس دُنیا کے ایک فقیر کا کتا ہونا پسند کرتا۔

اپی مانتوس :۔ دُنیا میں جتنے بیوقوف اور احمق زندہ ہیں تائمن تو اُن سب کا سردار ہے۔

تائمن :۔ کاش تُو اتنا صاف سُتھرا ہوتا کہ میں تجھ پر تھوک سکتا۔

اپی مانتوس :۔ خُدا تجھے غارت کرے۔ تُو تو اِتنا خبیث ہے کہ تجھ پر لعنت بھیجنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔

تائمن :۔ جتنے خبیث اور ناہنجار میرے ساتھ ہیں وہ تجھ سے زیادہ پاک ہیں۔

اپی مانتوس :۔ جو کچھ تیری زبان سے نکلتا ہے وہ ایک مرضِ متعدّی سے کم نہیں ہے۔

تائمن :۔ میری زبان سے تو تیرا ہی نام نکلتا ہے۔ میں تو تجھے خُوب ٹھوکتا مگر ڈرتا ہوں کہ کہیں تیرا پلید زہر میرے ہاتھوں کو نہ لگ جائے، جس سے میرے ہاتھ گل جائیں۔

اپی مانتوس :۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ میری زبان تیرے ہاتھوں کو گلا دیتی۔

تائمن :۔ دُور ہو خارشی کُتّے کے جَنے۔ تجھے جیتا دیکھکر تو میں غم اور غصّے سے مرا جاتا ہوں۔ تیری طرف نظر اُٹھانے سے غش آتا ہے۔

اپی مانتوس :۔ بہتر ہوتا کہ تو غش ہو جاتا۔

تائمن :۔ ارے باتونی خبیث یہاں سے دُور ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تجھے پتھر مار کر میں ایک پتھر کا نقصان کروں۔

(تائمن پتھر اُٹھا کر اپی مانتوس کو مارتا ہے)

اپی مانتوس :۔ ارے جانور۔

تائمن :۔ غلطے۔

اپی مانتوس :۔ گندے مینڈک۔

تائمن :۔ دُور ہو لُچے۔ خبیث نابکار۔ دفع ہو۔ اے خُدا میں تو اِس جھوٹی دُنیا سے بہت ہی تنگ و بیزار ہوں۔ تو تو مجھے دُنیا کی ہر چیز سے یہانتک کہ ضروریاتِ زندگی سے بھی بے نیاز کر دے۔ اگر یہی حال ہے تو پھر تائمن اُٹھ یہیں اپنی قبر ایسی جگہ کھود لے جہاں سمندر کے ہلکے ہلکے کف تیری قبر کے پتھروں سے رات دن ٹکرایا کریں اور اپنی قبر کا کتبہ بھی تیار کر لے تاکہ تیری موت دوسروں کی زندگی پر ہنسا کرے۔ (زر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے) اے بادشاہوں کے پیارے قاتل اور شیریں دشمن، جو باپ اور حرامی فرزند میں تعلقات مُنقطع کرتا ہے، اور اے تو جو خوشرو جوانوں سے شادی کے بستر کو ناپاک کراتا ہے۔ اے زر تو خُدائے جنگ ہے جو ہمیشہ جوان اور تروتازہ رہتا ہے۔ جس سے ہر متنفس محبّت و اُلفت رکھتا ہے۔ تو وہ نازک و حسین محبوب ہے جس کے چہرے کی گرمی سے چندر دیبی کی گود کا برف بھی پانی ہو جاتا ہے۔ اے زر تو خُدائے آشکار اور ظاہر ہے جو دُنیا کی ہر زبان بولنے والے سے ہر مطلب و مقصد کیلئے بات کر سکتا ہے۔ جو سب دلوں کی کسوٹی ہے۔ بس اے زر خیال کر کہ میں تیرا غلام اور بندہ تجھ سے سرکش ہو گیا ہوں۔ بس اے خُدائے زر تُو اپنے زور سے وہ تباہی اور غارتگری پیدا کر کہ اِس روئے زمین پر بجائے انسان کے درندوں اور حیوانوں کی حکومت اور سلطنت ہو جائے۔

اپی مانتوس۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں مگر میرے مرنے سے پہلے ایسا نہ ہو۔ تائمن تیرے پاس زر ہے اور اب پھر بہت جلد لوگ تجھ پر ہجوم کریں گے۔

تائمن۔ کیا پھر لوگ میرے پاس آنا شروع کرینگے۔

اپی مانتوس۔ ہاں۔

تائمن۔ جو کچھ بھی ہو۔ خدا کیلئے تُو تو یہاں سے کسی طرح دفع ہو۔

اپی مانتوس۔ اچھا زندہ رہ اور اپنی مُصیبتوں سے چاہت کرتا رہ۔

تائمن۔ تُو بھی اسی طرح مدّت دراز تک زندہ رہ اور مُصیبت ہی میں مرے بھی۔

اپی مانتوس۔ لے۔ اور صورتیں آدمیوں کی سی اِدھر آرہی ہیں۔ اِنہیں کھا جا اور ان سے نفرت رکھ۔

(چلا جاتا ہے)

(چند قزاق آتے ہیں)

پہلا قزاق۔ وہ خزانہ کہاں ملے گا؟ ارے یہ فقیر کی صورت کون ہے؟ اس کی صورت تو باسی اور جھوٹی روٹی کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتی ہے۔ پیسہ پاس نہ ہونے اور دوستوں کی مفارقت نے اِسے اس حال کو پہونچایا ہے۔

دوسرا قزاق۔ مشہور تو یہ ہے کہ اس کے پاس بڑا خزانہ ہے۔

تیسرا قزاق۔ آؤ ذرا اس سے پوچھ گچھ کریں۔ اگر روپے کی اُسے پروا نہیں ہے تو وہ آسانی سے جو کچھ اُس کے پاس ہوگا ہمیں دیدے گا۔ اور اگر اُس نے لالچ کیا اور روپیہ ہمیں نہ دیا تو پھر جو کچھ اُس کے پاس ہے زبردستی اُس سے چھین لینگے۔

دوسرا قزاق۔ یہ تو ضرور ہے کہ روپیہ اس کی کمر سے تو بندھا نہیں ہے۔ کہیں چھپا ہوگا۔

پہلا قزاق۔ کیا یہ وہی آدمی نہیں ہے؟

دوسرا قزاق۔ کدھر؟

پہلا قزاق۔ پتہ تو اِسی کا دیا گیا تھا۔

تیسرا قزاق۔ اِسے تو میں خُوب جانتا ہوں۔

کُل قزاق۔ تائمن خدا تجھے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

تائمن۔ اچھا تم سب چور ہو جو یہاں آئے ہو۔

کُل قزاق۔ ہم چور نہیں سپاہی ہیں۔

تائمن۔ سپاہی یا چور دونوں ہوتے تو عورت کے جنے ہیں۔

کُل قزاق۔ ہم چور نہیں ہیں بلکہ ضرورت مند لوگ ہیں۔

تائمن۔ تمہاری سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ تمہیں کچھ کھانے کو ملے۔ غور کرو زمین کے نیچے کھانے کی کتنی جڑیں چیزیں دبی پڑی ہیں۔ ایک میل کے دَور میں بیسیوں صاف شفاف پانی کے چشمے جاری ہیں۔ شاہ بلوط کے پھل ٹپک رہے ہیں۔ جھڑبیریاں پھلوں سے لال ہو رہی ہیں۔ فیاض فطرت نے اپنا دسترخوان ہر جھاڑی پر چُن رکھا ہے۔ ضرورت۔ ضرورت تمہیں بعید ہے۔

پہلا قزاق۔ ہم گھاس پات، جنگلی بیروں اور پانی پر گزر اِس طرح نہیں کر سکتے جیسے چوپائے یا پرندے اور مچھلیاں کرتی ہیں۔

تائمن۔ اور نہ تمہارا گزر چوپایوں پرندوں اور مچھلیوں کو کھا کر ہو سکتا ہے۔ تو پھر بہتر ہو کہ آدمیوں کو کھانا شروع کر دو۔ اس پر بھی میں تمہارا شکرگزار ہوں کہ تم پیشہ ور چور ہو۔ اور یہ کہ تم اکل حلال نہیں کھاتے۔ پیشوں اور حرفوں میں بھی بے شمار چوریاں ہوتی ہیں۔ چور و! اُٹھائی گیرو! لو یہ روپے اور اشرفیاں موجود ہیں۔ اِنہیں اُٹھائے جاؤ۔ اور انگور کا خُون چُوسو اور اتنا چُوسو کہ شدّت کی گرمی تمہارے خُون میں جوش کھانے لگے۔ اور پھر تم کسی طرح پھانسی چڑھنے سے بچ جاؤ۔ کبھی کسی طبیب کا اعتبار نہ کرنا۔ جتنی دوائیاں اُس کے پاس ہیں وہ سب زہر ہلاہل ہیں۔ تم اتنی چوریاں نہیں کرتے جتنے آدمیوں کی جان وہ اپنی دوائیوں سے لیتے ہیں۔

جاؤ لوگوں کی دولت بھی لُوٹو اور اُنہیں جان سے بھی مارو۔ خُوب چوریاں بدمعاشیاں کرو کیونکہ تم اپنے پیشے کو اسی طرح بیان کرتے ہو جیسے کوئی مزدور اپنی محنت کو بیان کرے۔ آؤ چوریوں کی مثالیں مَیں تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں۔ دیکھو یہ تمہارے سر پر چمکتا سُورج بھی چور ہے۔ وہ اپنی زبردست کشش سے سمندر کا پانی چُراتا ہے۔ یہ چاند بھی گشتی چور ہے کیونکہ وہ اپنی زرد اور مدھم روشنی سُورج سے چُراتا ہے۔ سمندر بھی چور ہے کیونکہ وہ دُنیا بھر کا فضلہ اپنے نیچے دبا کر پھل پھول پیدا کرتا ہے۔ غرض ہر چیز چور ہے۔ قوانین جو تازیانوں اور لگاموں کا کام دیتے ہیں جب وہ شدت اور زور پر ہوتے ہیں تو ایسی ایسی چوریاں کرتے ہیں جن کا تدارک ممکن نہیں۔ ان کے توڑنے میں بھی مطلق دریغ نہ کرو۔ جاؤ اور ایک دوسرے کو خُوب لُوٹو۔ یہاں ابھی اور خزانہ موجُود ہے، اے قاتلو، انسان کے گلے پر چھُریاں پھیرنے والو، راہ میں جو کوئی بھی تمہیں ملے گا وہ چور ہی ہوگا۔ دُور ہو۔ ایتھنز چلے جاؤ۔ وہاں جا کر دُکانوں میں نقب لگاؤ۔ جو کچھ تم چوری کروگے وہ چوروں ہی کی گانٹھ کاٹوگے۔ یہ مال و زر جو میں تمہیں اسوقت دیتا ہوں اُسے پا کر کہیں چوریاں بند نہ کر دینا۔ جو کوئی بھی ہو زر کی طاقت سے اُسے تباہ و برباد کرنا۔ آمین۔

تیسرا قزاق:۔ اس نے تو چوری کی وہ وہ تعریفیں کی ہیں کہ مَیں تو اس کمبخت پیشے کا عاشق ہو گیا۔

پہلا قزاق:۔ نہیں تم سمجھے نہیں۔ اسے نسلِ آدم سے بغض و کینہ ہو گیا ہے۔ اس لئے اُس نے ایسی باتیں ہم سے کہی ہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ ہماری بھلائی اور بہبود کیلئے اُس نے یہ ہدایتیں کی ہیں۔

دوسرا قزاق:۔ میں تو اُسے دُشمن سمجھکر بھی اب چوری کا پیشہ ترک کروں گا۔

پہلا قزاق:۔ پہلے ایتھنز میں امن و امان تو ہو جانے دو۔ سچ ہے، انسان کیلئے سچائی کا وقت جیسا مُصیبت اور پریشانی کا ہوتا ہے ایسا دوسرا نہیں ہوتا۔

(قزاق چلے جاتے ہیں)

(فلے ولیوس تائمن کا پُرانا ملازم آتا ہے)

فلے ولیوس:۔ خُدایا، یہ سامنے جو فقیر لاغر و خستہ حال نظر آتا ہے کیا یہ میرا آقا ہے؟ ہائے کیسا زار و حقیر و لاغر و ناتواں ہو گیا ہے، ہائے فیاضیوں اور نیک کاموں کی قابلِ حیرت یادگار کی یہ سزا! یہ انجام کیسا بُرا ہوا۔ ہائے افلاس و تنگدستی نے تیری عزت کیسی خاک میں ملا دی۔ اُن دوستوں سے بھی بدتر کوئی چیز دُنیا میں نہ ہوگی جو لطیف سے شریف طبیعتوں کو بھی ایسی بُری نوبت کو پہنچا دیں۔ زمانے میں بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کسی نے دُشمن سے محبت کرنے کو کہا ہو۔ مگر اب تو بہتر ہی معلوم ہوتا ہے کہ بجائے دوستوں سے محبت اور اُنس رکھنے کے دُشمنوں سے محبت کروں یا اُن کی محبت کا آرزومند رہوں۔ آقا نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ آگے بڑھکر مالک پر اپنا سچا رنج و غم ظاہر کروں۔ ہر حال میں وہ میرا آقا ہے، اسلئے مَیں اپنی کُل زندگی اسی کی خدمت میں گزاروں گا۔ اے میرے بہت پیارے آقا۔

تائمن:۔ دُور رہو، تو کون ہے؟

فلے ولیوس:۔ حضور کیا مجھے بھُول گئے؟

تائمن:۔ یہ سوال کیوں کرتا ہے؟ مَیں تو تمام انسانوں کو بھُول چُکا ہوں۔ پھر اگر تُو اپنے کو انسان سمجھتا ہے تو جان لے کہ مَیں تجھے بھی بھُول گیا۔

فلے ولیوس:۔ مَیں تو حضور کا ادنیٰ غمگسار ہوں۔ حضور کا قدیم ایماندار مُلازم ہوں۔

تائمن:۔ اسی لئے مَیں تجھے اور بھی نہیں جانتا۔ میرے پاس تو کوئی بھی ایماندار آدمی نہیں تھا۔ نوکر اور مُلازم جتنے تھے وہ سب حرامخور اور بے ایمان تھے تاکہ چوروں اور بے ایمانوں کی خاطر و مدارات کیا کریں۔

شاعر۔ آؤ اس سے ملیں۔

مصوّر۔ گو فائدے کی اُمید تھی مگر پھر بھی دیر میں نہ ہیں آیا کہ اُسے ناحق تکلیف دی۔

شاعر۔ بجا ہے۔ رات آنے سے پہلے دن کی روشنی میں اگر یہ معلوم کرلو کہ کیا درکار ہوگا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ آؤ چلو۔

تائمن۔ (علیحدہ) اچھا میں بھی اِن دونوں سے رستے کے موڑ پر ملاقات کرتا ہوں۔ یہ زر بھی کیسا زبردست خدا ہے۔ تیری پرستش تو ایسے معبدوں میں بھی ہوسکتی ہے جو گندگی میں سوٗرنیوں کے دڑبوں سے بھی زیادہ کثیف ہوں۔ اے زر تو اپنے جہازوں پر بادبان چڑھا کر سمندر کے کفوں پر انہیں چلاتا ہے۔ ایک کمینے کو بھی وہ شان بخشتا ہے کہ ہر کس و ناکس اُس کی تعظیم کرنے لگے۔ تیری پرستش انسان پر لازمی ہے۔ رہے تیرے اولیاء اور اصفیا تو اُن کے سروں پر مصیبتوں اور بلیّات کا تاج رکھنا ہی زیبا ہوگا کہ سوائے تیرے وہ کسی کی پرستش نہ کریں۔ میں اِن دونوں سے ملتا ہوں۔

(آگے بڑھتا ہے)

شاعر۔ مرحبا لائق تائمن۔

مصوّر۔ نہایت شریف امیر اور ہمارے آقا۔

تائمن۔ جب کبھی میں پہلے زندہ تھا تو کیا میں نے دو ایماندار آدمیوں کو دیکھا تھا؟

شاعر۔ جناب والا۔ ہم اکثر حضور کے مورد عنایات رہے ہیں۔ ہم نے سُنا کہ حضور دُنیا سے دست بردار ہوگئے ہیں اور جملہ احباب سے مفارقت اختیار فرمائی ہے جن کی ناسپاس طبیعتیں (اور یہ طبیعتیں قابل نفریں ہیں) آسمان کے تازیانے اتنے لمبے نہیں ہیں . . . . .

تائمن۔ پھر آپ کو اِس سے کیا غرض، کیا مطلب؟

شاعر۔ حضور کی شرافت جو آسمان کے تاروں کی طرح نور برسا کر اُن میں جان ڈالتی تھی۔ جب اُس کا خیال آتا ہے تو میں اُنکی اِس محسن کشی اور ناسپاس گزاری کا ہرگز متحمل نہیں ہوسکتا۔ اُنکی یہ نازیبا حرکتیں اتنی ہیں کہ الفاظ اُن کے بیان پر قادر نہیں۔

تائمن۔ یہ تو سب پر ظاہر ہے۔ ممکن ہے لوگ اِس حال کو بہتر سمجھتے ہوں۔ لیکن تم البتہ جو سچّے اور ایماندار آدمی ہو جیسا کہ تمہاری صورتوں سے ظاہر ہوتا ہے، اُن کی احسان فراموشیوں کو بہتر طریقے پر بتا اور دکھا سکتے ہو۔

مصوّر۔ حضور میں نے اور اِنہوں نے حضور ہی کی دولت کے ترشح نعمت میں یہاں تک سفر اختیار کیا اور یہ سفر ہمیں بہت خوشگوار گزرا۔

تائمن۔ ہاں تم سچّے اور ایماندار ہو۔

مصوّر۔ جناب والا ہم یہاں اِس غرض سے حاضر ہوئے ہیں کہ حضور کی خدمت کریں۔

تائمن۔ سچّے اور ایماندار لوگو۔ میں تمہاری اِس خدمت کا معاوضہ کس طرح کرسکتا ہوں۔ کیا تم مٹی سے کھودی ہوئی جڑوں پر گزر کرسکتے ہو، اور ٹھنڈا پانی پی سکتے ہو؟ نہیں تم سے یہ ممکن نہیں۔

دونوں۔ جو کچھ ہم کرسکتے ہیں حضور کی خدمت بجالانے کیلئے حاضر ہیں۔

تائمن۔ تم تو سچّے آدمی ہو۔ تمہیں خبر لگی ہے کہ میرے پاس خزانہ ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہیں اِس کی خبر پہونچی ہے۔ دیکھو تم سچّے اور ایماندار لوگ ہو۔ سچ سچ بتانا کیا یہ بات نہیں ہے؟

مصوّر۔ شریف آقا۔ خبر ایسی ہی مشہور ہوئی ہے، لیکن میں اور میرے یہ دوست اِس خیال سے یہاں نہیں آئے ہیں۔

تائمن۔ تم سچّے اور دیانتدار ضرور ہو مگر اس کے ساتھ ہی تم جلساز بھی ہو۔ ایتھنز میں تم سے بڑھکر مکار اور چالاک دوسرا

نہ نکلے گا۔ تمہارا جعل اور فریب بہت ہی لطیف و نادر قسم کا ہے۔

مصوّر: حضور بالکل بجا فرماتے ہیں۔

تائمن: سچی بات وہی ہے جو مَیں نے کہی ہے۔ آپکے اشعار میں دلچسپ افسانے اور چُست بندشیں بڑی بڑی نزاکتوں اور سلاست کے ساتھ بھری ہوتی ہیں۔ جن سے آپ فطرت کے پورے نقال معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی لے میرے پاک نفس دوستو یہی کہنا پڑتا ہے کہ تم میں تھوڑی سی خامی ضرور ہے۔ مگر باوجود اس کے وہ کوئی بڑی خامی نہیں ہے اور نہ مَیں چاہتا ہوں کہ اس کے رفع کرنے میں کچھ زیادہ تکلیف اُٹھاؤ۔

دونوں: التماس ہو کہ وہ خامی ہمیں بتائی جائے۔

تائمن: نہیں۔ تم برا مان جاؤ گے۔

دونوں: نہیں ہم حضور کے بیحد شکر گزار ہونگے۔

تائمن: کیا واقعی ایسا ہوگا؟

دونوں: لائق امیر۔ حضور اس میں مُطلق شبہ نہ کریں۔

تائمن: تم میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی ایسے فریبی دغاباز کی بات کا یقین کرتا ہو جس نے تمہیں کوئی سخت دھوکا دیا ہو۔

دونوں: کیا حضور ہم ایسے ہیں؟

تائمن: ہاں، تم اُسی کے فریب سُنتے ہو اور اُسی کی مکاریاں دیکھتے ہو۔ اُس کے مکر و فریب کا یقین کر کے اُسے مکار اور بدمعاش جانتے ہو۔ پھر بھی تم اس سے خلوص اور محبت ظاہر کرتے ہو اُسے اچھے اچھے کھانے کھلاتے ہو۔ اُسے اپنے سینے سے لگاتے ہو۔ مگر اس کے ساتھ ہی برابر محسوس کرتے ہو کہ وہ پکا شیطان اور بدمعاش ہے۔

مصوّر: حضور مَیں تو کسی ایسے آدمی سے واقف نہیں۔

شاعر: اور نہ یہ ناچیز کسی ایسے شخص کا علم رکھتا ہے۔

تائمن: دیکھو مجھے تم سے محبت ہے۔ مَیں تمہیں روپے اشرفیاں دونگا۔ کسی طرح اپنے اِن ساتھ والے بدمعاشوں سے میرا پیچھا چھڑا دو۔ انہیں پھانسی دیدو، تھپڑ لوں سے انہیں زخمی کرو۔ سمندر میں انہیں غرق کر دو غرض کسی نہ کسی طرح انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دو۔ پھر میرے پاس آنا۔ مَیں تمہیں سیم و زر سے مالا مال کر دونگا۔

دونوں: آقا اُن کا نام بتایا جائے ہمیں معلوم رہنا چاہیئے کہ وہ کون لوگ ہیں۔

تائمن: تم میں سے ایک اِدھر جائے، دوسرا دوسری طرف جائے۔ دونوں ملکر نہ جائیں۔ ہر شخص جُدا جُدا اکیلا جائے۔ اور شیطان ہمیشہ اس اکیلے آدمی کے ساتھ ہو۔ جہاں کہیں تم ہو اگر وہاں دو شیطان نہ ہوں تو تم اکیلے شیطان کے قریب نہ جانا۔ اگر تمہیں وہاں رہنا پڑے جہاں کوئی اکیلا شیطان ہو تو اُسے چھوڑ کر چمپت ہو جانا۔ اچھا دیکھو، وہ اشرفیوں کا ڈھیر لگا ہے۔ تم اسی کے لئے آئے تھے نا؟ شیطانو! خبیثو! بس دُور ہو۔ (شاعر اور مصوّر دونوں کو تائمن مار کر نکالدیتا ہے۔)

(فلے ویوس اور ایتھنز کی مجلس کے دو رکن آتے ہیں)

فلے ویوس: آقا سے گفتگو کرنی لاحاصل ہوگی۔ وہ اپنے ہی خیال میں ایسے غرق رہتے ہیں کہ سوائے اپنے وہ کسی دوسرے کو اپنا دوست نہیں سمجھتے۔

پہلا رکن: جس غار میں وہ رہتے ہیں اُسکے قریب مجھے پہنچا دو۔ ہم ایتھنز کے لوگوں سے وعدہ کر کے آئے ہیں کہ ہم تائمن سے گفتگو کریں گے۔

دوسرا رکن: کیا تائمن کا حال ہمیشہ ایک ہی سا رہتا ہے؟ انسان تو کوئی بھی ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتا۔ قسمت کی گردش، رنج و آلام نے طبیعت میں جنون پیدا کر کے اُسکا یہ درجہ کیا ہے۔ مگر زمانہ کی کشادہ دستی اور فیاضی نے پھر اُس کو وہی دولت دیدی ہے جو پہلے اُسکے پاس تھی۔ اِسلئے

ممکن ہے کہ پھر وہ پہلا سا آدمی ہوجائے۔ تم ہمیں اُسکے پاس لے چلو۔ پھر جو کچھ ہو ہم دیکھ لیں گے۔

فلے ویوس ۔۔ لیجئے وہ غار آگیا جس میں تائمن رہتے ہیں۔ اِسی غار میں انہیں امن و عافیت نصیب ہے۔ (پکارتا ہے) تائمن! امیر تائمن۔ آقا تائمن۔ ذرا باہر آئیے اور دوستوں سے ملاقات کیجیے۔ ایتھنز کے لوگوں نے مجلس کے دو معزز رکنوں کی معرفت آپ کو سلام کہلا بھیجا ہے۔ شریف تائمن ضرور باہر نکلکر اُن سے ملاقات کریں۔

(تائمن غار سے نکل کر آتا ہے)

تائمن ۔۔ اے راحت و آرام دینے والے آفتاب دُنیا کو پھونکدے! بات کرو اور غارت ہوجاؤ۔ جو لفظ تمہاری زبان سے سچا نکلے وہی تمہاری زبان پر آبلہ اور جو لفظ جھوٹ ہو وہی تمہاری زبان کی جڑ میں پھپھولا ڈالے اور بات کرنے میں تمہاری زبان غارت ہوجائے۔

پہلا رکن ۔۔ تائمن۔ لائق تائمن۔

تائمن ۔۔ سوائے تمہارے تائمن کسی دوسرے کے لائق نہیں اور تم ہی تائمن کے لائق ہو۔

پہلا رکن ۔۔ تائمن۔ مجلس کے رکنوں نے آپ کو سلام کہا ہے۔

تائمن ۔۔ اُن کا شکرگزار ہوا۔ اور اِس طاعون کے جواب میں طاعون ہی اُن کے پاس بھیجتا ہوں بشرطیکہ طاعون مجھ پر بھی اثر کرجائے۔

پہلا رکن ۔۔ تائمن جو کچھ ہوا اُس پر مجلس کو افسوس ہے۔ اب آپ وہ سب باتیں بھول جائیں۔ مجلسِ ایتھنز کے جملہ اراکین آپکے خلوص اور محبت میں یک زبان ہوکر آپسے ملتجی ہیں کہ آپ ایتھنز واپس چلیں۔ اور مجلس کے اِنہی رکنوں نے نہایت خصوصیت کے ساتھ بہت سے درجات اور خطابات جو اِسوقت دئے جاسکتے ہیں آپکو عطا کرنے کیلئے تجویز کرلئے ہیں۔

دوسرا رکن ۔۔ اب وہ اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے فی الواقع آپ کی طرف سے بے اعتنائی کی تھی اور آپکے گذشتہ احسانات کو دل سے بھلا دیا تھا اور عمومِ ایتھنز جو ایک مرتبہ کچھ زبان سے کہکر بہت کم اُس سے تجاوز کرتے ہیں آپ کی عدم موجودگی پر اور اِس قصور پر کہ اُس وقت کیوں انہوں نے آپ کی مدد نہیں کی سخت نادم و پشیمان ہیں۔ اور اِسی حالتِ افسوس و خجالت میں انہوں نے ہمیں آپکے پاس اِس غرض سے بھیجا ہے کہ ہم ندامت و پشیمانی ظاہر کرکے عطائے اعزاز و اکرام کے آپسے وعدے کریں کہ اُن سے حضور کی تکلیفوں کی رتی رتی تلافی ہوجائے۔ اور اب اُنس و محبت کے وہ وہ انبار اور مال و دولت کی وہ وہ بھاری رقمیں پیش کریں کہ جو جو بے انصافیاں آپکے ساتھ انہوں نے کی ہیں وہ سب کالعدم ہوجائیں۔ اور پھر باہم تعلق اور محبت وہ چیزیں ہوں جن پر آپ آئندہ غور کرتے رہیں۔

تائمن ۔۔ آپ کی اِس سحر بیانی نے تو مجھ پر جادو کردیا اور مجھ پر وہ عالمِ حیرت طاری کیا کہ میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ لیکن بہتر ہو کہ آپ مجھے ایک احمق کا دل اور ایک عورت کی آنکھیں مستعار دیدیں۔ اور اے اراکینِ مجلس میں آپ کے اِن عطیوں پر روؤنگا۔

پہلا رکن ۔۔ تو پھر ہمارے ساتھ ایتھنز چلیے۔ اور ہمارے اور اپنے شہر کی فوجوں کی سپہ سالاری قبول کیجیے۔ ہم اور وہ سب آپ کے اِس احسان کے شکرگزار ہونگے۔ اور آپ کو جملہ سپید و سیاہ پر اختیار ہوگا۔ اور جس وقت ہم الکی بیادیس کو جو نہایت وحشیانہ طریقے پر ہم پر یورش کر رہا ہے اور ایک جنگلی سور کی طرح اپنی خونخوار کچلیوں سے امن و سلامتی کی جڑیں کھودنی چاہتا ہے جب ہم اُسے اُس کے اِس مقصد سے باز رکھیں گے اور شہر سے دُور اور دفع کردینگے تو پھر آپ ہی کا نام نامی حکومت

اختیارات کے ساتھ قائم و دائم رہیگا۔

دوسرا رُکن:۔ الکی بیادیس یہی نہیں کر رہا۔ بلکہ اپنے خوفناک حملوں سے ایتھنز کی شہرپناہ کو مسمار کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔

پہلا رُکن:۔ پس تائمن۔

تائمن:۔ ہاں ضرور میں تعمیلِ ارشاد کروں گا اور جو کچھ اس ارشاد کی تعمیل میں کرونگا وہ یہی ہوگا کہ اگر الکی بیادیس نے شہر کے آدمیوں کو غارت اور ہلاک کر دیا تو یہی کہونگا "مجھے اس سے کچھ مطلب و غرض نہیں"۔ یا اگر اُس نے ایتھنز کے واجب التعظیم بڈھے امراء کی ڈاڑھیاں پکڑکر انہیں قتل کیا یا ہمارے شہر کی اچھوتی کنواری لڑکیوں کے دامنِ عصمت پر وہ داغ لگا یا جیساکہ وحشیانہ جنگ وجدل میں ہوا کرتا ہے تو پھر شہر والوں کو معلوم رہے کہ تائمن خود شہر کے بزرگوں اور جوانوں پر رحم کھاکر اپنی زبان سے سوائے اس کے کچھ کہنا پسند نہ کریگا کہ "الکی بیادیس کی ان باتوں کی مجھے مطلق پروا نہیں"۔ اور پھر ایتھنز کو بد سے بدتر حالت قبول کرنی پڑیگی۔ اور جب تک تم گلے اور گردنیں رکھتے ہو چھریوں سے اُن کے کٹنے پر تائمن کو مطلق افسوس نہ ہوگا۔ رہا میں، تو اس وحشتناک لشکر میں کوئی تیز خنجر ایسا نہیں جس کی قدر شناسی بزرگ سے بزرگ اور مقدس سے مقدس گلے کے مقابلے میں زیادہ نہ کرتا ہوں۔ پس میں ایتھنز کے لوگوں کو اُن کے محافظ و نگہبان خداؤں کے سپرد اس طرح کرتا ہوں جیسے کوئی چوروں اور سارقوں کو اُن کے پاسبانوں کے سپرد کر دے۔

فلے ویوس:۔ آپ کیوں زیادہ تکلیف کرتے ہیں۔ رخصت ہوجیئے۔ آپ کی یہ کوشش بالکل عبث اور لاحاصل ہے۔

تائمن:۔ ہاں۔ میں تو اس وقت اپنی قبر کا کتبہ شروع کر رہا تھا کہ کیا لکھوں۔ اچھا کل شب تو آپ اُسے پڑھ ہی لیں گے۔ زندگی بسر کرنے کی دشواریوں اور مدت کی عدم تندرستی میں اب کسی قدر افاقہ ہوچلا ہے۔ لیکن جو چیزیں مجھ سے جاچکی ہیں وہ پھر نہیں مل سکتیں۔ جاؤ۔ زندہ رہو۔ الکی بیادیس تمہارے حق پر اور تم اسکے حق میں بلائے آسمانی ثابت ہوتے رہو اور مدتِ دراز تک تم سب کا یہی حال ہے۔

پہلا رُکن:۔ اب زیادہ کچھ کہنا فضول ہوگا۔

تائمن:۔ لیکن مجھے اپنے ملک وطن سے ابتک محبت ہے۔ اور میں اُن غارتگر وحشیوں کی طرح نہیں ہوں جو کسی کی تباہی و بربادی پر خوش ہوتے ہیں۔

پہلا رُکن:۔ یہ بات آپنے بہت صحیح فرمائی۔

تائمن:۔ میرے محبانِ وطن کو میرا بہت بہت سلام کہدینا۔

پہلا رُکن:۔ ایسی باتیں جب آپ کی زبان سے نکلتی ہیں تو فی الواقع وہ آپ ہی کے شایاں ہوتی ہیں۔

دوسرا رُکن:۔ اور وہ اس طرح ہمارے کانوں میں داخل ہوتی ہیں جیسے کوئی فاتح مفتوح شہر کے دروازے میں داخل ہو جہاں اُسکے قدر داں موجود ہوں۔

تائمن:۔ میرا تم اُن سے سلام ضرور کہدینا اور کہنا کہ اپنے شہر والوں پر اُن کے آلام کو آسان کرنے کیلئے اور دشمن کی ضربوں کے خوف کو کم کرنے کے لئے اور اُن کی اذیتوں، نقصانات اور محبت میں مفارقت کے صدموں کی تلافی کیلئے یا ایسے ہی دیگر آلام اور صدموں کو رفع کرنے کیلئے جو فطرت کی اِس ٹوٹی ناؤ کو سفرِ زندگی میں لاحق ہوتے ہیں میں اُن پر کسی قدر مہربانی کرنی چاہتا ہوں۔ اور میں انہیں ایسی ترکیب بتاتا ہوں کہ الکی بیادیس کا قہر و غضب رُک جائے۔

پہلا رُکن:۔ یہ بات تو کسی قدر ٹھکانے کی کہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ ایتھنز ہمارے ساتھ چلے چلیں گے۔

تائمن:۔ میرے اِس غار کے پاس ایک بڑا درخت ہے جسے اپنے

کام میں لانے کو میں کاٹنا چاہتا ہوں اور میں بہت جلد اُسے کاٹنے والا ہوں۔ بس میرے دوستوں ہی سے نہیں بلکہ تمام اہلِ شہر سے کہنا بالخصوص اُن سے جو آنے والی مصیبتوں سے اپنی جان بچانی چاہتے ہیں کہ وہ سب پیشتر اس سے کہ میں اس درخت کو کاٹ کر گراؤں یہاں آئیں اور اپنے اپنے گلے میں پھندے ڈال کر اس پر لٹک رہیں۔ بس التماس ہے کہ یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اسے میری طرف سے پیغام سمجھ کر میرے عزیز ہموطنوں سے کہدیں اور میرا اُن سے بہت بہت سلام بھی عرض کر دیں۔

فلے ولیوس:۔ انہیں زیادہ تکلیف نہ دیجئے۔ انکا حال تو اب ہمیشہ یہی رہتا معلوم ہوتا ہے۔

تائمن:۔ اب آپ کوئی صاحب میرے پاس نہ آئیں لیکن ایتھنز کے شہر سے کہدیں کہ تائمن نامُراد نے اپنا ابدی مسکن سمندر کے کنارے تیار کر لیا ہے جسے دن بھر میں کم سے کم ایک مرتبہ سمندر کی موجیں اپنے اُجلے اُجلے کفوں سے ڈھک دیا کریں گی پس وہ میری قبر پر آیا کریں اور میری قبر اور اُس کا کتبہ اُن کے لئے وہ مقامِ عبرت ہوگا جہاں غیب سے لوگ اپنے سوالوں کا جواب سُنا کرتے ہیں۔ اے جنبشِ لب بند ہو جا۔ اے زِشت کلامی دُور ہو۔ جو کچھ خطا ہوئی ہے اس کی اصلاح انسان پر بلائیں نازل ہو کر کر دیں گی۔ قبر کھودنی انسان کی مشقت ہے اور اِس مشقت کی مُزد موت ہے۔ آفتاب اپنی شُعاعیں چُھپالے۔ تائمن کا دورِ حکومت ختم ہوا۔

(غار میں چلا جاتا ہے)

پہلا رُکن:۔ اب اُس کی خفگی اور ناراضگی اُس کی طبیعت سے زائل نہ ہوگی۔

دوسرا رُکن:۔ ہماری جو کچھ اُمید اُس کے ساتھ وابستہ تھی وہ ٹوٹ گئی۔ اب ہمیں واپس ہونا چاہیئے۔ اور لڑائی کی مصیبت سے بچنے کے لئے کوئی دوسری صورت نکال کر کوشش کرنی چاہیئے۔ اِس لڑائی کی بلا سے نجات کیلئے اسکے سوا کوئی اور بات پیدا کرنی ضروری ہے۔

پہلا رُکن:۔ اس میں عجلت کی سخت ضرورت ہے۔

دوسرا منظر:۔ ایتھنز کی شہر پناہ کے سامنے مجلسِ سیاسی کے ارکان نظر آتے ہیں۔ ایک قاصد بھی آتا ہے۔

پہلا رُکن:۔ تم نے رنج اور افسوس کے ساتھ یہ بھی معلوم کیا کہ کیا دُشمن کی فوج واقعی اتنی ہے جتنی کہ بتائی جاتی ہے۔

قاصد:۔ میں نے تو یہ تعداد کم کر کے بتائی تھی۔ علاوہ اسکے دُشمن کا لشکر بہت قریب آتا جاتا ہے۔

دوسرا رُکن:۔ اگر تائمن اِس وقت نہ آیا تو پھر ہمارا حال بالکل ردّی ہو جائے گا۔ رستے میں ایک ہرکارہ مجھے ملا تھا۔ یہ میرا پُرانا ملنے والا تھا۔ گو مجھ میں اور اُس میں اسوقت مخالفت تھی مگر چونکہ دوستی پُرانی تھی اس لئے ہم دونوں دوستوں کی طرح آپس میں باتیں کرنے لگے۔ یہ شخص الکی بیادیس کے لشکر سے گھوڑے پر سوار تائمن کے غار کو جاتا تھا۔ اُس کے پاس چند خطوط تھے جن میں الکی بیادیس نے ایتھنز کو غارت کرنے کے قصد میں تائمن سے اتفاق رائے کیا تھا اور لکھا تھا کہ اِس یورش میں ہمیں آپکا خیال بھی ملحوظ ہے۔

(چلا جاتا ہے۔)

تیسرا منظر:۔ جنگل۔ ایک بے ڈھنگی سی قبر نظر آتی ہے۔ اور ایک سپاہی تائمن کو ڈھونڈتا ہوا آتا ہے۔

سپاہی:۔ پتا جو کچھ دیا گیا تھا اُس سے تو جگہ یہی معلوم ہوتی ہے۔ (غار کے قریب آکر آواز لگاتا ہے) اجی اندر کوئی ہو تو جواب دے۔ (کوئی جواب نہیں ملتا۔) ارے یہ کیا ہے۔ کیا تائمن مرگیا۔ ضرور۔ اور یہ اُس کی قبر ہے۔ قبر کے پتھر پر جو کچھ لکھا ہے افسوس میں اُسے پڑھ نہیں سکتا۔ اس کتبے کا چربا لئے لیتا ہوں۔ ہمارا

افسر لکھنا پڑھنا خوب جانتا ہے۔ اگرچہ جوان آدمی ہے مگر بڈھوں کی طرح پڑھنے میں مشّاق ہے، اور اِس وقت وہ شہر کا حصار کئے شہر پناہ کے سامنے پڑا ہے۔ اور شہر پر قبضہ کرنا اُس کی سب سے بڑی آرزو ہے۔

چوتھا منظر:۔ ایتھنز کی شہر پناہ کے سامنے۔
بوق و نفیر بجتے ہیں۔ الکی بیادیس مع فوج کے آتا دکھائی دیتا ہے۔

الکی بیادیس:۔ نقارچیو۔ نقارے طبل و دُہل کی خوفناک آوازوں سے اِس بزدل شہر کو خبر دو۔

(نفیر بوق و دُہل بجائے جاتے ہیں۔ ارکانِ مجلس بیاکی دیوارِ شہر پر نظر آتے ہیں۔)

ابتک تم نے اپنی حرص و آز سے زمانے کو بدرنگ کر رکھا تھا اور جو کچھ اپنی خوشی اور مرضی ہوتی تھی اُسی کو عدل و انصاف سمجھتے تھے۔ اُس وقت میں خود اور وہ لوگ جو تمہارے اختیار میں تمہارے تابع تھے بغلوں میں ہاتھ دئے پھرتے تھے۔ ہم اپنی شکایتیں بالکل بے سُود اپنی زبان پر لاتے تھے۔ اب وقت آیا ہے کہ ہر مضبوط اور توانا آدمی کا دماغ اُسے اِس بات کے کہنے پر مجبور کرے کہ "بس اب زیادہ برداشت نہیں"؛ اب تم اپنی آسائش و آرام کی کُرسیوں پر ہانپتے اور کانپتے بیٹھو گے۔ خوف اور فراری کا دن تمہارے جور و مظالم کی وجہ سے عنقریب آنے والا ہے۔

پہلا رُکن:۔ شریف اور جوان الکی بیادیس۔ جس زمانے میں آپ کو ہم سے سب سے پہلی شکایت پیدا ہوئی وہ شکایت محض آپکے غرور و پندار کی وجہ سے تھی۔ لیکن پیشتر اس سے کہ آپ صاحب قوّت بنیں اور آپ کا خوف ہمارے دلوں میں جاگزیں ہو ہمنے آپ کو یہاں تکلیف دینی چاہی تاکہ آپکے قہر و عتاب میں کمی ہو اور ہم اپنی محبت و خلوص سے اپنی ناشکر گزاری کا اعتراف کر کے اسکی تلافی کریں۔ اور ہماری محبت و خلوص آپکی شکایتوں کو رفع کرنے کیلئے کافی سے زیادہ ہو۔

دوسرا رُکن:۔ اور اس طرح ہم نے تائمن کو بھی یہاں آنے کی تکلیف دینی چاہی۔ بجد عجز و انکسار سے لسے پیغام بھیجا، چاہا کہ کسی طرح تائمن کو جس نے اپنی حالت بالکل بدل دی ہے وطن کی محبت رام کرے۔ ہم سب نے اُس کے ساتھ بدسلوکی یا بے اعتنائی نہیں کی کہ کُل شہر پر اس لڑائی کا غضب نازل ہو۔

پہلا رُکن:۔ ہمارے شہر کی دیواریں انہوں نے نہیں بنائی تھیں جنہوں نے تائمن کے دل کو آزردہ کیا اور نہ یہ شہر اس امر کا سزاوار ہے کہ چند لوگوں کی غلطی سے اسکی عالیشان عمارتیں، اسکی عظیم الشان یادگاریں اور اسکے اداراتِ فلسفہ و حکمت قطعی مسمار کر دیئے جائیں۔

تیسرا رُکن:۔ اور نہ وہ لوگ اب زندہ ہیں جو تائمن کے شہر سے نکل جانے کا باعث ہوئے تھے۔ اور اِس شرمندگی نے کہ انہوں نے حفظِ جان و مال میں ضرورت سے زیادہ کوشش کی اُن کے دل توڑ دیئے۔ اے بہادر سالارِ فوج تو اپنا پرچم اُڑاتا ہوا اپنے شہر میں داخل ہو۔ اگر تیرے انتقام کی اشتہا سوائے اِس طریقے کے جو فطرت کی نظر میں کریہہ ہے پوری نہ ہوتی ہو تو تُو اہلِ شہر سے دس دس آدمیوں میں سے ایک ایک قتل کر۔ مگر جو حقیقت میں تقصیر وار ہیں اُن کے سوا دوسروں کی جان نہ لے۔

پہلا رُکن:۔ سب نے قصور نہیں کیا۔ یہ شرطِ انصاف نہیں ہے کہ بے گناہوں کی جان بھی انتقام کی پیروی میں تقصیر والوں کی جان کی طرح لی جائے۔ خود کردہ جرائم ایک سے دوسرے کو ورثہ میں زمین یا جائداد کی طرح نہیں پہونچتے۔ بس اے عزیز ہموطن اپنی فوجیں اندر لا اور بغیر اپنا قہر و غضب توڑے شہر سے رُخصت ہو جا۔ ایتھنز کو جو تیرا مہد ہے غارت نہ کر۔ اور اپنے

ان عزیزوں کو قتل نہ کر جو تقصیر داروں کے ساتھ تیرے قہر کا نشانہ بنے ہیں۔ ایک گلہ بان کی طرح بھیڑوں کے قریب آ، اور جو بیمار ہوں انہیں گلے سے علیحدہ کر دے۔ لیکن سب کو جان سے نہ مار۔

دوسرا رکن:۔ جو کچھ کرنا ہے چہرے پر تبسم رکھکر کر۔ یہ نہ ہو کہ جو ملے اُسی کی گردن اُڑا دے۔

پہلا رکن:۔ قدم بڑھا اور ہمارے شہر کے سنگین دروازے خود بخود تیرے لئے کھل جائینگے۔ مگر اپنے شریف دل کو یہ کہکر شہر میں بھیج کہ وہ دوست اور مہربان بنکر آیا ہے۔

دوسرا رکن:۔ دستانہ یا کوئی اور نشان قول پورا کرنے کے لئے ہماری طرف پھینکئے جس سے معلوم ہو کہ آپ کی یہ یورش محض آپکے نقصان کی تلافی کی غرض سے ہے۔ ہمیں قطعاً غارت کرنا آپ کا مقصود نہیں۔ آپ کی کل فوج اُس دن تک ہماری مہمان رہیگی جب تک کہ ہم جو کچھ ہم نے سوچا ہے اُس کا وعدہ و اقرار آپ سے نہ کریں۔

الکی بیادیس:۔ اچھا میں اپنے قول و اقرار کیلئے اپنا دستانہ آپ کی طرف پھینکتا ہوں۔ بس اب آپ شہر پناہ کی دیوار سے نیچے اُتریں اور اپنا قول پورا کریں اور شہر کے دروازے جن پر ابھی تک حملہ نہیں ہوا ہے آپ خود کھول دیں اور صرف تائمن کے دشمنوں اور میرے بدخواہوں کو آپ اپنے ہی قانون کے مطابق ماخوذ کر کے سزا دیں۔

دونوں رکن:۔ یہ بات نہایت شرافت کی کہی۔

الکی بیادیس:۔ اب دیوار سے اُتریئے اور اپنا قول پورا کیجئے۔ (ارکانِ مجلس فصیل سے اتر کر شہر کے دروازے کھول دیتے ہیں۔)

(ایک قاصد آتا ہے۔)

قاصد:۔ اے میرے شریف سالار، تائمن مرگیا۔ قبر اُس کی بالکل سمندر کے کنارے ہے اور اُس قبر کے پتھر پر ایک عبارت کندہ ہے جس کا چربہ میں اُتار لایا ہوں۔ اور اسی چربہ سے میرا اَن پڑھ ہونا بھی ثابت ہو رہا ہے۔

الکی بیادیس:۔ (چربہ کی عبارت پڑھتا ہے)۔

"یہاں ایک فلک زدہ لاش اپنی مصیبت
زدہ روح کا داغ اُٹھائے مٹی میں دبی پڑی
ہے۔ یعنی میں تائمن جو زندگی میں ہر زندہ انسان
سے نفرت کرتا تھا خاک میں خاک ہوا پڑا ہوں۔
بس یہاں سے گزر جاؤ اور جس قدر ہو سکے
اُس پر لعنت کرو۔ مگر ٹھہرو نہیں، دیکھتے ہو
چلے جاؤ۔"

اِس کتبے سے تائمن کے آخری زمانے کی دلی کیفیت خوب ظاہر ہوتی ہے۔ تائمن گو تو ہمارے افکار و آلام بشری سے نفرت رکھتا تھا اور ہماری عقل و ادراک کی کوششوں اور ہمارے قطرات اشک پر جو ہماری تمسک اور بخیل فطرت ہماری آنکھوں سے جاری کراتی تھی انہیں بھی حقیر و ذلیل سمجھتا تھا۔ مگر تجھ میں خودداری اتنی تھی کہ اب اِس بحر ذخار کا خدا بھی تجھ پر اور تیری اس قبر پر تیرے قصوروں کو جو معاف کر دیئے گئے ہیں یاد کر کے زار و قطار روتا ہے۔ شریف اور فیاض تائمن گو دنیا سے چل بسا مگر اُسے ہمیشہ آئندہ یاد کیا جائے گا۔

بزرگانِ ایتھنز اب آپ مجھے شہر میں لے چلئے۔ تلوار کے ساتھ امن و سلامتی بھی میرے ہم رکاب ہونگے تاکہ لڑائی سے دلوں میں نفرت پیدا ہو، اور امن مثل ایک طبیب کے لڑائی کے حق میں خدمت گزار رہے۔

(سب چلے جاتے ہیں۔)

(ختم شد)

چڑیا کی کہانی

اکثر ہندوستانی گھروں میں بچوں کو چڑے چڑیا کی کہانی سنائی جاتی ہے۔ کہ ایک تھی چڑیا اور ایک تھا چڑا، چڑیا لائی دال کا دانہ، چڑا لایا چاول کا دانہ۔ دونوں نے ملکر پکائی کھچڑی۔

مگر میں فرضی کہانی نہیں لکھتا۔ اگرچہ جانتا ہوں کہ بچوں کے سامنے یا ان لوگوں کے سامنے جو بچوں کا سا مزاج رکھتے ہیں ایسی ہی فرضی کہانیاں کہنی پڑتی ہیں۔ مگر جب آدمی بڈھا ہوجاتا ہے اور مرنے کے دن قریب سمجھتا ہے تو جھوٹ بولنے سے ڈرتا ہے۔ اور قصہ کہانی میں بغیر جھوٹ بولے مزا نہیں آتا۔ اس واسطے میں اپنے گھر کی ایک سچی کہانی سنانی چاہتا ہوں جس میں کسی قسم کا مبالغہ اور بناوٹ اور جھوٹ نہیں ہے۔ جو کچھ دیکھا اور جو کچھ اپنی زبان کو کہتے سنا اور جس طرح اپنے بیوی بچوں کو بولتے ہوئے سنا اسی طرح اس کہانی کو لکھدیا۔

جس گھر میں رہتا ہوں اس کے شرقی گوشہ میں ریڈیو مشین میز پر رکھی ہے۔ اور چھت کے کونے میں برقی فٹنگ کی لکڑی لگی ہوئی ہے جسکی چوڑان حد سے حد ایک انچ کی ہے۔ ایک دن دوپہر کے وقت گاؤ تکیہ سے لگا بیٹھا تھا اور ریڈیو سن رہا تھا۔ یکایک ریڈیو مشین پر کچھ تنکے کچھ تاگے گچھا بنے ہوئے گرے۔ میں نے نگاہیں اٹھاکر چھت کی طرف دیکھا۔ تو ایک چڑا اور ایک چڑیا بجلی کی لکڑی پر بیٹھے ہوئے چیخ رہے تھے اور ان کا گھونسلا کچھ نیچے گرا ہوا تھا اور کچھ لکڑی میں الجھا ہوا لٹک رہا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ یہ دونوں اس واسطے چیخ رہے ہیں کہ مشین بج رہی ہے۔ ایسی حالت میں یہ دونوں اپنا گرا ہوا گھونسلا اٹھانے نہیں آئیں گے۔ اور ڈرینگے کہ مشین کے اندر کوئی بیٹھا ہوا بول رہا ہے۔ اس واسطے میں نے ایک بچہ سے کہا ریڈیو بند کردو۔ خواجہ بانو نے پوچھا کیوں؟ میں نے کہا اس واسطے کہ آج ہم عمرو بن عاصؓ بننا چاہتے ہیں۔ وہ ہنسکر کہنے لگیں میں نہیں سمجھی اس کا کیا مطلب ہے۔ میں نے کہا جب حضرت عمرو بن عاصؓ مصر فتح کرنے گئے تو کسی جانور نے ان کے خیمہ میں گھونسلہ بنالیا اور انہوں نے اس جانور کی خاطر اپنا خیمہ وہیں چھوڑ دیا تاکہ جانور اور گھونسلہ کو اذیت نہ ہو، اور بغیر خیمہ کے آگے بڑھ گئے۔ ایسے ہی آج ابھی ریڈیو مشین پر چڑیا کا گھونسلہ گر پڑا ہے۔ ریڈیو بند کردوگی تو چڑیا ان تاگوں اور تنکوں کو پھر اٹھاکر لے جائیگی اور گھونسلہ بنائیگی۔ خواجہ بانو نے کہا وہاں گھونسلہ بنانے کی جگہ کہاں ہے؟ تین دن سے اس چڑے اور چڑیا نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ سارے گھر کے تاگے اٹھا اٹھاکر لے جاتی ہے اور گھونسلہ میں رکھتی ہے اور جگہ نہ ہونے کی وجہ سے گھونسلہ گر پڑتا ہے۔ میں نے کہا اللہ میاں جب جانور کو گھونسلہ بنانے کی سمجھ دیتے ہیں تو یہ سمجھ بھی دیدیتے ہیں کہ گھونسلہ کہاں بنانا چاہیئے۔ چڑیا نے ضرور لکڑی کے اوپر گھونسلہ بنانے کی جگہ دیکھ لی ہوگی۔ حسین نے کہا، مگر یہ بھی معلوم کرلیا ہے کہ اس چڑیا نے نئی دہلی میونسپل کمیٹی سے مکان بنانے کا نقشہ منظور کرالیا ہے یا نہیں اور امپرومنٹ ٹرسٹ (محکمہ آرائش دہلی) نے اس کو ایسی جگہ مکان بنانے کی اجازت بھی دیدی ہے یا نہیں؛ میں نے کہا، تمہارے سوالوں کا جواب تو اسی ایک بات میں موجود ہے کہ چڑیا نے ریڈیو مشین کے اوپر گھونسلہ بنانے کا ارادہ کیا ہے۔ کیونکہ ریڈیو مشین میں رات دن ساری دنیا کے حالات اور میونسپل کمیٹیوں اور

آرائش کے محکموں کے حکم احکام اور حالات نشر ہوتے رہتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ چڑیا یورپ کی تہذیب اور یورپ کے قوانین گھرداری کو جانتی ہے؛ حسین نے کہا قانون قیاس کو نہیں مانتا۔ چڑیا کو نقشہ دکھانا ضروری ہے کہ وہ منظور ہوا یا نہیں ہوا۔ اور بلڈنگ کمیٹی نے اس پر کیا کیا اعتراضات کئے تھے۔ اور رائے بہادر ٹھاکر داس صاحب سکریٹری میونسپل کمیٹی نئی دہلی اور سردار بہادر سردار سوبھا سنگھ صاحب صدر میونسپل کمیٹی اور خان بہادر راجہ اکبر علی خاں صاحب و مسٹر بدرالاسلام بیرسٹر ممبران میونسپل کمیٹی اور مسٹر ہوم پریذیڈنٹ امپرومنٹ ٹرسٹ اور خان بہادر محمد سلیمان صاحب سپرنٹنڈنگ انجنیر و قائم مقام صدر امپرومنٹ ٹرسٹ نئی دہلی کی تحریری اجازتیں چڑیا اور اس کے بے تاج شوہر چڑے کے پاس آ گئی تھیں یا نہیں اور اگر آ گئی تھیں تو ان میں کیا لکھا تھا۔ اور کیا میجر کرامٹن ہیلتھ آفیسر نئی دہلی نے بموجب قواعد صحت عامہ چڑیا ہاؤس کی تعمیر کی نسبت کوئی خاص ریمارک تو نہیں کیا تھا۔ ۔ ۔ ؟

حسین کی یہ تقریر سُنکر میں نے اپنے دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے زمین پر ٹیک دئے اور سر کو پیچھے جھکا کر چڑیا کے گھونسلے کو غور سے دیکھا۔ اور حسین سے کہا جس قسم کی تعمیر کا نقشہ اجازت خاص کے ساتھ پنڈت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی اور مسٹر سوبھاش چندر بوس اور مسٹر محمد علی جناح کو ہم نے بحیثیت رکن وزارت یا پارلیمنٹ انگلستان دیا تھا اس کے اعتبار سے یہ گھونسلہ خلاف قانون نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اگر اس چڑیا نے گھونسلہ بنانے کی جگہ انتخاب کرنے میں غلطی کی ہے تو درحقیقت مذکورہ لیڈروں کی تقلید ہے۔ جنہوں نے آزادی کا گھونسلہ بنانے سے پہلے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ گھونسلے کے ٹکنے اور ٹھہرنے کی جگہ بھی ہے یا نہیں ؟ ــ

یہ بات سُنکر حسین کو ہنسی آ گئی۔ اور اُنہوں نے مجھ سے کہا یہ تمثیل تو کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ تب میں نے چڑے کو غور سے دیکھا جو ایک آنکھ سے دالان میں بیٹھے ہوئے سب انسانوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور چڑیا اپنے پنجوں پر زور دئے ہوئے سر جھکائے نیچے اُترنے کے لئے تیار معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ ریڈیو بند ہو گیا تھا اور چڑیا اپنے گھونسلہ کے تنکوں اور تاگوں کو پھر اوپر لے جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ میں نے یہ دیکھا تو چڑیا سے مخاطب ہو کر کہا؛ شاید تو نے کسی اسکول میں تعلیم نہیں پائی اور تعلیم پائی تو مڈل پاس نہیں کیا۔ اور مڈل پاس کیا تو انٹرنس پاس نہیں کیا اور انٹرنس پاس کیا تو ایف۔ اے پاس نہیں کیا۔ اور ایف۔ اے پاس کیا تو بی۔ اے پاس نہیں کیا اور بی۔ اے پاس کیا تو ایم۔ اے پاس نہیں کیا۔ اور بالفرض تو نے ایم۔ اے پاس کیا ہے تب بھی غالباً بی۔ ایس سی اور ایم۔ ایس سی پاس نہیں کیا اور یا خان بہادر شیخ عبداللہ صاحب کے زنانہ کالج میں تعلیم نہ پائی ہوگی ورنہ تیرے اندر ضرور سمجھ پیدا ہو جاتی اور تو ایسی جگہ گھونسلہ نہ بناتی جہاں تنکے اور تاگے بھی نہیں ٹھیر سکتے کیونکہ تم دونوں میاں بیوی تین دن سے گھونسلہ بنانے کی کوشش کر رہے ہو مگر گھونسلہ ٹکتا نہیں گر گر پڑتا ہے؛

خواجہ بانو نے کہا اس جگہ چڑیا کا گھونسلہ بنانا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اگر یہ گھونسلہ بن گیا اور چڑیا کے بچے ہو گئے تو ان بچوں کی جوئیں سارے گھر میں پھیل جائیں گی۔ میں نے کہا کیا اب لاکھوں کروڑوں قسم کے نظر آنے والے اور نظر نہ آنے والے کیڑے اور زہریلے جانور موجود نہیں ہیں۔ یہ مچھر دانیاں کیوں لگاتی ہو۔ مچھروں سے بچنے کے لئے اور زہریلے کیڑوں سے بچنے کے لئے پھر چڑیا کے بچوں کی جوؤں سے ڈرنا فضول ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دُنیا کی سب بڑی بڑی طاقتیں چاہے وہ جرمنی ہو یا اٹلی ہو

یا ٹرکی ہو یا فرانس ہو یا جاپان ہو یا برطانیہ سب ہی اِن پوشیدہ اور ظاہر زہریلے کیڑوں کے سامنے بے بس ہیں۔ یہاں نہ ان کے ہوائی جہاز کام آتے ہیں نہ بم مشین گنیں اور نہ سیاسی چال بازیاں۔ تو جب اتنی بڑی بڑی طاقتیں ان کا تدارک نہیں کر سکتیں تو ہم کیا کر سکینگے جس گھر میں چڑیا کا گھونسلہ ہوتا ہے وہاں بہت برکت ہوتی ہے۔ اوّل نمبر کبوتر ہے اور دوئم نمبر چڑیا ہے اور سوئم نمبر فاختہ ہے۔ حسین نے کہا یہ تینوں جانور اپنی اپنی شان میں نرالے ہیں۔ کبوتر اوّل درجے کا بیوقوف ہوتا ہے اور فاختہ بعض راویوں کے نزدیک کبوتر سے زیادہ احمق ہے اور بعض کے نزدیک چند پوائنٹ کم۔ البتہ چڑیا اور چڑا اُن دونوں کی بہ نسبت تھوڑی بہت عقل رکھتے ہیں۔

یہ سُنتے ہی میں بولا گویا تم اقبال کر رہے ہو کہ چڑیا اور چڑا عقل رکھتے ہیں۔ میں بھی اس کی تائید کرتا ہوں۔ اگر اُن میں کسی قسم کی بے عقلی ہے تو صرف اتنی ہی کہ جتنی بے عقلی مہاتما گاندھی جی اور پنڈت نہرو اور مسٹر سبھاش چندر بوس اور مسٹر جناح میں ہے۔ اگر اس چڑیا نے نئی دھلی میونسپل کمیٹی سے نقشہ منظور کرائے بغیر گھونسلہ بنالیا ہے یا امپرومنٹ ٹرسٹ کی اجازت کے بغیر اور میجر کراسٹین ہیلتھ آفیسر کے اُصول صحت کے خلاف اِس گھونسلہ کی تعمیر کی ہے تو اُس کے فعل کو ایک فردِ واحد یا ایک جوڑے کا فعل نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہندوستان کی ساتوں وزارتوں کے سب کانگریسی جوڑے اور ہر مقام کی مسلم لیگ کے مسلم لیگی جوڑے اسی قسم کی بے ضابطگیاں کرتے رہتے ہیں۔

ہم سب کو باتوں میں مصروف دیکھکر چڑیا ریڈیو مشین پر آئی اور تنکوں اور تاگوں کو نیچے سے اُٹھا کر اُوپر لے گئی اور کچھ دیر کے بعد چڑا نیچے آیا اور وہ بھی تاگے اور تنکے اُٹھا کر اپنے گھونسلے میں لے گیا۔ حسین نے کہا دیکھئے چڑے چڑیا کی سول نافرمانی دیکھئے۔ کیا میں نئی دھلی میونسپل کمیٹی کو ٹیلیفون کروں۔ میں نے کہا ہاں تم ٹیلیفون کرو، جب تک تمہارے ٹیلیفون پر توجہ ہوا اور یہ رپورٹ سب دفتروں میں گشت لگائے اُس وقت تک اس گھونسلہ میں دو دفعہ بچے نکلکر اُڑ چکے ہونگے۔ جب میونسپل کمیٹی سے چڑیا اور چڑے کے نام نوٹس آئے گا کہ نقشہ منظور کرائے بغیر تم نے گھونسلہ بنایا ہے لہذا آٹھ دن کے اندر اس گھونسلہ کو توڑ ڈالو، ورنہ کمیٹی اس گھونسلہ کو گرا دے گی تو اس وقت یہ چڑا اور اُسکی لیڈی اپنے بچوں کے ساتھ خبر نہیں کہاں اور کس جگہ گھونسلہ بناتے بیٹھے ہوں گے۔ کمیٹی والے آئیں گے اور چڑیا کے گھونسلہ کو یہاں نہ دیکھکر رپورٹ کر دینگے کہ ہم نے موقع کا معائنہ کیا۔ آبادی کے ڈوبنے بھی ہمارے ساتھ تھے مگر چڑیا اور چڑے اور اُس کے گھونسلے کا وہاں نشان بھی نہ تھا۔ اس لئے ادب کے ساتھ درخواست ہے کہ کاغذات داخل دفتر کئے جائیں۔

یہ سچی کہانی سچے آدمیوں کی زبانی لکھی گئی اور رسالہ ساقی دہلی کے افسانہ نمبر کو بھیجی گئی۔ اگر اس کو یہ کہانی سچی ہونے کے سبب افسانہ معلوم نہ ہو تو وہ کسی چڑیا کے گھونسلہ کے سامنے ان کاغذوں کو چاک کر کے ڈالدے۔ تاکہ چڑیا اور اسکا چڑا ان کاغذوں کو اپنے گھونسلہ میں بچھا کر یہ گرمی کی راتیں آرام سے بسر کر سکیں۔

حسن نظامی

"خودی خدائے خودی کے حضور میں"

(۱)
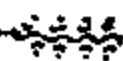
جبرئیل

خودی حضور میں حاضر ہے اے خدائے خودی
بصد نیاز سرِ عجز کو جھکائے ہوئے

ضروریات ہے کوئی کہ ہے سر افگندہ
خودی کو آج ہی دیکھا ہے مُنہ بنائے ہوئے

ہمارے سجدوں ہی سے پھر گیا تھا سر اس کا
جبھی سے دہر میں تھی آگ سی لگائے ہوئے

نہیں تمیز اسے گو سلام کی یارب!
خودی کو بخش اجازت کلام کی یارب!

(۲)

خدائے خودی

خودی سے چھیڑ یہ اچھی نہیں ہے ای جبرئیل
خودی حضورِ خدا میں خودی نہیں رہتی

خودی کا مدِ مقابل ہے ماسوائے خودی
خودی ہر ایک کے آگے جھکی نہیں رہتی

ہے لُطف اسی میں کہ سائل زباں سی ہو گویا
اگرچہ مجھ سے کوئی شے چھپی نہیں رہتی

خودی کو اِذن ہے سو بار لب کشائی کا
کہ آج اس کو ہے احساس نارسائی کا

(۳)

خودی

قدیم و قائم و قیوم و قادرِ مطلق ! تری جناب میں حاضر ہے مخزن و نازترا
وہی فرشتوں کی مسجود خود ہے سربسجود جسے دیا تھا سروپا رعلّمَ الاسما[1]
نہیں ہے اہل ہی جب جبرئیل کیا جانے ؟ مرے خیال کی کاوش۔ دماغ کا سودا

خودی کی اصل اگر نیرِ انور ہے یارب !
خودی بُری ہو تو کس کا قصور ہے یارب ؟

(۴)

خدائے خودی

خودی وہ جذبۂ بے اختیارِ ذاتی ہے ازل سے جس سے حفاظت ہے ذات کی مقصود
غرور کہتے ہیں جس کو خودی کا ہے ہمزاد مگر وہ لغو سراپا یہ سربسر محمود
اخوت اور سلامت روی خودی کا شعار مثالِ مہرِ جہانتاب اس کا ذوقِ نمود

خودی نے جس کو نوازا وہ باکمال ہوا
خودی سے قوموں کا اقبال پرجلال ہوا

امینِ حزیں (سیالکوٹی)

[1] تلمیح بہ آیۂ شریفہ "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا"

درسِ نیاز

دل تڑپتا ہے مرے دوست تری فُرقت میں
اور شب و روز اضافہ ہے مری وحشت میں

لُوٹ لے! لُوٹ لے! ہے دولتِ عشرت حاضر
پھُونکدے! پھُونکدے! سامانِ سکونِ خاطر

چھین لے! مجھ سے، مرے خواب کی سب شیرینی
لُوٹ لے میری تمناؤں کی سب رنگینی

لُوٹ لے! لُوٹ لے! آنکھوں کی یہ چھائی ہوئی نیند
چھین لے! چھین لے! برسوں کی ستائی ہوئی نیند

کردے پامال، مرے گلشنِ اُمید کے پھُول
پھُونکدے برق صفت خرمنِ اُمید کے پھُول

لُوٹ لے دیدۂ پُرآب کے سارے موتی
چھین لے شوق سے خود ہم سے ہمارے موتی

اُٹھتی ہے بحرِ تمنا میں جو موجِ سیمیں
دل کے داغوں میں تڑپتی ہے جو برقِ رنگیں

دامنِ دل میں جو دریائے تحمل ہے رواں
سینۂ صبر میں مستور ہے جو سوزِ نہاں

جس قدر جذبِ کشش، جلوۂ ایثار میں ہے
جس قدر باڑھ، غمِ عشق کی تلوار میں ہے

جس قدر عشق میں ہے جوش، محبت میں خُمار
تیرے قدموں پہ تصدق، تری اُلفت پہ نثار

کردے برباد مچلتے ہوئے ارمانوں کو
قیدِ زنجیر میں رکھ شوق سے دیوانوں کو

توڑ دے باغِ تمنا کا طلسمِ رنگیں،
پھینکدے بادۂ گلگوں کا ایاغِ زریں

کردے آنکھوں سے رواں، شوق سے چھینٹے گلگوں
کہ ہے تمثیلِ قیامت، مرا قلبِ محزوں

چھین لے، شوق سے مجھ سے تو مرا نقدِ وجود
ختم کردے، ترے قربان، مرا شغلِ سجود

کردے برباد، مری زیست کے ہر پہلو کو
لُوٹ لے عشق کے سرمایۂ رنگ و بو کو

جانِ جاں! شوق سے مجھ سے مری دُنیا لے لے
میں ہوں قرباں ترے، رُوح ہے صدقے تیرے

سچ تو یہ ہے کہ مری جان کے پڑے ہیں لالے
تیرا دیوانہ ہوں میں، تُو ہی مجھے اپنا لے

قیدِ اُلفت سے چھُڑا کر، مجھے آزاد نہ کر
دیکھ! ہاں! اس طرح مٹّی مری برباد نہ کر

میرے مالک! مرے رہبر! مرے آقا! مری سُن
میرے خالق! مرے مُرشد! مرے مولا! مری سُن

کردے مفقود مجھے عشق کے صحرا میں کہیں
غرق کردے تو مجھے حُسن کے دریا میں کہیں

ذرہ صحرا میں پہونچ جائے تو صحرا ہو جائے
قطرہ دریا میں جو مِل جائے تو دریا ہو جائے

میں ہی رہ جاؤں نہ باقی رہے ہستی میری
نہ رہے جام، نہ مینا، نہ یہ ہستی میری

تجھ میں ایسا میں سما جاؤں کہ 'تو' ہو کے رہوں
رنگ اُڑ جائے کچھ اس طرح کہ بو ہو کے رہوں

فرحت کانپوری

میں اور میرا ضمیر

پچھلے آٹھ برس کچھ ایسی مصروفیت میں گذرے کہ میرے ضمیر سے میری ملاقات ہی نہ ہوسکی۔ اس سے باتیں کرنے کا ایک موقع بھی نہ ملا۔ حالانکہ ایک وقت تھا کہ ہمارا چوبیس گھنٹے کا ساتھ تھا، آٹھوں پہر صحبت رہتی تھی۔ اور ہر وقت تبادلۂ خیال ہوا کرتا تھا۔

اصل میں ہوا یہ کہ نوجوانی کے کاروبار میں میرا منہمک ہوجانا بہت ہی اچانک ہوا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ بڑھی ہوئی مصروفیت میں آدمی نادانستہ طور پر بھی کچھ بے خیال ہو ہی جاتا ہے۔ اور بے خیالی تو ویسے بھی ہم ہندوستانیوں کا قومی خاصّہ ہے۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ میرے مقابلہ میں میرا ضمیر انتہا کا مہذب اور خیال رکھنے والا ثابت ہوا۔ اس نے شاید میرے انہماک کا اندازہ کر کے مصلحت اسی میں دیکھی کہ چندے گوشہ نشین ہوجائیے۔ یا پھر یہ ہوا کہ اس کے نازک احساس کو میری بے خیالی سے رنج پہونچا۔ پھر جب جانبین کے مزاجوں کی حالت یہ ہو تو آپ جانتے ہیں کہ میاں بیوی میں بھی جدائی ہوجاتی ہے۔ خیر۔

ان دنوں میرے شباب کے مشغلوں میں کچھ سرد بازاری تھی، کیونکہ میں نہ معلوم کس وجہ سے حسن بازار اور شباب ہر خریدار سے اُکتا سا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نت نئی دلچسپی کی تلاش اپنی جگہ ایک یکسانیت ہے۔ ایسی زندگی میں بھی عدم تنوع کا تجربہ ہوتا ہے۔ انسانی فطرت کو کسی پہلو قرار نہیں۔ میں نے اپنی جوانی شروع کی تو "استواری برہمن،" میرا مسلک رہا۔ لیکن اس میں مجھے یہ خرابی نظر آئی کہ جن باتوں کو جانتے بوجھتے قدم اُٹھایا تھا۔ وہی باتیں میری اندر رشک ورقابت کے جذبات اُبھارنے کا حیلہ بن گئیں، قصے قضیوں کا سبب ہوگئیں۔ اور میں نے سمجھا کہ کلی کلی رس لینے میں رشک ورقابت کے رکیک جذبات کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ مگر تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ میرا یہ خیال بھی غلط تھا تتلی کا رقص اور بوسہ، بوسہ اور رقص بھی اپنی جگہ غیر متنوع ہے۔

انسانی زندگی کو مجموعہ حوادث کہا گیا ہے۔ مجھے اس نظریہ سے حجت نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ زندگی حادثات ہی کا مجموعہ ہو۔ مگر میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ اگر زندگی کچھ ہے تو وہ اتفاقات کی لوٹ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ حادثہ و اتفاق کو ایک دوسرے کا ہم معنی قرار دے لیں۔ میرے خانساماں کی زندگی کا ایک حادثہ میری زندگی کا ایک اتفاق ہی تو تھا۔

نوکر کی خوبی ہے کہ وہ مزاجداں ہو اور یہ وصف اس میں تربیت سے پیدا ہوتا ہے۔ پُرانے نوکر اسی بنا پر قابلِ ترجیح ہوتے ہیں۔ مگر ایسا پُرانا جس نے آپ کو گودوں میں کھلایا ہو۔ بعض موقعوں پر اور بعض باتوں میں دوبھر بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ سب کچھ سہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ میرا بوڑھا خانساماں دو پشتوں کا نوکر تھا۔ اس لئے اس میں خوبی بھی تھی اور خرابی بھی۔ اس پر ایک مصیبت آپڑی اور چار وناچار مجھے بھی حصہ لینا پڑا۔ یہ ایک خالص اتفاق تھا۔

قصہ یہ ہوا کہ کوئی سال بھر پہلے اس نے اپنی لڑکی کی شادی کی تھی، اور یہ جانتے ہوئے کی تھی کہ داماد لُچا اور

بدمعاش ہے۔ مگر چونکہ وہ اس کے سالے کا لڑکا تھا۔ اور اس کی بیوی نے منگنی کر دی تھی اس لئے برادری میں موہنہ کالا کرنا اور مرحوم بیوی سے شرمندہ ہونا نہ چاہتا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی یقین کر بیٹھا تھا کہ شادی کے بعد لڑکے کا چال چلن سنبھل جائیگا۔ غرض جس دن سے بیاہ کر گئی، شوہر نے پھر اس لڑکی کو باپ کے پاس نہ بھیجا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اسکا زیور وغیرہ بیچ کر کھا اڑا اڑا ڈالا۔ اور پھر یہ سمجھکر کہ اس نے کچھ زیور چھپا رکھا ہے، شراب کے نشہ میں مار پیٹ کرنے لگا یہاں تک کہ وہ لڑکی جب بہت زیادہ مجروح کی گئی تو چھپ کر باپ کے پاس چلی آئی۔

میں سیر کے لئے جانیوالا ہی تھا کہ میرا بوڑھا خانساماں اپنی لڑکی کو ساتھ لئے بسورتا ہوا آیا۔ اور فریاد کرنے لگا۔ صورتِ حال کو سُن کر میں نے اس سے کہا کہ اس معاملہ میں ان کی کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔ اور میں نے خود اسی کو ملزم ٹھیرایا۔ کہ شادی کرتے وقت داماد کے متعلق پوچھ گچھ ضروری تھی۔ مگر اس نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ سرکار سنجوگ تو اسی کے ساتھ تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ اس کے داماد کو بلا کر میں ڈراؤں دھمکاؤں، اور طلاق دلوا کر اس کا زیور واپس کرادوں۔ یا پھر ڈپٹی صاحب سے کہکر اسے سزا کرادوں۔ ہم لوگوں میں سفارش یا دوسرے لفظوں خوشامد کو جائز قرار دے لیا گیا ہے اور مقابلہ سے بچکر نامردگیوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں جو سفارش اور خوشامد کی دوسری شکل ہے۔ اُس کی اِس خواہش پر مجھے اپنے خانساماں پر بہت غصہ آیا۔ کیونکہ اس وقت مجھے اپنی قوم کی اخلاقی پستی کا احساس شدت کے ساتھ ہوا۔

میں نے جب اس کی مدد کرنے سے انکار کیا تو میں نے دیکھا کہ اس لڑکی کے نیم مستور چہرے پر مایوسی چھاگئی۔ اور اس نے مجھے بڑی حسرت بھری نگاہ سے دیکھا۔ وہ جوان بھی نہ ہونے پائی تھی بمشکل سے پندرہ سال کی ہوگی اور اس اجڑی حالت میں ہونیکے باوجود قبول صورت تھی۔ اس کی حسرت بھری نگاہ کا پڑنا تھا کہ میرے خیال نے پلٹا کھایا۔ اور اس طرف رجوع ہو گیا کہ اب ذرا اپنی تفریحات کی نوعیت کو بدل کر دیکھنا چاہیئے۔ حصول مقصد میں مجھے کسی دشواری کا امکان معلوم نہ ہوا۔ چنانچہ میں نے اپنے خانساماں سے کہدیا کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے کر دیا جائیگا۔

وہ دعائیں دیتا ہوا کمرے سے نکلا اور لڑکی بھی اس کے پیچھے ہولی مگر جاتے جاتے اس نے کن انکھیوں سے دیکھا اس کی یہ نگاہ نصف احسان مندی کا اظہار تھی۔ اور نصف رہائی کی امید مسرت۔ مگر اس کے اس دیکھنے نے میرے خیال کو قوی اور ارادے کو مستحکم کر دیا۔ میں گھر سے باہر نکلا تو اسی کا خیال لئے ہوئے اور واپس پہنچا تب بھی اسی کا خیال لئے ہوئے۔

ابھی میں کپڑے اُتار ہی رہا تھا کہ خفیف سی آواز کان میں پہونچی۔ ادھر اُدھر نظر کرنے کے بعد احساس ہوا کہ وہ میرے ضمیر کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہا تھا:۔

میرا ضمیر:۔ اس غریب کی مصیبتوں میں اضافہ کیوں کرتے ہو ——— وہ کہیں کی نہ رہے گی۔

میں:۔ خدا خیر کرے! تو نے تو مجھے سراسیمہ کر دیا ——— حیرت کی بات نہیں کہ ہم دونوں کو ملے اتنی مدت گذر گئی! کتنا زمانہ ہو گیا؟

——— دن تو بہت ہو گئے ——— میں نے ہمیشہ تمھارے احساسات کا پاس کیا، یا یوں سمجھ لو کہ میں نے اپنے

مشوروں کے رائیگاں جانیکا خیال کیا۔ مگر اس وقت ضروری معلوم ہوا کہ میں تمھیں آگاہ کردوں۔ تم اب ایک فلسفی یا احمق بننے کے درجے میں آگئے ہو ــــ یہ تمھارا انتیسواں سال ہے!

ــــ ہوں ں ں! مگر اس کا تو خیال بھی خوفناک ہے۔ گویا میری جوانی رخصت ہو رہی ہے؟

ــــ بالکل تو ایسا نہیں۔ اس نئے زمانہ میں نوجوانی کو احساس کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔ اور طبی ترغیبوں نے انسان کی قلبی حالت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ پُرانے حکیم طبیب تو راجہ نوابوں ہی کو بوڑھا ہونے دیتے تھے مگر اب ڈاکٹر لوگ کسی کو بھی بوڑھا ہونے دینگے۔

ــــ بیہودہ باتیں کیوں کرتا ہے۔ طبیب ڈاکٹر کچھ ہی کہا اور کچھ ہی کیا کریں مگر جوانی جس سے عبارت ہے وہ مدت بہت ہی قلیل ہوتی ہے ــــ جوانی سے زیادہ دولت مستعجل دوسری نہیں۔ افسوس!

ــــ تو میں کیا سمجھوں کہ تمھیں پشیمانی کا احساس ہے؟ کیا واقعی تم نادم ہو رہے ہو؟

ــــ ہرگز نہیں، میں نادم و شرمندہ کیوں ہوں؟ تو نہیں جانتا کہ میں ایک شاعر بھی ہوں ــــ کبھی خجل نہ ہونا میرا پیشۂ فن ہے!

ــــ اوہو! یہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا...... اچھا تو اب تم اس منزل میں ہو جہاں پہونچکر انسان ندامت و تاسف کی رسائی سے باہر ہو جاتا ہے۔

ــــ بیشک میں اسی مقام پر ہوں!

ــــ تم نے ابھی پوچھا تھا کہ کب سے نہیں ملے۔ ٹھیک آٹھ سال ہوتے ہیں کہ تم نے اپنا وقت، اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ اپنی نفسانی خواہشوں کی تسکین میں صرف کیا ہے۔

ــــ (بات کاٹ کر) قصور معاف، میرے یہ آٹھ سال تجربہ و صناعت کے حصول میں بھی صرف ہوئے ہیں۔ اس قسم کی زندگی انسان کو صناع بنادیتی ہے۔ میری اوقات گذاری کو خواہشوں کی تسکین کے سر تھوپ دینا اصولی غلطی ہوگی۔ تو جدید ماحول کی پیداوار ہے۔ کیا تجربہ و صناعت کے حصول کو بُرا کہا جاسکتا ہے؟

ــــ صناعت! تم بھولے نہ ہوگے کہ اپنے والد کی موت سے تمھیں ایک گونہ مسرت ہوئی تھی۔ کیونکہ اس سے تمھیں بہت سی ہولتیں بہم پہونچی تھیں۔ اس وقت تمھارا خیال تھا کہ اس گھر کی فضا میں جس کی آقائی تمھارے باپ کو حاصل تھی تمھارا جمالیاتی بروز رکا ہوا تھا؟

ــــ (قطع کلام کر کے) ہاں، مجھے یہ احساس تو تھا، پھر؟

ــــ تو کیا اب یہ لازم نہیں کہ تم اس فریب نفس یعنی اپنے جمالیاتی بروز کا جائزہ لو۔ اور کیا مناسب نہیں کہ تم غور کرو کہ تم نے کس چیز کی کتنی قیمت ادا کی؟ قیمت سے میرا مطلب دوسرے کی کمائی ہوئی دولت سے نہیں جو تم نے کھائی اڑائی بلکہ اخلاقی سرمایہ سے ہے۔

ــــ بھولے ضمیر! کیا تو اس سے انکار کرسکتا ہے کہ زندگی کا جو تجربہ میں نے حاصل کیا ہے وہ کسی دوسری زندگی میں ممکن نہ تھا اور کیا تو تسلیم نہ کریگا کہ انسانی زندگی کا ماحصل اس کے تجربات ہی ہیں اور دانائی و فرزانگی تجربات ہی کا دوسرا نام ہے؟ یہ دوسری بات ہے کہ تجربے حاصل کر کے آدمی جب کام کا بنتا ہے تو چل چلاؤ کا وقت آجاتا ہے۔ جیسے جیسے ڈھل ڈھل کر کپڑے میں جب نفاست و نرمی

پیدا ہوتی ہے تو وہ پھٹنے لگتا ہے۔ مگر اس میں تیرا قصور کیا۔ تو جدید ماحول کا ضمیر ہونے کے باوجود، ہے تو ایک مسلمان کا ضمیر! اور مسلمانوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ عقل و تدبّر سے منہ موڑ کر باقی سب سے رشتہ جوڑیں گے۔ مگر میں اس وقت مسلمانوں کی عقل دشمنی پر تبصرہ نہیں کر رہا۔ تو نے اخلاقی گفتگو چھیڑی ہے تو سُن، انسانوں کی کثیر تعداد طرفہ قسم کے فریب میں مبتلا ہے۔ اور اس کے ساتھ تو بھی! ہر وہ تعلیم، ضابطہ یا قانون جو قوانینِ فطرت کے خلاف ہوگا، اس کا انسان کے ہاتھ سے پامال ہونا اٹل ہے۔ اخلاقیات کی فرہنگ نے بعض باتوں کو گناہ سے تعبیر کیا ہے۔ ممانعت سے لذت و دلکشی کچھ بڑھ جاتی ہے اور حصول لذت انسانی فطرت میں ——

—— (بات کاٹ کر) معاذ اللہ!

—— تو گویا میں کفر بک رہا ہوں؟ حالانکہ اس گفتگو سے میرا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ میں احمق نہیں بلکہ ایک فلسفی بن گیا ہوں۔ اب تو تجھے ماننا ہی پڑ گیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں میں نے عقل و خرد کا کتنا بڑا سرمایہ حاصل کیا ہے۔

—— دوست، تمہاری طبیعت میں جو خامی آٹھ برس پہلے تھی وہ آج بھی موجود ہے۔ اس وقت بھی تم دوسروں کی رائے اور پسند کے سانچے میں ڈھل جاتے تھے اور آج بھی دوسروں کے بنائے ہوئے معیار پر اپنی قدر و قیمت کے متعلق دھوکا کھا رہے ہو۔ تمہارا تجربہ، فراست سطحی ہے، عقل نام ہے بصیرت کا جس سے تم بالکل نا آشنا ہو۔

—— ضمیر با تدبیر، اتنی سخت گیری جائز نہیں، ورنہ دُنیا کے تمام امور غیر فیصل شدہ رہ جائیں گے۔ کیا تجھے تسلیم نہیں کہ اوائل شباب کی نیم شعوری حالت کے دُھندلکے سے نکل کر میں نے خودی حاصل کی اور اس سے کام لیا ہے۔ اپنی خودی کو بروئے کار لانا یقیناً ایک کارنامہ ہے۔ تُو نفسیات کو سمجھتا ہوتا تو مجھے داد دیتا۔

—— لیکن آخر کس مقصد کیلئے؟ تم دنیا کے علم میں کیا اضافہ کرنے کے قابل ہوئے؟ تمہارے افعال وہی ہیں جو تم سے قبل اَن گنت انسانوں کے رہ چکے ہیں اور تجربے بھی وہی ہیں جو لاتعداد انسان حاصل کر چکے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ نوعِ انسان کو ارتقاء کی منزلیں طے کرنے میں تم نے کیا مدد دی؟ تمہیں فلسفی ہونے کا دعوےٰ ہے تو میں بتاتا ہوں کہ فلسفہ کی نظر میں موت ہی ایک خیر اور بھلائی ہے۔ تم اگر قبل از وقت موت سے معانقہ کرو تو بیشک ارتقاء نسل انسان کو بقدر یک نسل بڑھا سکتے ہو! اور موت دُنیا کی تمام خیر و برکت میں ارزاں ترین شے ہے!

—— مجھے تسلیم ہے کہ موت ایک خیر ہے، لیکن تقاضائے فطرت یہ بھی ہے کہ ہم جئیں۔ مجھے حیرت ہے کہ ایک فلسفی کا ضمیر ہونے کے باوجود تو اختیار کے مغالطہ میں پھنسا ہوا ہے! کم از کم ایک لاکھ سال سے انسان نے اس کرہ کو مضحکہ خیز بنا رکھا ہے۔ جس کا باعث انسان کی ذہانت ہے۔ لیکن اس ذہانت کے باوجود وہ بے خبر ہے کہ زندگی حقیقتاً مرادف ہے عقل و شعور میں خلل پڑ جانے سے، زندگی اصل میں عبارت ہے خوابیدہ فطرت کے خستہ و ماندہ پہلوؤں کے کھل جانے سے اور یہ زبان دراز بودنہ نہیں دیکھ سکتا کہ خیال کی فسوں کاری اور زبان کی سحر سازی کی حد ہی مذہب و اخلاق کی حد ہے! مذہب کے ذریعہ سے انسان کو زندگی کی آفتوں اور بلاؤں کیلئے طیار کیا جاتا ہے، اخلاق کے نام سے اس کی اندرونی و قوی اشتہائے جنسی پر قابو دلانے کی کوشش کی جاتی ہے!

—— (کچھ خموش رہنے کے بعد) مجھے اپنی جہالت کا اعتراف ہی، اور سایک مدت تک جُدا رہنے کے بعد ایک دوسرے کو سمجھنا بھی کچھ دشوار ہوتا ہے، مگر میرا خیال ہے کہ تمہاری ساری اصول طرازی اور نظریہ بازی کی بنا تمہارا یہ گھمنڈ اور گمان ہے کہ تمہیں کوئی عورت ایسی نہیں

ملی جو تمہارے نظامِ زندگی میں تغیر، ترمیم یا اسے کسی طرح متاثر کر سکتی ہو۔

—— نہیں، ہرگز نہیں! اس مسئلے پر میرے خیال میں کوئی گھلک یا آدیزش نہیں۔ لیکن اس کی وجہ بھی سُن لے۔ میں نے سُنا تھا یا کہیں پڑھا تھا، اور شاید میری کم عمری کے عہد کی بات ہے۔ کہ عورت ناقابلِ اعتبار ہے۔ اس کا دلفروز تبسم اور جانفزا ادائیں، اس کی تمام زیبائیاں اور دلکشیاں مصنوعی ہیں۔ وہ مرد کو صرف جلبِ منفعت (وسیع معنی میں) کی حد تک پسند کرتی ہے۔ میری جوانی نے عورت کو جن مشتبہ نظروں سے دیکھا ہے اس کا راز ان سیدھے سادے لفظوں میں مرکوز ہے! میرا پرانا عقیدہ ہے کہ عورت کا مرد کو چاہنا ناممکن ہے — مرد مکروہ ہے۔ اس کے قابلِ نفرت! پھر کیونکر ممکن ہے کہ وہ مرد کو احساسِ نفرت کے بغیر چھو بھی سکے۔ کیونکر ممکن ہے کہ اسے مرد کی حقیقی آرزو ہو سکے؟ فطرت کے تقاضہ کو محبت سمجھ لینا صد درجہ کی حماقت ہے۔ میں نے عورت کی زندگی میں ڈوب کر دیکھ لیا ہے۔ عورت کی ساری و شلوار کی لپٹیں مرد کی اچکن پاجامہ کے سپاٹ پن سے مختلف چیز ہیں، میں نے ان لپیٹوں کے اسرار میں گم ہو کر دیکھ لیا ہے۔ اس کے اتنی صناعیوں سے سنوارے ہوئے گیسوؤں کی لٹیں، ایسے اشارہ کرنیوالے زلفوں کے چھلے، مرد کے بالوں کی خس و خاشاک سے جدا شے ہیں۔ کریب اور جارجٹ کے بل اور تہیں ٹوئڈ اور سرج کے کھردرے پن سے الگ چیز ہیں۔ نازک سلیپروں اور سینڈلوں میں حنائی تلوے مرد کے چوڑے پنجے کے بوٹوں میں بدبودار پاؤں کے مقابلہ میں دوسری ہی چیز ہیں۔ اس لئے میں نے عورت سے معاشقہ اور اس کی زندگی سے عشق کیا ہے — اور میرا یہ عشق خود میری ہی زندگی کے اندر ایک دوسری زندگی سے عبارت ہے۔ عورت کی یہ زندگی کتنی مستور اور خود عورت سے کس قدر جُدا گانہ شے ہے۔ سکون پاش رنگوں کا ایک عالم اور اس عالم میں گذر جاتی ہوئی متحرک پرچھائیاں، دھندلکے میں ہیئت بدلتے اور گیسوؤں کی چھاؤں میں نیم رخی چہرے، جوشِ جوانی کی چھپاتی ہوئی جھلکیں، مدوّر و دراز گردن میں نازک سی خمیدگی، اور پردۂ افلاک میں نفوذ کر جانیوالی روشن نگاہیں! سچ تو یہ ہے کہ عورت کی زندگی کے اس نیرنگ سے میں اس درجہ مسحور ہوں کہ اپنے آپ کو کسی ایک کے حوالہ کر دینا دشوار تھا۔

—— تم نے شاعری میں واقعی ترقی کی ہے، مگر بایں ہمہ تمہیں عورت کے ساتھ ایسی کونسی کامیابی نصیب ہوئی؟

—— خدا کی ستوار اب کیا تیرا یہ منشا ہے کہ میں ان ماجرا ہائے رنگیں، ان داستانہائے شیریں کو دہراؤں کہ کس طرح شروع ہوئیں اور کیونکر ختم ہوئیں اور پھر کیسے شروع ہوئیں؟ میں تو عورت اور شیمپین کو مماثل سمجھتا ہوں شیمپین کی ایک حیثیت تو جام و مینا کے اندر اسکی خوش رنگی ہے، یہ عورت کی زندگی کی مثال ہے! اور دوسری اس کی لذت و سرور آفرینی ہے۔ یہ خود عورت سے عبارت ہے!

—— تم نے اپنے شیمپینی معاشقہ کے بارے میں تو مجھ سے کبھی مشورہ کیا نہیں، البتہ اس طویل مفارقت کے دو چار دن ہی قبل تم نے شہابہ کے متعلق پوچھا تھا کہ تم اس کے دل میں سچے جذبہ کے ملہم ہوئے ہو یا نہیں؟ اس کا میں نے جواب بھی دیدیا تھا کہ سرے سے یہ سوال ہی مہمل ہے۔ جو جذبہ خود ہمارے اندر نہیں، اُسے ہم دوسرے کے قلب میں کیونکر ابھار سکتے ہیں۔ خیر، اب میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی تم اب بھی کسی ایک عورت کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتے؟

—— تیرا بھی یہ سوال مہمل ہے۔ کسی عورت کو عمر بھر کیلئے انگیز کر کے میں یہ کیوں دیکھوں کہ وہ موٹی ہوتی جا رہی ہے، آج بال سفید ہونا شروع ہو گئے ہیں، آج جھریاں نمودار ہیں، آج بیوقوف ہوتی جا رہی ہے! تو ہی بتا کہ ایک ہی چیز اجیرن ہو جاتی ہے یا نہیں؟ پھر یہ کہ خود نفسِ شادی تو میرے اصول کے منافی ہے۔ تو شاید کہے گا کہ ایک قنوطی کی زندگی سطحی نہیں ہوتی اور تو وہ کیوں جی رہا ہے“

کا جواب نہیں دے سکتا۔ تو شاید یہ بھی کہے گا کہ خودکشی کے خلاف شوپنہار کے دلائل ضمیری وجوہ پر مبنی نہیں۔ اور یہ درست بھی ہے کہ کسی مسئلہ کے متعلق کمزور دلیل پیش کرنا بے نتیجہ بات ہے۔ لیکن کسی ضعیف استدلال سے بھی ضعیف مخالف جھٹلایا تو جا سکتا ہے۔ خودکشی کے بارے میں بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ستم حیات کا تریاق ہے۔ والدین نے ہمیں وجود لاکر ہم پر جو ظلم کیا ہے، خودکشی اسکی تلافی کر دیتی ہے۔ اور خودکشی کر کے ہم ایک مثال پیش کر دیتے ہیں اور امید کر سکتے ہیں یہ مثال دوسروں کو وبائے عشق سے محفوظ ہوجانا سکھا دیگی۔ گویا ہم اپنی جان دیکر روح انسانی کے نجات دہندہ بن سکتے ہیں۔ تجھے ماننا پڑیگا کہ انسان کے تمام گناہ اور خطائیں محدود ہوتے ہیں، ان کا اثر محدود ہوتا ہے، بجز محبت کے کہ اس کی کوئی حد اور انتہا ہی نہیں۔ قتل کی سزا موت مقرر کی گئی ہے۔ لیکن بادیٔ النظر میں معلوم ہوجاتا ہے کہ ایک انسان کو عدم آباد پہنچانے کے مقابلہ میں ایک انسان کو وجود میں لانا زیادہ سنگین جرم ہے۔ انسانی آبادی بھوک کے چھتے کی شکل اختیار کر رہی ہے۔ اور یہی لیل و نہار ہیں تو آئندہ سو سال میں غذا کی پیداوار کم اور کروڑوں پیٹوں کا اضافہ ہوجائیگا۔ جب یہ حقیقت سامنے آتی ہے تو مجھے ان بھولے انسانوں پر بے اختیار ہنسی آجاتی ہے جو سمجھتے ہیں کہ ایک انسان کے ساتھ اس کا رزق بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ سُنا، دوست ضمیر، کتنا عجیب ماجرا ہے! اصل حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ایک ایسے انقلاب کے تمام اسباب فراہم ہو رہے ہیں جس کا دنیا کو کبھی تجربہ نہیں ہوا۔ اور ایک ایسا خونریز ڈراما کھیلا جانے والا ہے جو قیاس میں نہیں لایا جا سکتا۔

—— میرے دوست، تمہارا فلسفہ بھی تمہاری شاعری کا ہمپایہ ہے۔ لیکن میں تو محض ایک ضمیر ہوں، اور ضمیر کبھی فلسفی بن نہیں سکتا ہے۔ مگر کہیں تم غیر شعوری طور پر ... کے فلسفہ کے تو معتقد نہیں ہو گئے؟

—— ہرگز نہیں۔ فلسفہ میں میں صرف شوپنہار کو مانتا ہوں۔ لیکن تو مجھے حسب عادت یہ مشورہ تو نہیں دینا چاہتا کہ میں عورت سے نفرت کا جھنڈا اُڑاؤں، اور جناح صاحب کی لیگ کی طرح میونسپلٹیوں کی عمارتوں پر قائم کرتا پھروں اور عورت کو جو کوئی دو سال سے انسانی حلقے میں شامل کر لی گئی ہے، چھوٹے پاؤں کی ایک اور نسل ثابت کرنے کیلئے کانگریس سے مطالبہ اور سمجھوتہ کرتا پھروں۔

—— عزیز دوست، تم مجھ سے بھی سچ نہیں بول رہے ہو۔ اور آدھی رات کے وقت بھی سچ نہیں بول رہے ہو!

—— آخر تو ضمیر تو میرا ہی ہے۔ کیا چوبیس گھنٹے میں آدھی رات کے وقت بھی تجھے دھوکا نہیں دیا جا سکتا! اور قرین مصلحت نہیں سمجھا جا سکتا؟

—— اب تم مذاق پر اُتر آئے ہو۔

—— کیونکہ مجھے نیند آنے لگی ہے۔ اور تو سچ مچ پُرانے وقتوں کی نشانی اور بڑا اختر انٹ ضمیر ہے!

—— دوست تم شاہراہِ زندگی پر بے سہارے بھٹکتے پھرتے ہو۔

—— (بات کاٹ کر) بھٹکتے پھرنا یعنی؟ اپنے ذکی الحس ہونیکے سبب سے اگر میں اپنے عہد کے مختلف اثرات قبول کر لیتا ہوں تو کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ میں خود اپنی جگہ ایک قوت ہوں!

—— مگر زندگی کی نامعلوم اور غیر موجہ قوتوں سے متاثر ہوجانا اور ان کا معمول بن جانا ایک انسان کیلئے کوئی بڑا رتبہ تو

نہیں کہا جا سکتا! کیا تم کسی زیادہ ارفع مرتبے کا تصور قائم ہی نہیں کر سکتے۔ کسی ایسے رُتبے کا خیال جس میں نُدرت ہو۔ میرا مطلب کسی ایسے احساس سے ہے جو ایک مقصد یا انجام کو تسلیم کرتا ہو۔

____ اب تو مجھے الٰہیات کی بحثوں میں الجھانا چاہتا ہے!

____ عزیز دوست! تم شاید میرے وجود سے تو انکار نہ کر سکو گے، اور اسے بھی مانو گے کہ میں ہی تمھارا ایک سچا اور آئینہ مثال دوست ہو سکتا ہوں۔ اور آج اس وقت کے مقابلہ میں زیادہ مخلص دوست ہو سکتا ہوں جب ہم دونوں گہرے دوستوں کی طرح ٹہلنے جایا کرتے تھے۔ ان رنگ بھریوں کے مقابلہ میں بھی گہرا رفیق ہو سکتا ہوں جو تمھارے ہی خیال کے مطابق معطر تاریکیوں میں فردوس پہلو اور بہار بستر ہیں!

____ خدا کیلئے اس ذکر کو نہ دوہرا! "معطر تاریکیاں" بہت ادنیٰ چیز ہے۔ لیکن تو یہ اصولی بات کیوں بھول جاتا ہے کہ میری بیتا ہی اس قسم کے ادب کے سایہ میں ہوئی!

____ دوست، معلوم ہوتا ہے کہ تم جڑ تک سرد ہو چکے ہو، اور تمھارا علاج کوئی شدید قسم کی بیماری ہی سے ہو تو ہو!

____ اب تو تو تماشے کی باتیں کرنے لگا۔ شدید بیماری بھی میرا کیا بنا سکتی ہے! تو اچھی طرح جانتا ہے کہ تیرے تو میں نے پرخچے اڑا دیئے ہیں۔ اور کبھی کہلے پھوٹنے کے قابل بھی نہیں چھوڑا ہے۔ تیری کامل آٹھ سال کی روپوشی سب سے بڑی شہادت ہے۔

____ میرے خود فریب دوست! پرخچے تم نے میرے نہیں اپنے اڑائے ہیں!

____ ہوں! ڈپٹی نذیر احمد کے فسانہ کا ضمیر! مگر اپنے نقائص دُور کئے بغیر تجھے میری جدت و جودت پر معترض ہونیکا کیا حق ہے؟

____ ہاں، میں نذیر احمد قسم ہی کے ملہمات کا فیضان ہوں، اور یہ ملہمات اٹل ہیں — کیونکہ وہ میں ہوں! لیکن تمھارے ملہمات کا مخرج گوشت و خون ہے؛ اور گوشت و خون میں فساد ہے، اس لئے تمھارے ملہمات بھی گوشت و خون کی طرح پُر فساد ہیں!

____ تو اگر شوپنہار کا مقلد ہوتا تو سمجھتا کہ گوشت و خون کوئی کم زیست شے نہیں۔ بلکہ اس کا مقصد آرزوئے زیست کو ابدی بنا دینا ہے۔ شو کا کامل تصور کرنے کے لئے صرف کھوپریوں کی مالا کا عندیہ کافی نہیں، اس میں شو کی علامت کا تصور بھی لازمی ہے!

____ دوست، مجھ سے جدا ہو کر تم نے جو کام اٹھایا اس میں ناکام رہے۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ تم نے ایک ناول لکھنا شروع کیا ہے جس کا ہیرو تم سا ہی ایک منحوس انسان ہے؛ اور تمھارا گمان ہے کہ وہ ناول بہت مقبول ہوگا!

____ وہی ظن و تخمین کی پُرانی عادت! "لوگوں" سے تیرا مطلب کیا ہے؟ یہ انسانوں کی بھیڑ جو بھیڑوں کے گلّے سے یونہی سی متمیز ہے، تو جانتا ہے کہ ادبی صناعت کی چند ہی ہستیاں ——

____ (بات کاٹ کر) جی، بالعموم اخلاق کے معلّم اور داعی ہی سب سے بڑے اخلاق کش ہوتے ہیں۔ یہ "کار دیگر" کرنے والی چند قدردان ہستیاں ہی ایک دیوث کی سوانحعمری کی داد دے سکتی ہیں۔

____ تب تو میرا ہیرو مجھ سے ملتا جلتا ہرگز نہیں، کیونکہ یہ کام میں نے کبھی نہیں کیا — اور میرا خیال ہے کہ میں دیسا ہو بھی نہیں سکتا۔

____ تمھارے ہیرو کے اندر تمھاری پوری اخلاقی زندگی منعکس ہے — یہاں تک کہ تمھارا ویسا نہ ہو سکنے کا خیال بھی!

____ پیارے ضمیر تو خوب جانتا ہے کہ مجھے غیر معمولی سے عشق اور ناموزونیت سے تنفّض ہے۔ اور ایک دیوث میں عمومیت اور ناموزونیت

دونوں باتیں ہوتی ہیں۔ اس لئے تیرا یہ خیال کہ میرا ہیرو میں خود ہوں ضمیرانہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے ؟ تو یہ بھی جانتا ہے کہ پہلے میرا خیال تھا کہ "حسن شاہ" کی زندگی ـــــ

ـــــ (بات کاٹ کر) ہاں، جو پہلو نشتر کے مصنف سے نظر انداز ہو گیا تھا ؟

ـــــ اب تو کڑوی سُنانے لگا ہے تو اس دلچسپ گفتگو کو ختم ہو جانا چاہیئے ۔

ـــــ یوں تو ضمیر کی آواز تلخ یا شیریں کچھ بھی نہیں، لیکن الحق مُرّ کے تحت اس کی کوئی بات تلخی سے خالی نہیں ہو سکتی ـــ کہ وہ تو خدا کی آواز ہے

ـــــ وہی دقیانوسی خیالات! بار ہا اس دفعہ سمجھا چکا کہ بھائی ضمیر جس شے سے عبارت ہے وہ ماحول کے چند عقائد و تعصبات کا نتیجہ ہے ـــ

ـــــ (بات کاٹ کر) میں تم سے اتنا کہہ دینا چاہتا ہوں کہ تم سا معمولی آدمی کسی کام میں امتیازی درجہ حاصل کر سکتا ہے تو اسی حالت میں کہ تم اپنے عہد کے اصولِ اخلاق اور چال چلن کے ضابطوں پر، تو میں جن کو صدیوں میں مرتب کرتی اور جو حفظِ ذات کی خطانہ کرنیوالی جبلّت کے سکھائے ہوئے ہوتے ہیں عمل کرو! غور و فکر سے تمہیں یہ سبق مل سکتا ہے کہ انسانیت ان سب کے مقابلہ میں اپنا تحفظ کرتی ہے جو اُسے حصولِ مقصد سے باز رکھنا چاہیں، اور انسانیت کے انتقام سے نہ سکندر بچ سکتا ہے اور نہ نپولین ـــ تم سے خامہ فرسا کی تو حقیقت ہی کیا! تم جو بننا چاہتے ہو وہ ہستی تو کہیں صدیوں میں ایک آدھ رونما ہو جاتی ہے !

ـــــ تو تیرا مشورہ یہ ہے کہ میں نے سماج کا جو پرچم لہرایا ہے اُسے اتار دوں اور ایک صاحبِ دیانت تاجر بن جاؤں جس کے بیوی بچے ہوں جس کا ایک گھر ہو اور اس گھر کی حکومت اس بیوی کے ہاتھ میں ہو ؟ کیا تو یہ تنبیہ کرنا چاہتا ہے کہ بالوں میں سفیدی کا دور رونما ہو چلا ہے، کوئی دن کی بات ہے کہ صحت پاش پاش ہو جائیگی، جوانی کا زور طوفان خوردہ بادبان بن جائیگا۔ اور کشتی حیات کے تختے زمانہ کے سمندر کی موجوں کے تھپیڑے کھا کھا کر دُور افتادہ خلیجوں میں بہتے پھریں گے ؟ لیکن تو بھولتا ہے۔ یہ تو ہونا ہی ہے ـــ نوشتے کو بدلنا تو تیرے عقیدے میں بھی ناممکن ہے ! ایسی صورت میں کیا یہی انسب نہیں کہ جس راستے پر جا رہا ہو، انسان اس پر مردانہ وار قدم اٹھائے چلا جائے ؟

ـــــ مگر تم میں وہ مردانگی مفقود ہے ـــــ تمہارے لئے تو سہولت اسی میں ہے کہ اوسط انسان کا مسلک اختیار کرو جس میں سب خوش رہ سکیں!

ـــــ اب تو بیسویں صدی کے ریاکارانہ ضمیر کی سی باتیں کرنے لگا ـــ میں تو تجھے پرانی وضع پر قائم سمجھتا تھا!

ـــــ میرے دوست، میں تمہیں بایزید بنا لینے کی توقع کر ہی نہیں سکتا ـــ

ـــــ (بات کاٹ کر) اوہو، خوب سمجھایا۔ میں اپنا ایک "اقبالنامہ" بھی شائع کرونگا۔ لیکن ضمیر باتدبیر! میں صرف ایک ہی چیز کی قدر کرتا ہوں اور وہ چیز صناعت ہے! مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ تو یہ جانتے ہوئے بھی مجھے مشورہ دیتا ہے کہ اپنے ناول کو کسی احمقانہ اخلاقی سبق پر منتج کروں۔ نہیں، میں اسے اصولِ صناعت کے مطابق ختم کروں گا !

ـــــ خیر، تم جانو! یہ اور بتا دو کہ کیا تم واقعی اس بدنصیب لڑکی کو اُڑا لینے پر مُصر ہو تاکہ تم اس کی "زندگی کا راز" معلوم کرو اور اسے بھی ایک "افسانہ" بنا دو ؟

ـــــ (چُپ رہا)

ل۔ احمد

شوقِ ناتمام

ایک روز ہنگامِ شب آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ لیکن نہ تو بجلی ہی کوندتی اور نہ بادل کی گرج سنائی دیتی۔ پانی کے قطرے کسی بیکس کے آنسوؤں کی طرح بادلوں سے ٹپک رہے تھے اور ہوا مظلوموں کی آہوں کی طرح سسکیاں بھر رہی تھی۔ سازِ ہستی خاموش ہو چکا تھا اور اس خامشی نے جس کی آغوش میں کسی شوقِ پوشیدہ کی ناکامیوں کی تلخ کامی مچل رہی تھی .... دل کے جذبات کو پھر آمادۂ پیکار ہونے سے تھام رکھا تھا برامدہ میں جو بام کے گملے رکھے تھے ان پر بوندوں کے گرنے سے ایک ترنم ریز آواز پیدا ہو رہی تھی۔ اور میرے کمرے کی وہ گھڑی جس کی مسلسل ٹک ٹک اکثر میری مونسِ تنہائی ہوا کرتی ہے آج خاموش تھی۔ میں صوفے پر لیٹا "انڈین لسنر" دیکھ رہا تھا۔ لیکن پروگرام حسبِ دستور آج بھی کچھ بے لطف سا ہی تھا۔ تاہم وقت کاٹنے کیلئے میں نے "میڈیم ویوز" پر لاہور نکالا تو کوئی قوال یہ شعر گا رہا تھا۔

مجھے خاک میں ملا کر مری خاک بھی اڑا دے
ترے نام پر مٹا ہوں مجھے کیا غرض نشاں سے

غالباً یہ آخری شعر تھا کیونکہ اس کے بعد کسی سکھ صاحب کے گانے کا اعلان کر دیا گیا۔ میں نے ریڈیو تو بند کر دیا اور کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ میرے کانوں میں وہی ع

ترے نام پر مٹا ہوں مجھے کیا غرض نشاں سے!

گونج رہا تھا۔ اور آنکھوں کے سامنے تصور نے ایک نقشہ سا کھینچ دیا تھا۔ کسی خانہ برباد کی تصویر جو اس حرماں نصیب کی بیتا بیوں اور نامرادیوں کی داستان کچھ اس انداز سے کہہ رہی تھی کہ سننے والے کے دل میں شکایت یا شکوہ کا خیال تک پیدا نہ ہو۔

یہ تو سچ ہے کہ اگر دولت پاس ہو تو پھر عزت اور شہرت حاصل ہو سکتی ہے۔ زندگی کے یہ چار دن آرام اور آسائش سے کٹ جاتے ہیں۔ لیکن یہی دولت اس داغ اور پریشانی کا جو قسامِ ازل نے کسی کے نصیب میں لکھ دی ہو تدارک نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی کے پاس قارون کا خزانہ ہو لیکن صحت اور تندرستی نہ ہو تو اسکی زندگی اس کے لئے وبال بن جاتی ہے۔ اور اطمینانِ قلب کی بجائے گونہ پریشانی اور فکر دامنگیر رہتا ہے۔ اور جو صحت بھی ہو تندرستی بھی ہو لیکن غنچۂ دل کسی وجہ سے مرجھایا رہتا ہو تو جان اندر ہی اندر گھلتی رہتی ہے اور وہ بدنصیب خونِ دل پیتا اور لختِ جگر کھاتا رہتا ہے۔ لیکن تصور نے جس شخص کا نقشہ میرے سامنے پیش کر رکھا تھا اس کی زندگی دوسروں کیلئے قابلِ رشک تھی۔ عزت، شہرت، ثروت سبھی کچھ حاصل تھا لیکن یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ اس کے دل میں بھی ایک خار کھٹک رہا ہے اور اس خلفشار سے دُنیا اس کے لئے جہنم سے بھی بدتر ہو رہی ہے لیکن اگر اس کی ظاہری کامرانیوں کے لحاظ سے میں اسے بلند اقبال کہوں تو یہ نام کچھ غیر موزوں نہ ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب دنیا اس کیلئے مسرتیں، راحتیں اور شہرت اپنے دامن میں لئے پھرتی تھی تو اس پر کیا ایسی بنی کہ وہ بھی کلیجہ تھام کر یہ کہے کہ ع

مجھے خاک میں ملا کر مری خاک بھی اڑا دے
ترے نام پر مٹا ہوں مجھے کیا غرض نشاں سے

بلند اقبال ایک عالی نسب خاندان کا چشم و چراغ تھا اور دولت اس کے گھر کی لونڈی تھی۔ ہر ایک شخص اس کے اخلاقِ حمیدہ کا دل سے گرویدہ تھا۔

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

کے اصول پر کاربند تھا۔ دوستوں کی مدارات سے اسے دلی مسرت حاصل ہوتی اس کا ذوقِ عطا کبھی شرمندۂ سوال نہ ہوتا۔

اس کے ہاں کبھی کبھی بزمِ طرب بھی گرم ہوتی۔ اسے شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے شہر میں جب کوئی نئی فلم آتی تو وہ اپنے احباب کے ساتھ ضرور دیکھنے جاتا۔ اس کے سارے ہی چلن امیرانہ تھے لیکن اس کے ساتھ جگر کے اندر ایک خلش بھی۔ لیکن اس کا علم بلند اقبال کے سوا صرف خدا کو تھا۔

گو وہ عمر کی تیئس منزلیں طے کر چکا تھا لیکن اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اور دوست احباب اُسے اکثر شادی کرنے پر مجبور کرتے رہتے تھے لیکن ان کی باتوں اور اصرار کا جواب اس کے پاس صرف ایک مسکراہٹ تھی۔

ایک روز وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ مہرِ نیم روز کی سنہری شعاعیں کھڑکیوں کے شیشوں پر پریوں کی طرح رقص کر رہی تھیں۔ کچھ ادھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ پھر وہی شادی کا تذکرہ چھڑ گیا۔

"آخر تم شادی کرتے کیوں نہیں؟" دوست نے پوچھا۔

"بھئی!" بلند اقبال نے مسکرا کر کہا "شادی کرنے کو تو عمر پڑی ہے"

"تیئس چوبیس سال کے تو ہو لئے!" دوست کہنے لگا "تو اب کیا

بوڑھے ہوکر ہی شادی کروگے ؟"

"ہاں !" بلند اقبال نے ہنس کر کہا "مجھ ایسے آدمی کو تو شادی اسی وقت کرنی چاہیئے جب عورت کی مدد کے بغیر زندگی بسر کرنی دوبھر ہو جائے "

"ذرا اس زندگی دوبھر ہونیکی تشریح بھی کر دیجئے " دوست نے کہا۔

" پہلے تم بتلاؤ کہ میں شادی کروں کس لئے ؟" بلند اقبال نے کہا۔

"بقائے نسل کیلئے " دوست نے جواب دیا۔

" یہ کچھ ضروری نہیں " بلند اقبال نے جواب دیا۔

"آئین قدرت یہی ہے " دوست نے کہا۔

"یعنی شادی کرو تو محض بقائے نسل کے خیال سے کرو " اقبال نے کہا۔

"یہی مطلب ہے نا تمھارا ؟"

"یہی " دوست نے کہا۔

" تو مجھے بقائے نسل کی ضرورت نہیں " اقبال نے جواب دیا " میں یہ تمام جائداد کسی قومی ادارے کے نام وقف کر دوں گا۔ میں اپنی زندگی کو پابند سلاسل نہیں کر سکتا "

" پابند سلاسل کیسے ؟" دوست نے پوچھا۔

"بیوی آئی تو چکر بندھ ہی پڑے " اقبال نے جواب دیا " پھر آزادی کا خدا حافظ !"

"گویا تم آزاد رہنا چاہتے ہو " دوست نے پوچھا۔

"ہاں !"

"سُنو !" دوست کہنے لگا " مرد اگر عورت کے حقوق کا پاس رکھے تو وہ کبھی اس کی آزادی میں مخل نہیں ہوتی "

" تو پھر تم نے عورت کی سرشت کا کبھی مطالعہ ہی نہیں کیا " بلند اقبال نے ہنس کر کہا۔

" اور تم نے ؟" دوست نے پوچھا۔

" مجھے تو بدقسمتی سے اس کا موقع ہی نہیں ملا " اقبال نے ہنسکر کہا۔

" بلند اقبال !" دوست کہنے لگا " مرد کی دُنیا عورت سے بنتی ہے۔ سنا نہیں کہ وقت کی راگنی اور موسم کا پھل اپنے وقت پر ہی مزا دیتا ہے۔ شباب قدرت کا ایک انمول عطیہ ہے اور عورت ایک لاجواب تحفہ۔ جس طرح مرد کی دُنیا عورت کے دمِ مسیحائی سے آباد ہوتی ہے اسی طرح زندگی محبت کی راگ سے فروغ پاتی ہے۔ اب اگر انسان جانے بوجھے ان خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ نہ اٹھائے تو یہ نہ صرف خلافِ فطرت ہی ہوگی بلکہ سوسائٹی اسے ایک گناہ متصور کرے گی۔ خدا نے تمھیں ہر وہ چیز عطا کر رکھی ہے جس سے دنیا میں وقار حاصل ہوتا ہے جس جہاں میں اعتبار ہوتا ہے۔ اب تم اپنا گھر آباد کرنے کی کوشش کرو اور پھر دیکھو کہ ازدواجی زندگی کس قدر مسرت انگیز چیز ہے "

" زندگی کی تلخ کامی کہو " بلند اقبال نے مسکرا کر کہا۔

"تلخ کامی ؟" دوست نے ہنسکر کہا ؏ "ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں" ذرا اس کوچے سے واقف ہو جاؤ پھر پوچھیں گے تم سے "

" پھر کیا ہوگا ؟" بلند اقبال نے پوچھا۔

"پھر آپ ہونگے اور گھر ہوگا " دوست نے جواب دیا۔

"تو کیا میں کولھو میں جُتا کروں گا ؟" اقبال نے پوچھا "یا چکی پیسا کروں گا ؟"

" نہ کولھو میں جُتو گے اور نہ چکی ہی پیسو گے " دوست بولا " بلکہ ایک طرف ناز ہونگے اور دوسری طرف ناز برداریاں "

" وہ کیسے ؟"

" جب شادی کر لوگے تو سب معلوم ہو جائیگا " دوست کہنے لگا " خورشید جہاں کا باپ تو صرف تمھاری ایک ہاں کا منتظر ہے "

"میری ایک ہاں کا ؟" اقبال نے جس انداز سے مسکرا کر کہا اگر کوئی سمجھنے والا ہوتا تو جان جاتا کہ اسی ایک مسکراہٹ میں اُمنگوں اور ارمانوں کی تباہی کی داستان مضمر ہے۔
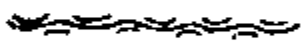
پچھلا پہر تھا اور بلند اقبال اپنی عالیشان کوٹھی کے پائیں باغ میں ٹہل رہا تھا۔ شگوفوں کا موسم تھا۔ بید مشک کی ٹہنیوں پر پھول اس طرح آئے ہوئے تھے جیسے باغ جہاں میں غلمان سبز حُلے پہنے بیٹھے ہوں۔ آڑو کے پیازی رنگ کے ننھے ننھے سے پھول مشاطۂ قدرت کی مشاطگی سے کسی عروس نو کی طرح اپنے حُسن اور پھبن پر خود بخود اترا رہے تھے۔ سبزہ کسی سرمستِ شباب کی طرح انگڑائیاں لے رہا تھا اور مٹر کے پھول کچھ اس طرح اچک اچک کر دیکھ رہے تھے جیسے تماشائی مختلف رنگوں کی پگڑیاں باندھے کسی میلہ میں تماشا دیکھ رہے ہوں۔ خیابانوں میں پانی بہ رہا تھا۔ جب ہوا کا جھونکا آتا تو پھول ٹہنیوں پر سے جھک جھک کر پانی میں اپنا عکس دیکھنے لگتے۔ ایک چھوٹی سی چڑیا شاخ نہال پر بیٹھی جھولا جھول رہی تھی۔ ایک کٹھ پھوڑا دو طہانا کسی پیڑ پر بیٹھا کھٹ کھٹ کر رہا تھا۔ اور نسترن کے سایہ میں ایک قمری اپنے لختِ جگر کو فن پرواز سکھا رہی تھی۔ لیکن اقبال کیلئے یہ اختلاطِ قدرتی محض بے کیف تھے۔ اس وقت ان رنگ رنگ کے پھولوں اور جھومتے والے اشجار کی بجائے اس کی وسعتِ نگاہ کے سامنے ایک میدان تھا لق و دق جہاں گورستان کی خاموشی مسلط تھی ایک فضا تھی لیکن مسرت سے نا آشنا۔ درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے مالی اور مالن بیٹھے راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے۔ گاہے گاہے دونوں مسکرانے لگتے۔

بلند اقبال ایک آہ بھر کر بولا۔

"بیشک دنیا عورت کے دم سے آباد ہوتی ہے۔ کیف حیات اور زندگی صرف عورت ہی کا نام ہے . . . خورشید جہاں! اس کا باپ صرف میری ایک ہاں کا منتظر! ایک ہاں!! لیکن یہ کون جانے کہ میری ایک ہاں اس پیکر محبوبی وخوبی کیلئے سامانِ بربادی بن جائیگی۔ دنیا! دنیا! دنیا!! تو کیا مجھے اس دریدہ دہن دنیا کو آخر دھوکا دینا ہی پڑیگا۔ لیکن دنیا کی خاطر موتی سے زیادہ خوش نما اور قطرۂ شبنم سے زیادہ پاکیزہ خورشید جہاں کو کس طرح ساج اور رسم ورواج کے عفریت کی بھینٹ چڑھادوں۔ ایک دوشیزہ کے جذبات! ایک حسینہ کے ارمان! ایک محبوبہ ہستی کی تمنائیں اور ایک معصوم لڑکی کی محبت خود غرضی اور نفس پرستی کی قربان گاہ پر نذر چڑھادینا کتنا بڑا ظلم ہوگا۔

دل پر ہاتھ مار کر

لیکن اس دل کا کیا کروں؟ کاش! میرے پہلو میں اس دل کی بجائے پتھر کا ٹکڑا ہوتا۔

میں شادی کیوں نہیں کرتا؟ کیا جواب دوں؟ کیا کہوں؟ یہ دولت یہ عزت اور اس پر یہ داغ! قسمت!!

بلند اقبال کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس وقت کوئی بنجارا پاس سے گذر رہا تھا۔ مالن نے اسے بلوایا اور مالی نے دو چار آنہ کی چوڑیاں بیوی کو خرید دیں۔ مالن چوڑیاں پہن کر بہت خوش ہوئی۔ جب چوڑیوں میں الاچیلا گیا تو مالی نے ادھر اُدھر دیکھکر اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

اقبال ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ سر ہلا کر بولا۔

"بیشک! عورت کو رام کر لینا کچھ مشکل نہیں۔ اگر ایک عورت دو چار بلوری چوڑیاں پاکر خوش ہو سکتی ہے تو پھر میری دولت اور امارت خورشید جہاں کی دنیا اس کیلئے فردوس نظر بنا سکتی ہے۔"

اس خیال سے اس کے چہرے پر مسکراہٹ سی کھیلنے لگی۔ دل پر سے ایک بوجھ سا اٹھتا معلوم ہونے لگا۔

"زر!" اس نے ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے کہا۔ "اگر بندے کو خدا سے ملا سکتا ہے تو پھر ایک عورت بھی مال وزر کی سحر کاریوں سے خوش رکھی جا سکتی ہے۔ بیشک! اب خورشید جہاں میرے کاشانہ کو خورشید خاوری بنکر منور کریگی۔

خورشید جہاں ایک تعلیمیافتہ لڑکی تھی۔ اسے دیکھ کر گمان ہوتا کہ شاید حسن کی دیوی خورشید جہاں کے روپ میں جلوہ نما ہے۔ خورشید والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اور بڑے ناز ونعمت سے پل کر پروان چڑھی تھی۔ دونوں گھرانوں میں رسم وراہ تھی۔ بلند اقبال اور خورشید جہاں کا جب کبھی آمنا سامنا ہوتا تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھکر مسکرا دیتے۔ گو بات کرنیکا تو قسمت سے ہی موقع ملتا لیکن نظروں نظروں ہی میں محبت کے پیام وسلام ہو جاتے۔

اکثر گھرانوں سے خورشید جہاں کیلئے پیام آتے رہتے تھے لیکن خورشید کے باپ کی نظر انتخاب بلند اقبال پر پڑ چکی تھی۔ لیکن اقبال کی مسلسل خاموشی اس کیلئے ایک معمہ تھا۔ ہاں! جب اسکی طرف سے شادی کا پیغام پہنچا تو گھرانے میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اور پھر وہ روز سعید بھی آیا جب خورشید جہاں دلھن بنکر اقبال کے گھر آئی۔

ڈرائنگ روم میں دُلھن ایک صوفہ پر بیٹھی تھی اور دو چار عورتیں اس کے پاس بیٹھی ہنسی مذاق کی باتیں کر رہی تھیں۔ لیکن جب اقبال آیا تو یہ عورتیں پاس سے اٹھکر چلی گئیں۔ اور خورشید بھی ذرا سمٹ کر ہو بیٹھی۔ وہ بھی اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تو نگاہِ شوق سے بیوی کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کا دستِ حنا مالیدہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان جواہر نگار انگشتریوں کو جو اس کی پتلی پتلی انگلیوں میں جگنو کی طرح چمک رہی تھیں دیکھنے لگا۔ پھر دوسرے ہاتھ سے دُلھن کی ٹھوڑی ہلا کر بولا:۔

"خورشید جہاں!"

لیکن دُلھن نے کچھ جواب نہ دیا۔

"دیکھو جی!" بلند اقبال اس کا ہاتھ دبا کر کہنے لگا "تعلیم کا یہ ہرگز منشا نہیں کہ بیوی اپنے میاں سے یوں حجاب کرے۔ میں نے تو سنا تھا کہ تم بہت تعلیمیافتہ ہو۔ لیکن خیر! معلوم شد بافندگی۔"

یہ سنکر خورشید جہاں زیر لب ذرا مسکرا دی۔

"اجی جناب!" اقبال نے اس کے زانو کو ذرا دبا کر کہا "میں یہ گونگ اشارے نہیں سمجھ سکتا۔ انسان اظہار محبت کیلئے بھی مسکراتا ہے اور نفرت کے اظہار کیلئے بھی۔ کچھ ہوں ہاں تو کیجئے۔"

لیکن جواب نہ ملا۔ تو اس نے دُولھن کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ اور وہ گردن جھکا کر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسی کشمکش میں دوپٹہ ذرا سے سرک گیا۔ اقبال جھومر دیکھکر بولا:۔

"واللہ یہ جھومر تو تمہارا ماتھے چاند کی طرح چمک رہا ہے۔"

پھر ہنسکر:۔

"لالچ کی بھی حد ہو گئی۔ خورشید! یہ پانچ سات ہار جو تم نے گلے میں ڈال رکھے ہیں ان کا بوجھ تو محسوس نہ ہوتا ہوگا۔ ایسی خوبصورت اور صراحی دار گردن

اور اس میں سیر بھر سونا۔ ارے توبہ! کیا کہنے ہیں اس شوق کے!!

لیکن خورشید نے اب بھی جو جواب نہ دیا تو اقبال اس کے اور بھی پاس ہو بیٹھا۔ اور کہنے لگا۔

"یوں تو آپ بولنے سے رہیں۔ اب کوئی اور ہی تدبیر کرنی پڑے گی"

یہ کہہ کر اس نے اس کے تلووں میں جو گدگدی کرنی چاہی تو خورشید نے پاؤں اور بھی سمیٹ لئے۔ اقبال نے اب اس کی بغل کی طرف جو ہاتھ بڑھایا تو خورشید نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اقبال کچھ ایسے ہی چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن جب خورشید نے ہاتھ نہ چھوڑا تو ہنس کر بولا "خورشید! توبہ ہے! یہ اتنی طاقت کہاں سے آگئی تم میں۔ بھئی! میرا ہاتھ چھوڑ دو"

"چھڑا لیجئے" خورشید نے ایک نگاہ غلط انداز سے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شکر ہے!" اقبال نے اس کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ع

"کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے!"

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے سونے کی بیضوی شکل کی ایک نہایت خوبصورت اور نفیس رسٹ واچ نکالی اور بیوی کی کلائی پر باندھ کر پوچھا:۔

"فرمایئے! یہ تو پسند ہے؟"

"معلوم نہیں!" خورشید نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"کچھ نقص ہے اس میں؟" اقبال نے پوچھا۔

"معلوم نہیں!" خورشید نے پھر اسی انداز سے جواب دیا۔

"پھر پسند کیوں نہیں؟"

"معلوم نہیں!"

اقبال نے ایک آہ بھر کر بیوی کا ہاتھ تو چھوڑ دیا اور بولا۔

"یہ گھر تو پسند آیا؟"

"معلوم نہیں!" خورشید نے پھر اسی طرح زیر لب مسکرا کر کہا اور ساتھ ہی جمائی بھی لی۔

"نیند آرہی ہے آپ کو!"

لیکن خورشید نے پھر ایک دلکش ادا سے سر ہلا کر کہا:۔

"معلوم نہیں!"

"خورشید!" اقبال ہنس کر کہنے لگا "وہ طوطے والا قصہ تو یاد ہی ہوگا۔ جسے دریں چہ شک کے سوا اور کچھ آتا ہی نہ تھا۔ اسی طرح آج یہ بھی معلوم ہوا کہ ہماری بی مینا بھی 'معلوم نہیں' کہنے کے سوا اور کچھ جانتی ہی نہیں"

خورشید جہاں کو ہنسی سی آگئی۔ لیکن یہ ہنسی کیا تھی ایک کلی تھی جو کھل گئی تھی۔

"خورشید!" اقبال نے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا "آج خدا نے ہماری دیرینہ آرزو پوری کی ہے۔ تم بھی تو خوش ہوگی"

خورشید نے ایک نگاہ نیم باز سے شوہر کی طرف دیکھا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کچھ جواب دے اقبال نے ہنس کر کہا "دیکھو جی! اب میں وہی 'معلوم نہیں' ہرگز نہیں سنوں گا"

"جس کی آرزو پوری ہوئی ہوگی خوش بھی وہی ہوگا" خورشید نے ذرا لپک کر جواب دیا۔ یہ لپکنا کیا تھا گل کی ٹہنی تھی جو بل گئی تھی۔

"اچھا!" اقبال نے اس اچھا کو ذرا لمبا کر کے اور سر ہلا کر کہا "تو تم تو خوش نہیں؟"

"آخر خوش ہونے کی کوئی وجہ بھی تو ہو" خورشید نے ذرا ترچھی چتونوں سے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"واہ صاحب واہ!" اقبال نے بیوی کے زانو پر ہولے سے ہاتھ مار کر کہا۔

"یہ ہاتھ سنبھالئے اپنا!" خورشید نے شوہر کا ہاتھ جھٹک کر کہا "میرا زانو طبلہ نہیں"

"غلطی ہوئی معاف کر دو" اقبال نے ذرا اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا "کہو بھی دو خورشید معاف کیا"

لیکن جب خورشید نے جواب نہ دیا تو اقبال نے کہا۔

"معاف نہ کرو گی؟"

خورشید جہاں نے ایک نگاہ غلط انداز سے شوہر کی طرف دیکھا اور کہا "نہیں"

ساتھ ہی ایک موج تبسم اس کے لب لعلیں پر رقص کرنے لگی۔

"اچھا صاحب!" اقبال نے بناوٹ سے آہ بھر کر کہا "نہ معاف کیجئے۔ ع

ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو!

اچھا میری بات کا تو جواب دیجئے!"

"کیا؟"

"تم خوش ہو کہ میں تمہارے پاس بیٹھا ہوں"

"اس میں میرے خوش ہونے کی کیا بات ہے؟" خورشید نے کہا۔

"میرے خیال میں!" اقبال بولا "ہر عورت یہی چاہتی ہے کہ اس کا شوہر اس کے پاس بیٹھا ہو"

"اس قسم کی فضول خواہشیں آپ مردوں ہی کو ہوا کرتی ہیں" خورشید نے جواب دیا۔

"فضول خواہش!" اقبال نے پوچھا "وہ کیسے جناب؟"

"یہ سب بکھیڑے بھی تو اسی فضول خواہش کا نتیجہ ہیں" خورشید نے کہا
"کیسے بکھیڑے خورشید؟" اقبال نے پوچھا۔
"یہی!" خورشید نے ذرا مسکرا کر اور شوہر کی طرف دیکھ کر کہا۔
"سمجھ گیا!" اقبال نے ہنس کر کہا "لیکن یہ تو عین فطرت کے مطابق ہے"
"کیا؟" خورشید نے پوچھا۔
"دنیا مرد اور عورت سے بنتی ہے" اقبال نے جواب دیا۔
"اللہ میاں کو دنیا آباد کرنی ہوتی تو آپ کو جنت میں رہنے کو جگہ نہ دی ہوتی" خورشید نے ہنس کر کہا۔
"اجی فلسفی صاحب!" اقبال نے اسے اپنے آغوش میں لیتے ہوئے کہا "لیکن اس کی بھی تو داد دیجئے کہ خدا سے مانگا بھی تو کیا مانگا"
"خود غرضی بھی تو اسی کا نام ہے" خورشید نے کہا۔
"پھر شادی کرنا بھی خود غرضی ٹھیرا؟" اقبال نے کہا۔
"اس میں شک ہی کیا ہے" خورشید نے مسکرا کر جواب دیا "اپنے آرام کیلئے دوسرے کو مصیبت میں ڈالنا خود غرضی نہیں تو اور کیا ہے"
"یہ الٹی گنگا بہانی بس کوئی تم سے ہی سیکھے" اقبال نے جواب دیا "غریب مرد تو عورت کے آرام کیلئے جوکھوں میں پڑتا ہے اور لیجئے یہاں انعام کیا مل رہا ہے۔ حد ہوگئی آپکی قدردانی کی بھی"

اس وقت اس سنہری کلاک نے جو مینٹل پیس کے اوپر شیشہ کے گلوب میں رکھا تھا گیارہ بجائے۔ خورشید نے ایک جمائی لی۔
"او ہو!" اقبال بولا "تمہیں تو نیند آرہی ہے"
یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا اور جب بیوی کو بھی ہاتھ پکڑ کر صوفہ پر سے اٹھانا چاہا تو وہ ذرا تن کر بیٹھ گئی۔ اقبال نے جھوٹے سے ذرا زور لگایا لیکن خورشید پھر بھی جو نہ اٹھی تو یہ کہتے ہوئے کہ "ایک خطا تو بھی معاف نہیں ہوئی دیکھیں اب اس دوسری پر کیا سزا ملتی ہے؟"
وہ جھک کر جو اسے گود میں لینے کی کوشش کرنے لگا تو خورشید خود ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور کبک کی طرح قدم قدم پر جھومتی ہوئی شوہر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے حجلۂ عروسی میں آئی۔ آج اس کمرہ میں بلور کے مختلف رنگوں کے فانوسوں میں موم بتیاں جل رہی تھیں۔ ایک خوبصورت پلنگ پر پُر تکلف بستر ہو رہا تھا۔ اور حسن کے پھولوں کی نازک نازک پنکھڑیاں بستر پر بکھری ہوئی تھیں۔ ان کی خوشبو سے مشامِ جان تازہ ہو رہی تھی۔ اقبال نے بیوی کو پلنگ پر بٹھا دیا۔ اور خود ایک کرسی کھینچ کر پاس ہو بیٹھا۔
سامنے کی دیوار پر ایک تصویر تھی۔ ایک حسین عورت ایک جوان مرد کو شراب پلا رہی تھی۔ عورت کے ایک ہاتھ میں صراحی اور دوسرے میں جام تھا۔ اس میں شعلۂ ناب چھلک رہی تھی۔ مرد کہنی کی ٹیک لگائے ہوئے قالین پر لیٹا ہوا تھا۔ اور ایک ہاتھ جام کی طرف بڑھا رکھا تھا۔
"خورشید!" اقبال نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ہے خواب زندگی کی تعبیر"
اب خورشید نے بھی تصویر کی طرف دیکھا۔ پھر مسحور کن نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھ کر ذرا مسکرا دی۔ اقبال بولا۔
"خورشید! یہ تصویر ہمیں پیامِ حیات دے رہی ہے۔ بھلا غور تو کرو کہ ایک مرد کے لئے اس سے زیادہ مسرت کی اور کیا گھڑی ہوگی کہ ایک محبوبۂ طناز اپنے نازک ہاتھوں سے شراب پلائے۔ وہ شراب جس سے کیفِ حیات حاصل ہوتا ہے۔ وہ کیف جو جذبات کو پیغامِ بیداری دیتا ہے۔ وہ بیداری جس سے دل کو راحت ملتی ہے۔ وہ راحت جس سے زندگی کے مقصد کی تکمیل ہوتی ہے اور لذتِ شباب سے آشنا اور وہ لذتِ شباب جس سے خیالات میں رنگینی پیدا ہوتی ہے"
اقبال نے یہ الفاظ ایک ایک کرکے کہے۔ خورشید نے مسکرا کر کہا۔
"ہو چکی شاعری؟"
"خورشید!" اقبال بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بولا "جب شباب ہو اور محبت کامراں ہو اور دل میں امنگ ہو اور امنگ کو ابھارنے والا محبوب جاں نواز پہلو میں ہو۔ اور جب ہمائے سعادت سر پر منڈلا رہا ہو۔ اور خوابوں کی دنیا آباد کرنے والا پیکرِ خوبی و محبوبی اقبال کی بلندیوں اور آرزو کی مرادمندیوں کا مژدۂ جانفزا اپنے لبِ لعلیں سے نہ سہی اپنی نرگسی آنکھوں سے ہی دے رہا ہو۔ اس وقت اگر کوئی گناہ بھی کر لیجئے تو کوئی گناہ نہیں"

یہ کہکر اقبال اٹھکر کھانے والے کمرہ میں گیا اور شراب کی بوتل اور ایک بلوری گلاس اٹھا لایا۔ خورشید نے کچھ سہمی سہمی نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا۔ اقبال نے کرسی پر بیٹھکر بوتل کھولی اور تھوڑی سی شراب گلاس میں ڈالکر بلوری صراحی میں سے جو پلنگ کے پاس ہی ایک میز پر رکھی تھی اس میں پانی ملایا۔ اور گلاس ہلا کر بولا:-
"خورشید بتلاؤ تو اس میں کیا ہے؟"
خورشید نے کچھ جواب نہ دیا۔ اقبال ہنس کر کہنے لگا۔
"خورشید! اس گلاس میں میری آرزو، میری امید، میرے شوق اور تمناؤں کو لذتِ خواب سے آشنا کرنے والا جوہر ہے۔ وہ جوہر جس سے زندگی پریشانیوں اور تکلفات سے نجات پاتی ہے۔ اس جوہر کے پینے سے دل میں

ایک ایسا مرد پیدا ہوتا ہے جو کم و کیف جات سے بے پرواہ کر دیتا ہے۔" یہ کہہ کر اقبال نے گلاس منہ سے لگایا اور خورشید کو ایسا معلوم ہونے لگا گویا اس کے آئینۂ دل پر غبار سا چھا رہا ہے۔

اقبال پے در پے تین چار گلاس پی گیا۔ شراب تند تھی اور پینے والا ناتجربہ کار۔ اسے قے پر قے ہونے لگی۔ لیکن حالت یہ تھی کہ ادھر قے ہوئی اُدھر اور پی لی۔ اسی طرح پیتے پیتے وہ کرسی پر سے لڑھک کر فرش پر گرا۔ بوتل ہاتھ سے چھوٹ گئی اور تن بدن کی سدھ نہ رہی۔ خورشید جہاں شوہر کی یہ حالت دیکھ کر پلنگ پر بیٹھی اپنی قسمت پر آنسو بہا رہی تھی۔ آج اس کے لئے بستر کا ہر تار خار بستر بنا ہوا تھا۔

بہت سے لیل و نہار اسی طرح گذر گئے۔ خورشید کے آرام کیلئے دولت جو کچھ مہیا کر سکتی تھی سب موجود تھا۔ لیکن اقبال دیکھتا تھا کہ اس کے دل کی کلی مرجھائی سی رہتی ہے۔ اُسے خورشید سے والہانہ محبت تھی۔ اُسے اپنی بیوی کے حُسن جمال پر ناز بھی تھا۔ لیکن وہ یہ سمجھ چکا تھا کہ محض دولت کی فراوانی عورت کو خوش نہیں کر سکتی۔ دن تو جس طرح کٹتا سو کٹتا لیکن ادھر رات ہوئی اور اُدھر وہی ع

ابھی تو شغلِ شراب میں ہوں!
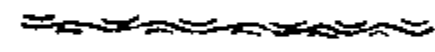
ایک روز دونوں ایک حوض کے پاس پیڑوں کے سایہ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ آسمان پر ہلکی ہلکی بدلیاں چھائیں تھیں۔ سورج جب چہرے پر سے ان بدلیوں کی نقاب الٹ دیتا تو پانی پر گمان ہونے لگتا کہ نیلگوں آسمان پر سے کوثر کا عکس چھن چھن کر آرہا ہے۔ کہیں سے قمریوں کا ایک جوڑا حوض کے کنارے پر آبیٹھا۔ دونوں نے پانی کے دو دو قطرے پئے اور پھر ایک دوسرے سے اختلاط کرنے لگے۔ لالہ ریز زمین اور عطر بیز ہواؤں کے اثر سے دونوں کو جام زندگی سے سیری سی معلوم ہوتی تھی۔ خورشید جہاں پیالی پکڑے قدرت کی ان حسین تصویروں کو دیکھ رہی تھی اور اقبال اپنی بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کس خیال میں ہو خورشید؟" اقبال نے بیوی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کچھ نہیں!" کہتے ہوئے خورشید نے پیالی منہ سے لگالی۔

"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے!" اقبال نے مسکرا کر کہا۔

"اب پردہ داری کیسی؟" خورشید نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پردہ تو آپ نے پہلے روز ہی اٹھا دیا!"

اقبال نے ایک آہ بھری اور اس کی مرصع چوڑیوں کو اوپر نیچے پھیر کر بولا۔

"میری مجبوریاں ۔۔۔۔"

لیکن خورشید بات کاٹ کر بولی۔

"ہاں! انسان عادت سے مجبور ہو ہی جاتا ہے۔"

"عادت!" اقبال نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "شراب پینے کی! تمہارے سر کی قسم نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔"

"تو پھر آپ نے منت مانی ہوگی؟" خورشید طنزاً بولی۔

"خورشید!" اقبال نے پھر آہ بھر کر کہا: "منت نہیں! بلکہ محض نامرادیوں کی تلخ کامی سے بچنے کیلئے پیتا ہوں۔"

"نامرادیوں کی تلخی!" خورشید نے چائے دانی پر سے ٹی کوزی اٹھاتے ہوئے کہا: "اور خانہ بربادیوں کا ماتم!"

"سچ ہے!" اقبال بولا: "دنیا کی خاطر ذلیل ہونے کی یہی سزا ہونی چاہیئے۔ ایک معصوم دوشیزہ کی زندگی برباد کرنے پر جتنا بھی عذاب ملے کم ہے۔ خورشید! میری خستہ سامانیوں کا ماتم اب میری وہ حسرت کرے گی جس حسرت کے میرے سینہ پر داغ ہیں۔"

"خیر!" خورشید نے پیالی میں شکر ملاتے ہوئے کہا: "شراب نے آپ کے خیالات کو رنگین تو خوب بنا دیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ مسکرائی اور اقبال نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں بلکہ مجھے سیلِ حوادث کے تھپیڑے کھانے کے قابل بنا دیا ہے! میرے تفکرات اور پریشانیوں کا بس یہی ایک علاج ہے۔"

"لیجئے!" خورشید نے پیالی بڑھاتے ہوئے کہا: "چائے تو پیجئے۔"

"خورشید!" اقبال بولا: "میں خونِ دل پیتا ہوں۔ کیونکہ ۔۔۔"

"کیونکہ" خورشید نے بات کاٹ کر کہا: "مجھ ایسی منحوس آپ کے پلے پڑی!"

"ایسا مت کہو خورشید!" اقبال بیوی کی طرف دیکھ کر بولا: "پہلے تم میرے خوابوں کی دنیا آباد کیا کرتی تھیں۔ اب تم سے میرے کاشانۂ دل کی رونق ہے۔ پہلے آنکھ تمہیں دیکھنے کو ترستی تھی۔ اب آنکھ تمہاری دید کو عبادت سمجھتی ہے۔"

"یہ تو آپ نے سچ کہا" خورشید نے ذرا مسکرا کر کہا: "برہمن بھی تو دنیا کو دھوکا دینے کیلئے بت کو پوجتا ہے حالانکہ دل میں خوب سمجھتا ہے کہ ان مٹی کے خداؤں میں نہ تو توفیقِ جزا ہے اور نہ سزا دینے کی قدرت۔"

"تمہیں حق ہے خورشید" اقبال نے ایک آہ بھر کر کہا: "جو چاہو کہہ لو۔"

"یہ حق کی بھی آپ نے ایک ہی کہی" خورشید نے شوہر کی طرف دیکھ کر

ہوئے جواب دیا۔" اگر میرا بھی کچھ حق ہوتا تو پھر یہ رازداریاں بھی مجھ سے نہ ہوتیں، آپ کو ایک عورت ایک ایسی عورت جو آپکی لونڈی بن چکی ہے کے احساسات، تفکرات یا جذبات کا بھی کچھ خیال ہوتا۔ یہ نہیں کہ دن گپ شپ میں گذرا اور رات شغلِ شراب کی نذر ہوگئی۔ سنئے! جس طرح وہ ڈالی جو خزاں کے موسم میں ٹوٹ جائے اثر بہار سے کبھی ہری نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح اگر عورت ایک دفعہ بدگمانیوں کا شکار ہوجائے تو پھر مرد اگر فرشتہ بھی بن کر دکھائے تو بھی اسے یقین نہیں آسکتا۔ آپ نے مجھے ایک مدت سے تذبذب میں ڈال رکھا ہے لیکن آپ نے کبھی اتنا بھی سوچا کہ آپ کی یہ گنگ اشارتیں مجھے کیسے کیسے مغالطے میں ڈال رہی ہونگی۔ میرا دل کیسے کیسے خیالات کا آماجگاہ بن رہا ہوگا!"

یہ کہنے کے ساتھ ہی خورشید کی نرگسی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اور اقبال نے سر جھکا لیا۔

کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ آخر اقبال نے سر اٹھا کر بیوی کی طرف دیکھا اور کہا:۔

"خورشید! تم ایک ایسے بدبخت کے پلے پڑی ہو جو عورت کی محبت کے قابل نہیں۔ ایک دنیا کے تقاضوں سے تنگ آکر ...... نہیں! نہیں! تمھاری محبت نے مجھ سے ایک ایسے گناہ کا ارتکاب کرایا جس کے لئے میں خدا کا بھی گنہگار اور تمھارا بھی!"

یہ کہنے کے ساتھ اقبال کی آنکھوں سے اشکِ ندامت ٹپکنے لگے خورشید صورت تصویر خاموش بیٹھی شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی! اقبال بھرائی ہوئی آواز سے بولا۔

"مجھے معاف کردو خورشید! اب میری لاج تمھارے ہاتھ میں ہے!"

خورشید نے ایک لانبا سانس لیا اور بولی:۔

"میں تو آپ کی کنیز ہوں لیکن آخر کچھ میرا بھی آپ پر حق ہے!"

"حق!" اقبال نے اپنی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا "خدا کی قسم! تمھیں خوش دیکھنے کیلئے اگر مجھے اپنی جان بھی قربان کرنی پڑے تو انشاء اللہ کبھی تاخیر نہ کروں گا!"

"آپ کی جان آپ کو سلامت رہے!" خورشید بولی "مجھے اتنی بڑی قربانی کی ضرورت نہیں۔ میری تو ایک معمولی سی درخواست ہے!"

"کیا؟" اقبال نے پوچھا۔

"آپ پہلے ماننے کا وعدہ کریں!" خورشید بولی "پھر کہونگی!"

"تمھارے سر کی قسم!" اقبال بولا "جو کہو منظور ہے!"

"تو پھر آپ شراب پینی چھوڑ دیجئے!" خورشید نے کہا "مجھے اس سے سخت نفرت ہے!"

"بس آج سے میرے لئے حرام ہے!" اقبال نے اپنی بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

جانے خورشید کے دل میں کیا آئی وہ مسکرا کر بولی۔

"لیکن جناب! ع چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی!"

"بس آج سے چھوٹ گئی!" اقبال بولا "خورشید! میں تو اپنی ندامت کی پردہ پوشی کیلئے صرف پیتا تھا!"

"ندامت کی پردہ پوشی!" خورشید نے مسکرا کر شوہر کی طرف دیکھا اور کہا "باتیں بنانی آپ کو خوب آتی ہیں!"

اور اقبال نے بیوی کا نرم اور نازک ہاتھ چوم کر کہا۔

"خورشید! خدا کی قسم! ع
دہی مجکو عیشِ دوام ہے جو کرے تو ایک نظر کرم خوش!"

〰〰〰

اقبال کو شکار کا بہت شوق تھا۔ اس نے خورشید کو بھی بندوق چلانا سکھادی۔ اب میاں بیوی دونوں شکار پر جاتے۔ کبھی دو دو چار روز جنگل میں قیام رہتا۔ لیکن خورشید کے دل کی کلی مرجھائی سی رہتی۔ اقبال کو سواری کا شوق تھا۔ اس نے خورشید کیلئے بھی ایک عربی گھوڑا خریدا۔ اور اسے گھوڑے کی سواری سکھلائی۔ پھر سواری کیلئے لباس بنوائے۔ اب دونوں میاں بیوی گھوڑوں پر سوار ہوکر علی الصبح سیر کو بھی جاتے۔ لیکن خورشید کا غنچۂ دل شگفتہ نہ ہوتا۔ شادی سے پہلے بھی اقبال کے پاس ایک چھوڑ دو موٹریں تھیں لیکن خورشید کی خاطر اس نے ایک اور موٹر خریدا۔ یہ موٹر خورشید ہی چلایا کرتی تھی۔ اور کبھی نقاب ڈال کر خرید و فروخت کیلئے شوہر کے ساتھ بھی جاتی۔ لیکن چہرے پر اداسی کی جو وہ ایک جھلک تھی چھپائے نہ چھپتی۔ اقبال اکثر اپنے دوستوں کو کبھی چاء پر اور کبھی کھانے پر مدعو کیا کرتا تھا۔ لیکن اب دوستوں کو ایسا موقع تو شرت سے ہی میسر ہوتا۔ لیکن خورشید کی ملنے جلنے والیاں عموماً آتی جاتی رہتیں۔ لیکن وہ شگفتگی جو ایک جوان عورت کا زیور ہوتی ہے مفقود تھی۔

〰〰〰

ایک روز دونوں کھانا کھارہے تھے کہ خادم نے چاندی کی طشتری میں دو کارڈ رکھ کر پیش کئے۔ گورنر کو پارٹی دی جانی تھی۔ یہ اسی پارٹی کے کارڈ تھے۔ ایک اقبال کے نام تھا اور دوسرے پر مسز اقبال لکھا ہوا تھا۔ خورشید اپنا نام دیکھ کر بولی:۔

"لو! یہ اچھی رہی!"

"کیا؟" اقبال نے پوچھا۔

"یہ کسی نے میرے نام بھی ایک کارڈ بھیج دیا ہے!" خورشید نے ذرا

مسکرا کر کہا۔

"پھر تو بہت اچھا ہوا!" اقبال نے کہا "ورنہ مجھے خود منگوانا پڑتا"۔

"تو کیا اب میں پارٹی میں بھی جاؤنگی؟" خورشید نے تعجب سے پوچھا۔

"تو اس میں ہرج ہی کیا ہے" اقبال نے جواب دیا "اور عورتیں بھی تو ہونگی"۔

"لیکن وہ پردہ بھی تو نہیں کرتیں" خورشید بولی۔

"اور تم بھی تو نہیں کرتیں!" اقبال نے ہنسکر جواب دیا۔

"سبحان اللہ!" خورشید ایک دلکش ادا سے شرما کر بولی۔

"ماشاء اللہ!" اقبال نے بیوی کی طرف دیکھکر کہا "کیا حسن ہی کیا زیبائش ہی کیا رعنائی ہے، کیا . . . . "

"کیا حماقت ہے" خورشید بات کاٹ کر بولی۔

"کیوں جی!" اقبال نے پوچھا "اس میں حماقت کی کیا بات ہے؟"

"یہی!" خورشید بولی "کہ آپ مجھے غیر مردوں کے سامنے جانیکو کہہ رہے ہیں"۔

"معاف کر دیجئے!" اقبال ہنسکر کہنے لگا "بھول ہوگئی۔ آپ اور غیر مردوں کا سامنا۔ اجی توبہ! ہاں! ان دو خدمتگاروں کا تو ذکر ہی کیا، چونکہ آپ کے ملازم ہیں اس لئے ان کا تو غیر مردوں میں شمار ہی نہیں۔ اسی طرح دونوں شوفر بھی آپ کے یہاں نوکر ہیں اس لئے انھیں بھی کوئی غیر مرد نہیں کہہ سکتا۔ اب رہے دومالی سو وہ آپ سے تنخواہ پاتے ہیں لہٰذا انھیں بھی غیر مرد نہیں کہا جا سکتا۔ پھر باورچی ہے، چوکیدار ہے، گھسیارے ہیں، گوالا ہے، دھوبی اور مہتر ہے، یہ چونکہ سب آپ کی سرکار میں ملازم ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ یہ بھی غیر مرد نہیں ہوسکتے۔ غیر تو بس ہمارے ہی دوست ہیں۔ اس لئے ان سے پردہ کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ ان میں سے اگر کوئی آپ کو دیکھ پائے تو بس ہماری تو ناک ہی کٹ جائے"۔

خورشید ہنسکر بولی۔

"آپ کی ناک کٹنے کا سوال نہیں۔ سوال تو خاندان کی عزت کا ہے"۔

"خورشید!" اقبال نے مسکرا کر کہا "کیا پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہو میری جان!

آنکھ کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا!"

"خدا آنکھ لیے یا نہ رہے" خورشید نے ہنسکر کہا۔

دونوں میں اسی طرح ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ آخر خورشید نے پارٹی میں شامل ہونیکا وعدہ کر لیا۔

گورنر کی پارٹی میں خورشید جہاں اس شان سے گئی کہ بس ع

تھیں تم ہو خدا رکھے نظر پڑتی ہے عالم کی!

ہزار بارہ سو کا مجمع تھا۔ باغ میں جابجا میزیں لگی تھیں۔ چار چار پانچ پانچ مل کر بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ اقبال اور خورشید بھی ایک صنوبر کے سایہ میں کرسیوں پر جا بیٹھے۔ یہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ اقبال کے دو دوست بھی آگئے ان میں سے ایک احسن اور اس کی بیوی ثریا تھی جو خورشید کی سہیلی تھی۔ دوسرا محسن ایک نوجوان بیرسٹر تھا۔

اتنے بڑے مجمع میں شامل ہونیکا خورشید کو چونکہ پہلا موقع تھا اس لئے وہ ذرا شرمائی سی بیٹھی تھی۔ اور ثریا اس کا خوب مذاق اڑاتی۔ ان لوگوں سے تھوڑے ہی فاصلہ پر چار اور جوان کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ اُن کی نگاہیں خورشید پر جمی ہوئی تھیں۔ اُن میں سے ایک نے کہا:۔

"کیا حسن ہے"

اور دوسرا بولا:۔

"حسن تو ہے لیکن عزت نہیں"

"کون لے گیا عزت؟" پہلے نے پوچھا۔

"یہ آپ کا مغربی تمدن" دوسرے نے جواب دیا۔

اور تیسرا بولا:۔

"کم از کم اقبال سے تو یہ توقع نہ تھی"

اور چوتھے نے کہا:۔

"ہاں اچھا شریف گھرانا تھا"

"کون لے گیا شرافت؟" پہلے نے پھر کہا۔

"فیشن کی نذر ہوگئی" دوسرے نے جواب دیا "دیکھ لو یہی خورشید ہے جو سات پردوں میں رہتی تھی اور آج تماشہ بنی بیٹھی ہے"

اُدھر ثریا خورشید سے کہہ رہی تھی:۔

"بھیگی بلی کیوں بنی بیٹھی ہو؟"

پاس سے احسن بولا:۔

"گرفتار ہی تو ہیں"

"مجمع عام میں آنے سے حجاب کیسا؛ کوئی ننگ تو جانا نہیں" بیرسٹر صاحب نے کہا۔

اِدھر وہی پہلا کہہ رہا تھا:۔

"یہ پردہ ہی تو ہم لوگوں کے تنزل کا باعث ہے"

اور دوسرے نے کہا: "اور یہی بے غیرتی ہی تو ہماری تباہی کا پیش خیمہ ہے"

"بہرکیف!" اب تیسرے صاحب کہنے لگے:۔ "اقبال کی پسند کی داد دینی چاہیئے"

"داد لینے ہی تو بیوی کو مجمع عام میں لایا ہے" پہلے نے کہا۔

"بے غیرتی کی بلا دُور!" چوتھے نے ذرا ہنسکر کہا۔

"میرے یار!" پہلا بولا: "دیکھ لیجیو۔ ایک دن یہ تمہارا پردہ داستان ہو کر رہ جائیگا"

اور چوتھے نے مسکرا کر کہا:۔

"انشاء اللہ! پھر تو
تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں"

اُدھر احسن صاحب اقبال سے کہہ رہے تھے:۔

"یہ آپ کس سوچ میں بیٹھے ہیں؟"

"ذرا دُنیا کا رنگ دیکھتا ہوں" اقبال نے جواب دیا۔

اور محسن صاحب فرمانے لگے:۔

"جانے یہ لوگ خورشید کو آج یہاں دیکھکر کیا خیال کر رہے ہونگے؟"

"لوگ جو چاہیں خیال کریں" ثریا بولی "لیکن میری تو ایک دیرینہ آرزو آج پوری ہوگئی"

"کیا آرزو تھی آپکی؟" احسن نے بیوی سے پوچھا۔

"یہی!" ثریا بولی "کہ خورشید بھی میرے ساتھ جلسوں میں شامل ہوا کرے"

اور محسن نے کہا:۔

"آزادی سے بہتر دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا مسٹر اقبال؟"

خورشید صرف مسکرا دی۔

"غضب تو یہ ہے" محسن نے کہا "کہ عورت کی نسوانی کمزوری کبھی اسکا پیچھا چھوڑتی ہی نہیں"

"اجی جناب!" ثریا بولی "یہ ہندوستان ہی یورپ نہیں"

"جی ہاں!" محسن نے ہاں کو ذرا لامبا کر کے کہا "مجھے بھی معلوم ہو کر میں ایک غلام ملک میں بیٹھا ہوں"

"او ہو!" اقبال نے ہنسکر کہا "کب معلوم ہوا آپ کو؟"

اور احسن بولا:۔

"یورپ جا کر ہی آنکھیں کھلی ہونگی۔ کیوں محسن!"

"جی ہاں!" محسن کہنے لگا "یورپ سے واپس آکر ہی اپنی ذلت اور عورت کی بیکسی کا احساس ہونے لگا ہے"

اب اقبال بولا۔

"اس ذلت اور بیکسی کا ذمہ دار کون ہے؟"

"ہم لوگ!" محسن نے جواب دیا۔

"اور اس کا علاج؟" اقبال نے پوچھا۔

"پہلے عورت کو آزادی دیجئے" محسن نے کہا "پھر اس معاشرت کو قبول کیجئے جو مہذب قوموں کا چلن ہے"

"یعنی!" اب احسن نے ہنسکر کہا "پہلے اسلام کو سلام کیجئے۔ پھر کرسٹان ہو جائیے۔ یہی مطلب ہے نا تمہارا محسن؟"

محسن بولا:۔

"اسلام چھوڑنے کا سوال نہیں۔ سوال آزادی کا ہے۔ اور آزادی جس قیمت پر بھی ملے۔ ضرور لینی چاہیئے"

چائے ختم ہو چکی تھی۔ لوگ اِدھر اُدھر گھومنے لگے تھے۔ اقبال کرسی سے اٹھا اور بولا "چلو چھوڑو اس بحث کو۔ آؤ ذرا ہم بھی سیر کریں"

ان واقعات کو بہت روز گذر چکے تھے۔ ثریا خورشید کی نامرادیوں کے راز سے واقف ہو چکی تھی۔ محسن کا اقبال کے ہاں آنا جانا کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ خورشید کو اس کی باتوں میں لطف بھی بہت آتا۔ لیکن احسن کو محسن کا خورشید سے یوں بیجا ملنا کچھ پسند نہ تھا۔ اور وہ کبھی کبھی ثریا سے اس کا ذکر بھی کرتا۔ احسن کو بھی شکار کا بہت شوق تھا۔ اقبال اور احسن دونوں مل کر شکار جایا کرتے تھے۔ لیکن جب خورشید اقبال کے ساتھ جانے لگی تھی۔ احسن کا ساتھ چھوٹ گیا تھا۔

اِدھر محسن سے ملاقات ہونے سے خورشید میں تغیر سا پیدا ہو چلا تھا۔ محسن کے آتے ہی خورشید اور محسن کے درمیان آزادی اور مغربی تعلیم اور تمدن پر بحث شروع ہو جاتی۔ اقبال خاموش بیٹھا دونوں کی باتیں سنتا۔ اور کبھی یہ کہکر کہ "پاگلوں میں بیٹھکر انسان پاگل ہی ہو جاتا ہے" پاس سے اٹھ جاتا۔

ایک روز احسن، محسن اور ثریا خورشید کے یہاں کھانے پر مدعو تھے۔ محبت پر بحث شروع ہو گئی۔ احسن کا نظریہ یہ تھا کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے محبت کئے بغیر بھی پُر لطف زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ لیکن محسن کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ اس کی رائے میں ازدواجی زندگی کا لطف اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک طرفین میں محبت نہ ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان میں بھی لڑکیوں کو اتنی آزادی ضرور ملنی چاہئے کہ وہ اپنی پسند کا شوہر انتخاب کریں۔

لیکن ثریا اس کے خلاف تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مرد ایسا دل پھینک واقع ہوا ہے کہ جہاں اچھی صورت نظر آئی وہیں مچل گیا۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی طنزاً کہہ گئی کہ بعض مرد محض نفس پرستی کی خاطر ایک معصوم عورت کی زندگی تباہ کر ڈالتے ہیں۔"

اس پر محسن نے پوچھا :۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟"

"جیسے دنیا میں ہو رہا ہے ۔" ثریا نے جواب دیا۔

محسن نے کہا :۔

"کوئی مثال پیش کیجئے، کوئی دلیل دیجئے ۔"

اس وقت خورشید کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا اسے خوف تھا کہ ثریا کہیں اماں ابا کی راز کی بات نہ کہہ ڈالے لیکن ثریا بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھی۔ ہنسکر بولی :۔

"دلیل دینے اور مثال پیش کرنے کا ابھی وقت نہیں ۔ آپ یہ تو فرمائیے کہ آپ شادی کیوں نہیں کرتے ؟"

"مجھے ابھی تک میری پسند کی عورت نہیں ملی ۔" محسن نے جواب دیا۔

پاس سے احسن ہنسکر بولا :۔

"میرے یار محض اناڑی ہو تم بھی۔ یورپ سے لے آئے ہوتے ۔"

"حضرت !" محسن بولا۔ " اناڑی تو وہ ہیں جو یورپ سے بیوی لے آتے ہیں۔ مرد جس رنگ میں چاہے عورت کو رنگ سکتا ہے ۔"

اقبال جو اس وقت تک خاموش بیٹھا تھا بولا :۔

"یہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا مرد جس رنگ میں چاہے عورت کو رنگ سکتا ہے"

اور پاس سے ثریا بولی :۔

"خواہ رنگ چڑھانے کیلئے کچھ سختی ہی کرنی پڑے ۔"

"سختی کیوں ؟" اقبال نے کہا۔

"چلئے !" ثریا بولی۔ "سختی نہ سہی دولت کے بل بوتے سہی۔ لیکن یاد رکھئے عورت کی مسرت دولت سے کبھی خریدی نہیں جا سکتی ۔"

"واہ !" احسن ہنسکر بولا۔ "قربان جاؤں ! کیا بھونڈی دلیل ہے۔ عورت اگر دولت پاکر خوش نہیں ہو سکتی تو پھر کوئی اور چیز بھی اسے خوش نہیں کر سکتی ۔"

"محض غلط ہے ۔" ثریا شوہر کی طرف دیکھکر بولی۔ "ہاں یہ کہئے کہ جہاں تک ضروریاتِ زندگی کا تعلق ہے۔ یا ہم چشموں میں وقار اور عزت کا سوال ہے اس کے لئے دولت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ لیکن دولت سے اطمینانِ قلب تو کوئی خرید نہیں سکتا۔ اس سے دلی مسرت تو مول نہیں لی جا سکتی ۔"

یہ سنکر خورشید کی پیشانی پر عرقِ انفعال کے قطرے موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ ساتھ ہی اقبال کے دل پر بھی ایک ایسا چرکا لگا کہ اس نے سر جھکا لیا۔ احسن بولا :۔

"اب لگے ہاتھوں یہ بھی فرما دیجئے کہ یہ آپ کا اطمینانِ قلب اور دلی مسرت عورت کیسے پا سکتی ہے ؟"

"اطمینانِ قلب ایک مرد کی محبت سے ۔" ثریا نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "اور دلی مسرت اولاد سے۔ منہ دیکھے کی محبت سے نہیں۔ اب سمجھ گئے آپ ؟"

"اور جس کی قسمت میں ہی اولاد نہ ہو !" احسن نے پوچھا۔

لیکن پیشتر اس کے کہ ثریا شوہر کو کچھ جواب دے محسن بولا :۔

"اسی لئے تو مغربی تمدن کو ایک برکت سمجھتا ہوں۔ عورت جب چاہے شوہر سے طلاق حاصل کر سکتی ہے ۔"

"اجی جناب !" احسن نے کہا۔ "یہ آپ مغربی تمدن کیا لئے پھرتے ہیں۔ کبھی اسلامی شریعت کا مطالعہ بھی کیا آپ نے ؟"

"بہت فضول بحث لے بیٹھے آپ !" کہتے ہوئے خورشید اٹھی۔ اور ثریا کا ہاتھ پکڑ کر بولی :۔

"آؤ نا ذرا باغ کی سیر کریں !"

اس واقعہ کے دو ایک روز بعد اقبال اپنے دوست احسن کے یہاں گیا۔ احسن موجود نہیں تھا۔ ثریا جسے اقبال اپنی منہ بولی بہن کہتا تھا موجود تھی۔ دونوں میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ پھر خورشید کا ذکر شروع ہو گیا۔ اقبال کہنے لگا :۔

"جانے کیا بات ہے خورشید کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی ہے ۔"

"یہ آپ جانیں ۔" ثریا نے کہا۔ "لیکن ہے کچھ ضرور ۔"

"ثریا !" اقبال بولا۔ "تم میری بہن ہو۔ ایک بات پوچھوں ؟"

"پوچھئے !"

"محسن کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ؟"

"بہت شریف آدمی ہے ۔" ثریا نے جواب دیا۔ "صرف مغربی رنگ زیادہ چڑھ گیا ہے ۔"

"میرا یہ مطلب نہیں ۔" اقبال نے کہا۔ "میں دیکھتا ہوں کہ خورشید اس کی سوسائٹی کو کچھ زیادہ پسند کرتی ہے ۔"

یہ سنکر ثریا نے ذرا تیوری چڑھا کر کہا :۔

"اگر ان باتوں کا خیال تھا تو پھر خورشید کا غیر محرموں سے تعارف ہی کیوں کر دیا ۔"

اب اقبال نے ذرا ناراضگی کے طور پر کہا :۔

"ثریا! تم شاید یہ بھول گئیں کہ میں شوہر بھی ہوں"۔

"اور خورشید عورت ہے"۔ ثریا نے جواب دیا "شاید آپ کو بھی یہ معلوم ہوگا۔ اور عورت ہمیشہ ایک مرد کی سوسائٹی کو پسند کرتی ہے"۔

اقبال کا سر خود بخود جھک گیا۔ ثریا کہنے لگی۔

"مجھ سے خورشید کی کوئی بات نہیں چھپی۔ اطمینان رکھئے سوائے اس کے کہ وہ محسن کی باتوں میں دلچسپی لیتی ہے اور کچھ بھی نہیں"۔

اقبال نے سر اٹھا کر ثریا کی طرف دیکھا اور کہا:۔

"لیکن ثریا جب کوئی کسی کی باتوں میں دلچسپی لیتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسے اس شخص سے بھی کچھ نہ کچھ دلچسپی تو ضرور ہوگی"۔

"ٹھیک ہے!" ثریا بولی "لیکن اگر آپ کو ان باتوں کا شکوہ کرنا تھا تو آپنے یہ راہ ہی کیوں اختیار کی۔ خورشید غریب نے تو کبھی اس قسم کی خواہش نہ کی ہوگی"۔

"خواہش!" اقبال بولا "وہ تو ہمیشہ انکار ہی کرتی رہی۔ محض میرے مجبور کرنے سے پردہ ترک کیا"۔

"اور آپ نے مجبور کیوں کیا؟" ثریا نے پوچھا۔

"محض خورشید کو خوش کرنے اور خوش دیکھنے کیلئے"۔ اقبال نے جواب دیا۔

"اور اب جب آپ اسے خوش دیکھتے ہیں تو اس سے محروم کیوں کرنا چاہتے ہیں؟" ثریا نے پوچھا۔

"نہیں ثریا نہیں"۔ اقبال نے ایک آہ بھر کر کہا "میں تو خورشید کو خوش دیکھنے کیلئے جان تک قربان کر دوں"۔

"آپ کو جان قربان کرنیکی ضرورت نہیں"۔ ثریا کہنے لگی "لیکن جس وہم میں آپ پڑے ہیں کہیں یہ خورشید کو ہلاک نہ کروائے"۔

"وہم!" اقبال نے پوچھا "کیسا وہم؟"

"اب بتلا ہی دوں؟" ثریا نے ہنسکر کہا۔

"ثریا!" اقبال بولا "تمہیں میرے سر کی قسم ہے سچ سچ کہدو"۔

"آپ کو شک ہے کہ محسن کو خورشید سے محبت ہے"۔ ثریا نے پوچھا

"محسن کو نہ سہی!" اقبال بولا "لیکن خورشید تو اسے پسند کرتی ہے"۔

"کسی کو پسند کرنا تو گناہ نہیں"۔ ثریا نے جواب دیا "بھیا خدا کی قسم اگر چراغ لیکر بھی ڈھونڈو تو خورشید ایسی باوفا، غمگسار اور پاکباز عورت آپکو نہ ملے گی۔ آپ کو ایسی عورت کی قدر کرنی چاہیئے جس نے اپنی جوانی۔ اپنا شباب اپنی آرزوئیں اور تمنائیں محض آپ کے ایک شوق کی خاطر قربان کر رکھی ہیں۔

اقبال نے یہ سنکر سر جھکا لیا۔ کچھ دیر بعد وہ جانے کیلئے اٹھا اور ثریا کی طرف دیکھکر بولا۔

"ثریا! تم نے سچ کہا ہے۔ بیشک! جو عورت ایک مرد کیلئے اپنی جوانی برباد کرے۔ مرد کو بھی اس کیلئے کچھ ایثار ضرور کرنا چاہیئے"۔

آج ایک عورت سے کھری کھری سن کر اسے اپنی زندگی ایک بار محسوس ہونے لگی تھی۔ اور خورشید کو وہ بہت مظلوم سمجھنے لگا تھا۔ اب اس کے لئے صرف ایک ہی راہ کھلی تھی۔ اور یہی راہ اختیار کرنے سے وہ خورشید کو اس کی کھوئی ہوئی مسرت واپس دلا سکتا تھا اور وہ موت کی راہ تھی۔ خورشید کو تفکرات اور رنج والم سے آزاد کرنیکی ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ تھی کہ وہ جان شیریں اب اس عورت کی تمناؤں، آرزوؤں اور حسرتوں پر قربان کر دے جسے اس کی خود غرضی اور نفس پرستی نے زندہ درگور کر رکھا تھا۔

رات کا وقت تھا اور گرمیوں کی رُت اور دریا کا کنارہ۔ ماہ منیر بام فلک پر سے بڑی آب و تاب سے انجُم آرائی کر رہا تھا۔ اور چاندنی کرنیں سینۂ آب پر مستوں کی طرح رقص کر رہی تھیں۔ ایک موٹر دریا پر آکر رُکا۔ محسن، احسن اور ثریا۔ اقبال اور خورشید اُترے اور کشتی میں بیٹھکر دریا کی سیر کرنے لگے۔ محسن اور احسن چپو چلانے لگے اور اقبال کشتی کو قابو میں رکھنے کیلئے پتوار سنبھال کر بیٹھ گیا۔ ثریا اور خورشید درمیانی نشستوں پر بیٹھیں۔ چپو بسلسل پانی میں پڑتے تو فضا میں ایک زیر و بم سا پیدا ہو جاتا۔

محسن بولا:۔

"دریا کا لطف تو اہل یورپ ہی کچھ لیتے ہیں"۔

"مسٹر یار!" احسن کہنے لگا "یہ مغل اس معاملہ میں تمہارے یورپ والوں سے بھی بڑھے ہوئے تھے"۔

ثریا بولی:۔

"بھیا محسن! یورپ میں کیا ہوتا ہے؟"

"اس وقت یورپ میں دریا پر بھی آپ کو ایک دنیا آباد نظر آئیگی۔ سطح آب پر ہر طرف کشتیاں ہی کشتیاں نظر آئینگی۔ کوئی ستار بجا رہا ہوگا۔ کوئی گا رہا ہوگا۔ کہیں کشتیوں کی دوڑ ہو رہی ہوگی"۔

خورشید بولی:۔

"آؤ تو ثریا ہم بھی ذرا کشتیوں کی دوڑ کرائیں"۔

"لیکن دوسری کشتی کہاں ہے"۔ ثریا نے پوچھا۔

اقبال کے کوٹ کے بٹن ہول میں گلاب کا ایک شوخ پھول تھا۔

خورشید نے اُچک کر یہ پھول مٹی ہول میں سے نکال لیا اور بولی:۔

"یہ پنکھڑیاں جو ہیں یہی کشتیاں بنیں گی"

یہ کہتے ہوئے اس نے تھوڑی سی پنکھڑیاں ثریا کو دیدیں۔ خورشید بولی "لیکن منصف کون ہوگا؟"

"بھیا جو آگے بیٹھے ہیں" ثریا بولی "جس کی پنکھڑی آگے نکلے گی وہ کہدیں گے"

"تو آؤ پھر ڈالو" خورشید بولی۔

ثریا اور خورشید دونوں ایک ساتھ پنکھڑیاں دریا میں پھینکتیں۔ جس کی آگے نکلتی اقبال اس کا نام لے دیتا۔

محسن کچھ گنگنانے لگا۔ احسن بولا:۔

"میرے یار! آواز سے کہو تو ہم بھی سُنیں"

محسن نے ذرا اونچی آواز میں یہ شعر پڑھا:۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اقبال نے ایک آہ بھر کر کہا:۔

"واللہ سوت ہو تو ایسی ہی ہو۔ ہاں محسن! پھر کہیو ذرا!"

اور ثریا نے کہا:۔

"بھیا! ہماری تو کشتیاں بھی ختم ہو لیں آپ نے تو ایک بھی نہیں پکڑی"

خورشید اپنا ریشمی رومال نکال کر بولی:۔

"ثریا! آؤ رومال پانی پر ڈالتی ہیں جو جیتے وہی رومال لے"

ثریا نے بھی اپنا رومال نکالا اور اقبال سے کہا:۔

"بھیا! دیکھو ہمارے رومال پکڑ لیجو!"

دونوں نے اپنے رومال ساتھ ساتھ پانی پر ڈال دیئے اور جھک جھک کر دیکھنے لگیں۔ خورشید کا رومال اقبال تک پہنچتے پہنچتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ چلا کر بولی:۔

"میرا رومال پکڑیو کہیں ڈوب نہ جائے"

"کہاں ہے؟" اقبال اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔

ساتھ ہی رومال پھر سطح پر اُبھرا اور خورشید ہاتھ سے اشارہ کر کے بولی:۔

"وہ رہا۔ لیجو!"

اقبال اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے کھڑے ہونے سے کشتی جو ڈگمگانے لگی تو ثریا نے کہا:۔

"بھیا! دیکھنا کہیں گر نہ جائیو!"

"ثریا!" اقبال بولا "خورشید کے رومال کی خاطر جان بھی چلی جائے تو کوئی بڑی بات نہیں"

یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ پانی میں ایک گرداب پڑا۔ خورشید دہشت زدہ ہو کر دیکھنے لگی۔ اقبال ایک بار پھر اُبھرا۔ محسن اور احسن نے اسے پکڑنے کیلئے زور زور سے چیخ چلائے۔ لیکن وہ چشم زدن میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ خورشید ایک چیخ مار کر ثریا کی گود میں گری اور بیہوش ہو گئی۔

احسن اور محسن نے دُور دُور تک دریا چھان مارا لیکن اقبال کا کہیں پتہ نہ ملا۔ آخر مایوس ہو کر یہ لوگ کنارے کی طرف لوٹے۔ چپو جب پانی میں پڑتے تو انکی آواز کسی کی سینہ کوبی سے ملتی جلتی معلوم ہوتی۔ اسوقت کنارے پر بیٹھا کوئی "ساجن پردیس گئے میں بیٹھی ندی کنارے :: کھاؤں سیاں کیسے جب ساجن پاس آئے" بڑی سوز بھری آواز سے گا رہا تھا۔

ایم۔ اسلم

ظالم محبت

دوسرے دن میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ حسین صبح اپنی سحر انگیز آنکھیں کھول رہی ہے۔ باغ کی طرف کے دریچے کھلے ہوئے تھے۔ اور آفتاب کی اچھوتی کرنیں گرجنے والے نیلے سمندر پر مسکرا رہی تھیں۔ باغیچے میں راگ گانیوالے پرندے مصروفِ نغمہ تھے۔

مگر میرا دل اس دلفریب صبح میں بھی پریشان تھا۔ میں نے سرہانے کی کھڑکی کا سنہرا پردہ ہٹایا اور جھانک کر باغ میں دیکھنے لگی۔

عین دریچے کے نیچے ایک بڑا سا سُرخ گلاب بہار کی عطر بیز ہواؤں میں والہانہ جھوم رہا تھا۔ "نہ جانے زندگی کی کونسی تفسیر بیان کر رہا ہے! کسے معلوم محبت کے کس پیچیدہ مسئلہ کی تشریح کر رہا ہے!" میں نے پریشان لہجہ میں اپنے آپ سے کہا۔

اتنے میں پردہ ہٹا۔ دیکھا تو زوناش (بوڑھی حبشن خادمہ) اپنی موٹی کمر سمیت اندر داخل ہو رہی ہے۔

"خاتون روحی!" اس نے قدرے حیران ہو کر کہا۔ "آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟ بیگم زبیدہ ناشتہ کیلئے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

صبح کے وقت میں کچھ زیادہ تنک مزاج ہوتی ہوں۔ زوناش سے خصوصاً کچھ چڑ سی ہوتی ہے۔ لہٰذا میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ جھک کر صوفے کے پیچھے سے ستار اٹھا لیا اور اس کے تاروں کو درست کرنے لگی۔ زوناش ایک خوش رنگ ایرانی قالین پر کھڑی مجھ سے سوال پر سوال کئے جا رہی تھی۔ اتنے میں دادی زبیدہ کی خادمہ صنوبر اندر آئی۔ "خاتون روحی! چاء تیار ہے۔ بیگم آپکی منتظر ہیں۔"

میں ایک بیزارادا سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ قدِ آدم آئینہ کے آگے کھڑی بالوں پر ایک پن لگا رہی تھی کہ ایک خیال نے مجھے چونکا دیا۔

"زوناش! چاء کی میز پر دادی زبیدہ تنہا ہیں یا چشتی صاحب بھی موجود ہیں؟"

"مجھے کیا معلوم بی بی؟" زوناش کے اِن روکھے سوکھے جوابوں سے مجھے دلی نفرت تھی۔

"اور منیر کو رات بخار تو نہیں ہو گیا؟ کیسے رہے؟" یہ سوال میں نے مصلحتاً کیا۔

"نہیں۔ وہ اچھے ہیں۔"

میں تبدیل لباس کے بعد چُپ چاپ نچلی منزل میں آگئی۔ دیکھا تو دادی زبیدہ ایک نفیس ریشمی لباس میں بیٹھی ناشتہ کیلئے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ ایک ہاتھ فاختائی رنگ کے دستانہ میں ملفوف تھا۔ دوسرا دستانہ سے خالی تھا۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ پکڑ رکھا تھا۔ جس کا مسلسل دھواں اٹھ اٹھ کر دائرہ کی شکل میں گھوم رہا تھا۔ سامنے حسب عادت اخبار پڑا تھا جسے وہ کبھی کبھی پڑھ لیتی تھیں۔

میں نے جا کر انھیں پیار کیا۔ "آداب دادی جان پیاری۔"

"آداب۔ تم بڑی دیر میں آئیں پیاری۔"

"میں سویرے اٹھ گئی تھی۔ نماز میں کچھ دیر لگ گئی۔" یہ کہکر میں نے اپنے مقابل والی خالی کرسی پر نگاہ ڈالی۔ پھر کچھ تامل کے بعد پوچھا۔ "چشتی صاحب کہاں ہیں؟ کیا وہ چاء پی چکے؟"

"وہ آج صبح سے باہر گئے ہوئے ہیں۔" دادی زبیدہ نے بے پروائی سے کہا۔ "مُربّہ لوگی؟"

"لبلونگی۔ وہ کہاں گئے ہیں دادی جان؟" میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"یہ لوگاجر کا حلوا۔ اور یہ شہتوت کا مُربّہ۔ اس موسم میں صبح کی ناشتہ پر تازہ پھل ضرور کھانے چاہئیں۔ انناس کے قتلے لے لو۔"

میں نے بادلِ ناخواستہ ایک ٹکڑا لیا اور چھُری سے کاٹ کر کھانے لگی۔ دو منٹ بعد ہمت کر کے وہی سوال دُہرا دیا۔ "تو چشتی صاحب کہاں گئے ہیں دادی جان؟"

"جو انناس تم کھا رہی ہو وہ تُرش تو نہیں؟ اگر ترش ہو تو کیلا لیلو۔ چشتی صاحب کشتی کی سیر کے لئے گئے ہیں۔ غریب دن رات منیر کے کمرہ میں رہتا ہے آج اس نے چھٹی منائی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس لڑکے کو نہایت شریف پایا۔ یہ انجیر لو بیٹی۔"

میں چُپ تھی اور سوچ رہی تھی۔ منیر کی تیمارداری نے آخر چشتی کو مضمحل کر دیا۔ میں جانتی تھی کہ دوسرے کی تیمارداری ایک دن خود انھیں بیمار ڈالدیگی۔ میں نے دبی زبان سے پوچھا۔ "تو کیا چشتی صاحب علیل ہیں دادی جان؟"

"نہیں۔ ویسے ہی تفریحاً باہر گئے ہیں۔ لڑکی! تمھاری آنکھیں گلابی

ہو رہی ہیں۔ طبیعت کیسی ہے ؟"

"جب سے یہاں آئی ہوں طبیعت کچھ سُست سی رہتی ہے دادی جان"

دادی زبیدہ نے فکرمندی کے الفاظ میں کہا "سمندر کی ہوا تمہارے لئے مفید ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں جنیّی صاحب سے التجا کرتی کہ تمہیں کشتی کی سیر کیلئے ساتھ لے جائیں۔ بڑا شریف آدمی ہے"

مالک جانے میرا دل کیوں دھڑکنے لگا۔ کشتی کی سیر! لہروں کی خاموش موسیقی! جھکی ہوئی خمدار ٹہنیوں کے سایہ میں جنیّی جیسے ملاح کے ساتھ ایک نامعلوم آبی راستہ پر چلا جانا! یہ سب کچھ کس قدر رومان آفریں تھا۔

"شام تک وہ لوٹ آئیں گے۔ میں اُن کے ساتھ شام کو باہر جا سکتی ہوں دادی جان" ؟ میں نے بھولی شکل بنا کر پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ مگر منیر سے پوچھ لو"

منیر سے پوچھ لوں! میری خوشیوں کے اُفق پر اک سیاہ بدلی ابھرنے لگی۔

ناشتہ کے بعد میں منیر کی مزاج پُرسی کیلئے اُن کے کمرے کی طرف گئی۔ دروازہ تک جا کر رُک گئی۔ کہیں جنیّی نے اس بدنصیب آدمی کو میرا پیام پہونچا تو نہیں دیا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ ڈرتے ڈرتے پردہ ہٹا کر اندر گئی۔ مگر آثار کچھ ایسے معلوم نہ ہوئے۔ کیونکہ مجھے دیکھکر منیر کے چہرے پر وہی پُرانی شگفتہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھکر میرا دل دُکھا۔ کچھ دیر بعد میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کی کہ میں کیوں اس سے محبّت نہیں کر رہی! کیا باوجود کوشش کے میں اس سے محبّت نہ کر سکونگی! اپنے منسوب سے! اپنے ظلم پر خود اپنی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور میں نے چہرہ دریچہ کی طرف پھیر لیا۔ پھر بڑی ملائمت سے سوال کیا "منیر! آج تم بہت شگفتہ نظر آتے ہو۔ کہو رات کیسی کٹی ؟"

"شکریہ! بہت اچھی کٹی۔ نیز محسوس کر رہا ہوں کہ صحت بڑی سُرعت سے مجھ پر عود کر رہی ہے"

اسی وقت دادی جان اندر آئیں اور کہنے لگیں "خدا نے چاہا تو ایک ہفتہ میں بالکل تندرست ہو جاؤ گے۔ پھر انشاءاللہ میں تم دونوں کو ایام عروسی بسر کرنیکو فیروز کے پُرفضا مرغزاروں میں چھوڑ دونگی"

منیر مسکرا پڑا۔ میں دُور کہیں فضا میں تک رہی اور تشنج کی سی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد دادی زبیدہ چہل قدمی کیلئے باہر چلی گئیں۔ اور کمرے پر موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ ایک ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا دوسرا ابھر ابھر کر ڈوب جاتا تھا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے منیر کو دیکھا۔ وہ بغور مجھے تک رہا تھا۔ اُسکے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور اس کا نوجوان چہرہ دفورِ مسرت سے آفتاب کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ مجھ پر جھک کر کہنے لگا "تمہیں کوہ فیروز کے مرغزار پسند ہیں ؟"

"بہت منیر!" دھڑکتے ہوئے دل سے میں نے کہا۔

اس نے اپنا ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھدیا۔ نہایت دھیمے لہجہ میں بولا "میری جان! زندگی کی کلی ایسے ہی مرغزاروں میں کھل کر پھول بنتی ہے۔ روحی اس دن کا خیال کرو ـــــ جس دن ہم دونوں ـــــ پھولوں سے سجے ہوئے پھلوں سے لدے ہوئے باغیچوں میں چنبیلی کی معطر بیلوں تلے ایک دوسرے کی محبت کا اعتراف کریں گے"

میرے دل پر ایک تیر سا لگا۔ کیونکہ میں ابھی تک اس کشتی کا خواب دیکھ رہی تھی جس کا ملاح جنیّی تھا۔ دو منٹ بعد مجھے اپنی خاموشی کا احساس ہوا۔ بولی "واقعی منیر! باغیچوں میں چنبیلی کے بیلوں تلے محبّت کا راگ گانا بیحد پُرلطف ہوگا"

"اور پھر ہم دونوں ـــــ" منیر نے جملہ ختم نہ کیا۔

مگر "ہم دونوں" کے لفظ نے میرے کاہیدہ جسم میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا۔ کون دونوں ـــــ ؟ منیر اور میں ؟ ـــــ یا دو محبّت کرنیوالے دل ؟

کچھ دیر بعد میں منیر کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ باغ کے زینے پر کھڑی سوچتی رہی۔

"آہ! میری زندگی کا پلاٹ کتنا عجیب ہے! اگر میں منیر سے نفرت کر سکتی تو میں ان الجھنوں میں مبتلا نہ ہوتی۔ اگر محبّت کر سکتی تو ان تمام مصائب کا خاتمہ ہو جاتا! مگر آہ! اس شخص سے نہ میں محبّت کر سکتی تھی نہ نفرت! میرے دل میں منیر کیلئے ہمدردی موجود تھی۔ میں اپنے آپ کو اس کی گنہگار محسوس کر رہی تھی۔ آہ! گناہ کا احساس! محبّت کی مجبوری!

میں باغ میں چلی گئی اور فوارہ کے قریب ایک کوچ پر بیٹھکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں بار بار نہر کی طرف دیکھ رہی تھی جنیّی کی کشتی واپس آ رہی ہوگی مگر نہ آئی۔ جب دوپہر کی گرم ہوائیں چلنے لگیں تو میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ بہت دیر ایک صوفے پر پڑے موجودہ حالات پر غور کرتی رہی۔

جنیّی دوپہر کے کھانے پر بھی نہ آئے تو مجھے شبہ ہوا کہ وہ مصلحتاً گھر سے باہر رہنا پسند کرتے ہیں۔

جب سائے ڈھل گئے اور ہواؤں میں دوپہر کے آفتاب کی تمازت کم ہوگئی تو میں بلا ارادہ پھر باغ میں گھاٹ پر نکل آئی۔ اور آنیوالی کشتیوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ میں انتظار کی دردانگیز خلش محسوس کر رہی تھی۔

سورج زیتون کی ٹہنیوں کے اوپر تھا۔ کچھ دیر بعد وہ درختوں کی شاخوں تلے نظر آنے لگا۔ نہر کا پانی خالص سونے کی طرح سنہرا ہوگیا۔ اور پورا باغیچہ دھوپ کی لہروں میں جگمگا اٹھا۔

دُور ——— سنہری سنہری لہروں میں ایک ننھی سی نیلے رنگ کی کشتی نظر آنے لگی۔ میرا دل دھڑکا۔ اللہ جانے کیوں یہ آجکل غیر معمولی طور پر دھڑکنے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد میں گنگنانے لگی ؎

"چشمِ قمر کو بھی مرے خوابوں پہ رشک ہے
پیشِ نظر ترا رُخِ روشن ہے آج کل
جس آستاں کو سجدہ پرویں بھی بار تھا
وہ آستاں جبیں کا نشیمن ہے آج کل"

بانس کے سربلند درختوں پر ایک ہُدہُد زور سے گا رہا تھا کہ اتنے میں وہ نیلی کشتی گھاٹ پر آگئی۔ ادھر میرے دیکھتے دیکھتے چشتی اُتر آئے۔ ان کی نظر مجھ پر پڑی۔

"آپ یاں کیا کر رہی ہیں خاتون روحی؟" انھوں نے بچوں کے سادہ لہجہ میں پوچھا۔

لیکن میں کیا جواب دیتی؟ کیا یہ کہہ دیتی کہ آپ کے انتظار نے قریب المرگ کر رکھا تھا۔ توبہ۔ توبہ۔ یہ کس طرح کہہ سکتی تھی۔

کچھ بوکھلا سی گئی بولی! "میں؟ یوں ہی یہاں بیٹھی تھی۔ اندر بہت گرمی تھی۔ آج کا دن بڑا گرم رہا۔ آپ کہاں گئے تھے؟"

یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی جاپانی وضع کی نارنجی چھتری کھول لی۔

"میں ذرا دل بہلانے نکل گیا تھا۔"

"ہاں" میں نے کہا "گھر میں وحشت ہوتی ہوگی۔ تیمارداری کوئی دلچسپ کام نہیں۔"

"یہ آپ کیا فرماتی ہیں خاتون روحی!" چشتی نے مؤثر لہجے میں کہا۔ "منیر صاحب کی تیمارداری میرا ایک مرغوب فرض ہے۔ آپ نہیں جانتیں مجھے ان سے کتنی محبت ہے۔"

"میں جانتی ہوں" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ نہیں جانتیں" چشتی ہنس کر بولے "اس کا اندازہ یا تو منیر لگا سکتے ہیں۔ یا پھر میرا دل۔"

میں اب بھی سنجیدہ تھی "اوہ! اتنی گہری محبت ہے؟" یہ کہتے ہوئے میں نے ایک بے چینی سی محسوس کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ چشتی نے میری وحشت کو محسوس کیا۔ پھر کہنے لگے "آپ گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ یہاں بہت گرمی ہے۔ شمشاد کے درختوں کی طرف چلئے۔ اس چبوترے پر ہمیشہ ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔"

اس نے میرا بازو تھام لیا۔ اور شمشاد کے درختوں کے پاس سنگِ مرمر کے ایک سفید چبوترہ پر لے گیا۔

"میں گھبرائی ہوئی نہیں ہوں۔ صبح سے ایک افسانہ لکھ رہی تھی۔ ایک جگہ پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں تو سوچنے کیلئے اِدھر نکل آئی۔ کیا اپنے افسانہ کا پلاٹ آپ کو سُناؤں۔ آپ کوئی رائے دے سکیں گے؟"

"زہے نصیب!" چشتی نے کہا "مگر میں صائب الرائے نہیں۔ ویسے افسانے بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ فرمائیے۔"

"تو سُنئے!" میں نے کہا "مگر افسانہ کچھ زیادہ رنگین ہے۔ آپ مجھ پر عریاں بیانی کا الزام تو نہ لگائیں گے۔"

"میری مجال نہیں۔ میں موپاساں کے افسانے پڑھ چکا ہوں۔" چشتی نے کہا۔

"توبہ کیجئے۔ یہ افسانہ ایسا نہیں۔ اس کی عریانی میں بھی زندگی کا درد پوشیدہ ہے۔"

"فرمائیے۔"

میں نے احتیاطاً ایک دفعہ اور کہا "مجھ پر شوخی کا الزام کسی طرح بھی نہیں لگ سکتا۔ کیونکہ یہ پلاٹ میرا اپنا نہیں۔ میں نے کہیں سے لیا ہے اس لئے اس کی کوئی ذمہ داری مجھ پر نہیں بلکہ اس کے مصنف پر عائد ہوتی ہے۔"

"بالکل۔"

میں کہنے لگی "افسانہ دو مردوں اور ایک عورت سے شروع ہوتا ہے۔"

"اُف!" چشتی نے کہا "یہ پلاٹ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں ———"

"ٹھہرئیے۔ دیکھئے چشتی صاحب! پہلے آپ پلاٹ سن لیں پھر آپ سے آپکی رائے پوچھی جائیگی۔"

"بہت اچھا!"

"تو ایک عورت اور دو مرد۔ عورت اس مرد سے بے پرواہ ہے۔ جو اس سے محبت کرتا ہے ——— مرد اس عورت کو نہیں چاہتا ——— جس سے یہ عورت محبت کرتی ہے۔ تو ایسے موقع پر عورت کو کیا کرنا چاہیے؟

چشتی کہیں دُور ہری ہری دوب کے اس پار سنہری لہروں کو دیکھ

رہے تھے " میں زود فہم نہیں ہوں۔ اک دفعہ پھر آسان زبان میں کھول کر فرمایئے "

"کھول کر! یہ ظالم اس کتاب کو کھول کر پڑھنا چاہتا ہے! آہ ۔"

میں بولی " آپ نہیں سمجھے۔ عورت اس مرد کو چاہتی ہے جس کے متعلق اسے خود خبر نہیں کہ وہ مرد بھی اس سے محبت کر رہا ہے یا نہیں۔ اور اس مرد کو نہیں چاہتی جس کے متعلق اسے علم ہے کہ وہ اس سے محبت کر رہا ہے " میں کسی قدر کانپ رہی تھی۔

"اب میں سمجھ گیا " چشتی نے دور کہیں فضا میں تکتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ایسے موقع پر عورت کو کیا کرنا چاہیئے؟"

"مگر سوال یہ ہے " چشتی کہنے لگے " عورت جس مرد کو چاہتی اس کے متعلق اس کے پاس اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ وہ مرد بھی اس پر جان نہیں دے رہا "

"کیا —— کیا؟" بیساختہ میں بول پڑی۔ میرے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی " آپ نے کیا کہا؟ وہ مرد؟ ——"

چشتی کے چہرے پر بے چینی اور اضطراب کی علامات نمودار ہوگئیں۔ کہنے لگے " میں —— میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اپنے محبوب سے عورت کے بدگمان ہونے کے اسباب کیا ہیں؟"

واقعی۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا " تو —— تو کیا وہ مرد بھی۔" اتنا کہہ کر میں یک لخت رک گئی۔

"ہاں تو آپ چپ کیوں ہوگئیں؟ پورا پلاٹ سنا ڈالئے "

"ختم ہوگیا " میں نے کہا " بس اتنی ہی بات پوچھنی تھی۔ آج کئی دن سے اس پلاٹ کو سوچ رہی تھی کہ ایسے موقع پر عورت کو کیا کرنا چاہئے؟ کیا وہ مرد بھی —— اس سے محبت کرتا ہے ——؟"

میری آواز لرز گئی۔ میرا چہرہ کیلے کے نوخیز پتے کی طرح زرد پڑ گیا۔

ہائے کبھی کا ہیکو میں نے ایسی مصیبتیں اٹھائی تھیں! میرے معبود مجھ پر رحم کر۔

چشتی نے ایک گہری سانس لی۔ ان کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے سنجیدہ لہجہ میں بولے " تو کیا عورت کو اس دوسرے مرد سے، جس کی محبت کا اسے یقین نہیں، واقعی محبت ہے "

"ہائے۔ ہاں شدید شدید ہے چشتی صاحب!" میرے منہ سے نکل گیا۔ پھر میں سہم گئی۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ دُعا کے پیرایہ میں میرے ہونٹوں سے اک آہ نکل گئی کہ اے عشق! نسوانی خودداری کو اس طرح پامال نہ کر۔ یہ سچ ہے کہ تیرے آہنی ہاتھوں نے شاہنشاہوں کے تاج چکنا چور کر دیئے۔ مگر ایک بے بس مظلوم لڑکی پر رحم کر۔ آہ محبت کی مجبوریاں!

بڑی دیر تک ہم خاموش رہے۔ نارنجی رنگ کا بڑا سا آفتاب سمندر کی لہروں میں غرق ہونے لگا۔ باغ پر ایک افسردگی سی چھا گئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے چشتی کی طرف دیکھا۔

ان کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ ان کی گہری نیلی آنکھیں اداس نظر آ رہی تھیں۔

لیکن دفعتہً انھوں نے کہا " آپ نے افسانہ کے تیسرے فرد کے متعلق کچھ نہیں پوچھا۔ اس کا کیا ہوگا؟"

میں بوکھلا سی گئی۔ غمناک لہجہ میں بولی " یہ ایک نامکمل پلاٹ ہے چشتی صاحب۔ میں اسے ختم نہیں کر سکی۔ نہیں معلوم —— اس پلاٹ کے اختتام پر کتنی زندگیوں کا انحصار ہے "

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جھٹ میں نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"ایسے پلاٹ عموماً بہت مشکل ہوتے ہیں خاتون روحی! بہرحال ایسی افسانوں باتوں پر آپ زیادہ غور نہ فرمایا کیجیئے "

"شعر اور افسانہ تو میری جان ہے اور اس پر غور کرنا میری زندگی " میں نے بمشکل کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی " چلئے دادی جان چاء پر انتظار کر رہی ہوں گی "

حجاب امتیاز علی!

زن

حصۂ سوم کے

حلیمہ

"زن" چغتائی صاحب کا تازہ ترین ناول ہے۔ اس ضخیم ناول کے چار حصے ہیں۔ قارئین ساقی کی ضیافت طبع کیلئے حصۂ سوم کے چند ابواب بعد قطع و برید اختصار کے ساتھ ایک افسانہ کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔ یہ ناول بعد نظرثانی بہت جلد پریس میں جا رہا ہے۔ گو اختصار کی وجہ سے اصل قصہ کا لطف مفقود ہے لیکن اپنی نوعیت کے لحاظ سے جو کچھ بھی ہے وہ غنیمت ہے۔ بالخصوص جبکہ چغتائی صاحب کا کوئی مضمون سردست حاصل ہونا مشکل ہے۔

(مدیر)

۱

حلیمہ کی خوبصورتی اور محمد کی طاقت۔ یہ دو چیزیں تھیں جن کا رحمت خاں نے گاؤں میں داخل ہوتے ہی چرچا سن لیا تھا۔ وہ سندھ کی طرف سے آٹھ سال بعد واپس آیا تھا۔ سندھ میں وہ ڈاکے ڈالتا تھا اور یہاں آنا بھی خالی از علت نہ تھا۔ اس کے پاس دو ڈھائی ہزار روپیہ اسی کمائی کا تھا۔ جسے وہ لیکر سندھ سے واپس آیا تھا۔

اس نے حلیمہ اور محمد دونوں کو دیکھا۔ اس نے گاؤں چھوڑا تو حلیمہ ایک دُبلی پتلی فاقہ زدہ چھوٹی سی لڑکی تھی۔ مگر اب؟ وہ اس کو دیکھکر مبہوت سا ہو گیا۔ ایسا کھڑا دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا اور اس کی زبان سے نکلا "حلیمہ!" اور حلیمہ نے دیہاتی سادگی سے مسکرا کر کہا "رحمت بھیّا" رحمت نے سر سے لیکر پیر تک حلیمہ کو دیکھا۔ کشیدہ قامت، ہر جنبش میں جوانی کا روپ چہرہ اس قدر خوبصورت اور نورانی کہ معلوم ہو ہلکی ہلکی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے اور اس پر وہ نوجوانی کی مسکراہٹ! رحمت نے اُسے دیکھا کہ بیچاری شرما سی گئی۔ وہ چلی گئی اور وہ دیکھتا رہ گیا۔ کیسے؟ یوں سمجھئے کہ ہر شخص رحمت کو دیکھ رہا تھا اور اس عجیب و غریب اثر کو جو حلیمہ اس پر چھوڑ کر گئی تھی۔ اور ایک دفعہ سر چاروں طرف گھما کر رحمت نے دیکھا تو سب اسے دیکھ رہے ہیں اور چند ہم عمروں کے چہرے پر مسکراہٹ ہے۔

محمد کو بالکل دوسری طرح دیکھا "ارے محمد!" پکار کر اس نے کہا "سلام علیک۔۔۔" اور دونوں ہنستے ہوئے بڑھے اور بغلگیر ہوئے۔ ایک نے دوسرے کے طاقتور بدن کو اچھی طرح چمٹا کر دیکھ لیا ہوگا۔

اس کے بعد جو بات قابل غور تھی وہ محمد کی عجیب و غریب پوزیشن۔ وہ گاؤں کا رستم تھا اور حلیمہ کا شوہر۔ حلیمہ یا حلیمہ کے کسی عزیز قریب یا رشتہ دار سے اگر کوئی خلاف ہو تو محمد اس کا سر پھاڑ دے۔ سارا گاؤں جانتا تھا کہ حلیمہ کی محمد سے شادی ہوگی۔ محمد کی مفلسی سدراہ تھی۔ حلیمہ کا باپ چڑھاوے میں زیور مانگتا تھا۔ یہ بھی چاہتا تھا کہ محمد کے پاس چند مویشی ہوں اور دو کھیت ہوں علیحدہ۔ سوائے چند بکریوں

اور بھیڑوں کے اس کے پاس کچھ نہ تھا اور روہی باپ کے بنجر کھیت جن پر کنواں بھی نہ تھا۔ لہٰذا حلیمہ کے باپ نے قول نہیں ہارا۔ کہدیا محمد کے باپ سے کہ لڑکی تمہاری ہے پر روپیہ کا انتظام پہلے کر و اور رہ گیا قول تو میں قول نہیں ہارتا۔ اور محمد اور محمد کا باپ پیسے کی فکر میں رہتے تھے۔ گھسٹتے گھسٹتے حلیمہ کے باپ نے صرف دوسو کی رقم رکھی تھی کہ اناز بورتو چڑھاؤ مگر وہ بھی میسّر نہ تھا۔ ہر فصل پر یہی امید تھی کہ اب روپیہ ہو جائے گا۔

(۲)

شام کا وقت تھا اور رحمت جنگل سے سیدھا کنویں پر پہونچا۔ وہاں خوب مجمع تھا۔ حلیمہ بھی تھی۔ گاؤں کے مویشی کھڑے تھے۔ کنویں کی گراری میں ڈول پھنسا ہوا تھا اور سب بیکار اور منتظر۔ رحمت کو معلوم ہوا کہ یہ ڈول محمد کا ہے۔ اور وہ بیچ سے چھوڑ کر نہ معلوم کدھر چل دیا۔ کسی کی ہمت نہیں جو اس کا ڈول ہٹا کر اپنا پانی شروع کرے۔ ابھی آ کر کا تو لڑنے لگے گا۔ رحمت کو غصہ آیا۔ اس نے کہا کہ کوئی ضرورت نہیں ہے کوئی کنواں محمد کے باپ کا ہے۔ پھینکو ڈول۔ اور یہ کہکر اس کا ڈول نکال کر علیحدہ رکھدیا۔ اور دوسرے کا ڈول پھنسا کر کہا کہ پلاؤ اپنے اپنے مویشی۔

اور سب نے رحمت کے قد آور جسم کی طرف دیکھا۔ بیشک وہ محمد سے ٹکرا سکتا ہے۔ وہ لوگ جو محمد کے ہاتھوں ذلت اُٹھائے تھے رحمت کی حمایت میں آگئے۔ اتنے میں محمد آیا "میرا ڈول کس نے ہٹایا" گرجکر محمد نے پوچھا۔ اور ایک کڑک کے ساتھ رحمت نے جواب دیا "ہم نے . . . ."

"کیوں؟"

رحمت نے کہا "کنواں کسی کے باپ کا نہیں ہے۔ تم کیوں چلے گئے۔ لوگ کب تک کھڑے رہتے"

محمد نے بات مذاق میں اُڑانا چاہی۔ ہنسکر بولا "ابے جا۔ آیا وہاں سے . . . . بھر دیا پانی بھرو" لوگوں سے اس نے کہا۔

لیکن سب نے دیکھ لیا کہ رحمت کے سبب محمد ہچک گیا۔ خود حلیمہ نے بھی دیکھا اور وہ لوگ تو زیر لب خوب ہی مُسکرا رہے تھے جو اس بارے میں محمد کے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے اور دیدہ و دانستہ دیر لگا کر پانی بھر رہے تھے۔ محمد کی ہمت نہ پڑی کہ ڈانٹتا کہ جلدی کرو اور وہ رحمت سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتا رہا۔

مگر لوگوں نے دیکھ لیا کہ محمد کا ثانی گاؤں میں آگیا۔

اور اس واقعہ کے بعد تمام وہ لوگ جو محمد سے ذلت اٹھا چکے تھے ایک ایک کر کے رحمت کی حمایت میں آنے لگے۔ محمد نے جتنے قاعدے اور قوانین اپنے اور حلیمہ کے عزیزوں کی آسائش کیلئے گاؤں میں بنا رکھے تھے لوگوں نے رحمت کی حمایت میں سب توڑ ڈالے۔ حتیٰ کہ بوقتِ ضرورت محمد یا حلیمہ کے عزیزوں کے مویشی لٹھ مار کر کنویں سے علیحدہ کئے جا سکتے تھے جبکہ وہ دوسرے شخص کے پانی میں دخیل ہوں۔

(۳)

ایک کمہار کے گدھے نے حلیمہ کے چچا کے گھر میں گھس کر مٹکے توڑ دیئے۔ جھگڑا ہوا۔ محمد نے کمہار کے ایک گھونسا دیا اور ایک لات ماری وہ چلایا "دُہائی رحمت بھائی کی"

رحمت جھپٹ کر درمیان میں آگیا اور سینہ سپر ہو گیا اور کڑک کر بولا "خبردار! کیوں مارتا ہے"

"تو کون؟" خونفشاں آنکھوں سے محمد نے کہا۔

"ہم سب کوئی چل ہٹ پرے" یہ کہکر اس نے کمہار کو گھسیٹ کر بچایا۔ اور محمد نے اس کا پھر ہاتھ پکڑا۔ رحمت نے محمد کا ھاتھ چھڑایا۔ اس نے زور کیا تو رحمت نے محمد کو جھٹکا دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ محمد کی ایسی توہین ہو۔ محمد گرج کر رحمت پر پل پڑا۔ رحمت نے ایک مکا محمد کے جبڑے پر دیا کہ دوسرا ہوتا تو وہیں ڈھیر ہو جاتا اور محمد نے ایک مکا رحمت کے سینے پر دیا اور دونوں گتھ پڑے۔ پہلے تو دونوں میں پٹکا بازی ہوئی۔ معلوم دے جیسے گھن چل رہے ہوں۔ پھر گتھ گئے اور پھر گھن چلے اور پھر ریل پیل ہوئی۔ محمد ایک فولادی گولا تھا رحمت کو زور میں ریل پیل کر دور لیجاتا اور پھر جو رحمت سنبھل کر جھٹکتا تو محمد کو سنبھلنا دشوار ہوتا۔ پھر گھن چلنے لگے اور پھر گتھ گئے۔ رحمت نے محمد کا گلا ایسا دبایا کہ انگلیاں پیوست ہوتی معلوم دیں۔ اور محمد نے رحمت کے گلے میں کلائی ایسی اڑائی کہ جیسے گلا شکنجہ میں آ گیا۔ گاؤں کے لوگ بیچ بچاؤ کرنے آئے مگر بیکار۔ خود چوٹ کھا گئے۔ کس کی ہمت تھی جو اس آگ میں کودے۔ لوہے سے لوہا کٹ رہا تھا۔ مگر چند لوگوں کی ترکیب سمجھ میں آ گئی۔ جہاں دونوں لڑتے تھے وہ ذرا تنگ جگہ تھی۔ سڑک سی تھی۔ دوسری طرف سے کوئی پندرہ بیس مویشی ان دونوں کی طرف بے تحاشا ڈنڈے مار کر ہانک دئیے اور کتے مویشیوں کے پیچھے دوڑا دئیے اور دئیے لٹھ پہ لٹھ اور شور مچایا ہٹنا بچنا۔ ایک قیامت خیز زلزلہ کی طرح مویشی تنگ راستے میں جوشاں وخروشاں آئے کہ دونوں جنگ جو ایک دوسرے کو چھوڑ کر بھاگے کہ فوراً گاؤں کے بڑے بوڑھے اور عورتیں دونوں کے درمیان آ گئیں اور ایک ایک کو دس دس نے گھیر لیا اور بمشکل ان کے گھروں پر پہنچایا۔

حالانکہ لڑائی برابر کی تھی لیکن گاؤں میں ہلڑ ہو گیا کہ رحمت نے محمد کو پیٹا۔

مگر دوسرے ہی دن بڑے بوڑھوں نے دونوں کو گلے ملوا دیا اور قسمیں دیدیں۔ دونوں نے ایکدوسرے سے معافی مانگ لی معاملہ رفع دفع ہوا۔

(۴)

ایک دن گاؤں کے نوجوان طبقہ میں ہلچل مچ گئی۔ یہ کہ رحمت نے حلیمہ کے باپ کو پیغام دیا شادی کا۔ باپ نے پہلے تو منظور کر لیا۔ مگر حلیمہ کہتی ہے کہ میں چوڑیاں کوٹ کر کھا لونگی۔ کنوئیں میں پھاند پڑوں گی۔ جان دیدوں گی۔ لہٰذا باپ نے انکار کر دیا۔ یہ خبر صحیح تھی اس فرق کے ساتھ کہ حلیمہ کے باپ نے انکار نہیں کیا تھا بلکہ رحمت سے یہ کہا تھا کہ محمد کو ایک اور موقع دوں گا۔ رحمت کی بہن یہ خبر لائی تھی کہ حلیمہ جان دیدے گی۔ اور یہ خبر صحیح تھی۔ حلیمہ محمد کو چاہتی تھی اور اس نے ایسا کہا تھا۔ رحمت بہن کی بات سن کر مسکرایا اور سر کو جنبش دی۔ اسکی بہن نے ساری کہانی سنائی۔ یہ کہ حلیمہ کا محمد کے ساتھ دل ملا ہے اور وہ کسی طرح راضی نہ ہو گی۔

رحمت نے جل کر کہا: "میں اسے زبردستی راضی کروں گا۔ وہ راضی ہو کچھ پرواہ نہیں اس کے راضی ہونیکی ضرورت نہیں ہے"

وہ بولی: "محمد سے جھگڑا ہو گا"

رحمت نے اپنے زبردست شانوں کو جنبش دیکے کہا: "دیکھا جائیگا"

اور سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی لڑکی کا عشق بھی اپنے باپ اور بھائیوں کی مرضی کا تابع ہے۔ جن کی آنکھ کے اشارے پر وہ اپنے سچے عاشق اور دلبر کو بھول سکتی ہے۔ وہ تو جائز عشق پر مرتی ہے۔ وہ عشق جو والدین کی مرضی اور اجازت سے ہو۔

(۵)

دوپہر کا وقت تھا۔ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ حلیمہ کنوئیں سے باغ میں ہوتی آرہی تھی۔
ایکدم سے محمد سامنے آیا۔ حلیمہ ٹھٹک کر اور شرما کر رہ گئی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر کہا:۔
"دھوکا تو نہیں دیگی؟"
وہ کچھ نہ بولی۔
"میری ہے نا؟"
وہ پھر بھی کچھ نہ بولی۔
"حلیمہ.... حلیمہ..... حلیمہ ری...."
وہ کچھ نہ بولی۔ تو پھر اس نے ہاتھ کو اس کے جھٹکا اور حلیمہ نے ایک لمبی سانس لی اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔
محمد بیتاب ہوگیا اور اس نے پھر خدا کا واسطہ دیکر پوچھا لیکن وہ پھر بھی نہ بولی مگر ہاں اس نے محمد کی طرف دیکھا ضرور۔ کس طرح؟ اس طرح کہ محمد کا چہرہ مارے خوشی کے چمکنے لگا۔
محمد نے چلتے چلتے لپک کر پھر ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولا "اگر تیرا باپ نہ مانا تو؟.... میرے ساتھ پردیس چلے گی؟"
حلیمہ نے سر کی جنبش سے اقرار کیا۔ محمد نے تکرار سے معاملہ پختہ کیا۔
دراصل وہ دل سے محمد کو چاہتی تھی۔ دو سال سے محمد امیدواری اور خدمت کر رہا تھا۔ ہر جگہ آنکھیں بچھاتا تھا۔ حلیمہ کا سورما کہلاتا تھا

(۶)

محمد نے کہا: "یہ تو کیا کرتا ہے؟"
رحمت نے جواب میں قہقہہ لگایا۔
محمد نے سنجیدگی سے اس کو سمجھایا: "یہ کہ "حلیمہ میری ہو چکی۔ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ تیری نہیں ہو سکتی۔ وہ جان دیدیگی۔ کیوں غریب کی جان لیتا ہے؟"
رحمت نے قہقہے پر قہقہہ لگایا۔ کہنے لگا: "ابے جا۔ جان دینا آسان نہیں ہے۔ تیرا دل خوش کرتی ہوگی۔ لڑکی کا کیا ہے۔ پانچ منٹ میں میری ہو جائیگی۔ اور تیری کہاں سے آئی؟..... تو کون دعویدار؟ پیسہ نہ کوڑی آئے وہاں سے۔ میں تجھے روکتا ہوں؟ جا کرلے۔ روک لے۔"
محمد نے غصہ کو ضبط کیا۔ سر کو جنبش دی اور کہا: "اچھا روک لوں گا۔"
"ہاں روک لینا۔"
محمد نے پھر کہا: "ہاں روک لوں گا۔" اور اٹھکر چلا گیا۔
ایک دس قدم گیا ہوگا کہ رحمت نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور اس کے کمزور خوشامدیوں نے آوازے کسے: "وہ جاتا ہے"... "لینا"
کس قدر مقامِ عبرت تھا۔ وہ لوگ آوازے کسیں جن کو محمد کل تک رگڑ دیتا تھا۔

محمد نے مڑ کر ایک دفعہ دیکھا اور پھر سیدھا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

(۷)

حلیمہ اور رحمت کی بہن اسی باغ میں سے ساتھ ساتھ گذر رہی تھیں۔ سر پر دونوں کے گھڑے۔

بے خبری میں رحمت ایک درخت کی آڑ سے نکلا۔ اور اس نے اپنے طاقتور ہاتھ سے حلیمہ کے سر پر سے پانی کا بھرا ہوا گھڑا پھول کی طرح اٹھا لیا۔ اس نے گھبرا کر مڑ کر دیکھا۔ اور رحمت کی بہن قدم بڑھا کر ذرا آگے نکل گئی۔

رحمت نے گھڑے کو رکھکر ایک دم سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ حلیمہ بکھر گئی۔ بے انتہا ارمان کر مچھلی کی طرح تڑپ گئی اور ایک چیخ ماری۔

"اری سُن تو" جھٹک کر رحمت نے کہا "ایک بات سُن لے۔ بغیر سُنے نہیں جانے دوں گا"

اور یہ کہہ کر اس نے پُشت پر سے جھولی سر کا کر اتاری اور ایک دھماکے کے ساتھ اس کو حلیمہ کے پیروں میں ڈال دیا۔ حلیمہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک جھنکار کے ساتھ ایکہزار روپیہ نقد کھنا کھن بولتا اس کے پیروں میں پڑا تھا۔ اور اس پر سونے اور چاندی کے زیور کا ڈھیر۔

"یہ لے"

یہ کہکر ہاتھ چھوڑ کر رحمت ایک سمت چل دیا اور قریب کی جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

حلیمہ کے ہوش بجا ہوئے تو اس نے غور سے روپیہ اور زیور کی طرف دیکھا۔ اس نے اتنا روپیہ اور زیور کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اس کو ڈر لگا۔ وہ پیچھے ہٹی سر اٹھا کر دیکھا کہ رحمت کی بہن کھڑی دُور سے مُسکرا رہی ہے۔ وہ جھینپ گئی۔ اور وہ چلائی وہیں سے "اری لیلے سب" اور ایک دم سے حلیمہ گویا چونک پڑی۔ اور جھٹ سے اس نے لپک کر اپنا گھڑا اٹھایا اور جلدی سے ایک نظر نقد اور زیور پر ڈالی۔ رحمت کو نظروں سے تلاش کیا مگر نہ ملا۔ ایک دم سے قدم بڑھا کر چل دی اور رحمت کی بہن سے جا ملی۔ اس سے بہن کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی۔ اور اس نے ایک با معنی چٹکی حلیمہ کی لی۔ مگر حلیمہ پر شرم کا غلبہ تھا وہ چُپ کی چُپ رہی اور رحمت کی بہن بھی خاموش رہی۔

گھر پر رحمت نے بہن سے پوچھا "کیوں ری! جیتی کہ ہاری؟"

اس کی بہن نے آنکھوں میں چمک پیدا کر کے مُسکرا کر کہا "جیت گئی"

(۸)

محمد سے حلیمہ کے باپ نے اب گھٹا کر صرف سو روپیہ کا چڑھاوا مانگا اور ہفتہ بھر کی مہلت دی مگر اس سے وہ بھی نہ بن پڑا۔ تو اس نے کہدیا کہ وہ رحمت کا پیغام قبول کر لیگا۔ محمد نے ظاہر احصبر کیا۔

حلیمہ کے باپ نے رحمت سے بھی دوسو روپیہ کا چڑھاوا زیور وغیرہ مانگا تھا۔ اور گاؤں میں ہلڑ مچ گیا جب رحمت نے دوسو کی بدلے پورے پانچسو روپیہ نقد جھولی کی جھولی حلیمہ کے باپ کے سامنے لوٹ دی اور اسی قیمت کے زیور سونے چاندی کے علاوہ پٹخ دئے اور گرجکر بولا۔ "کہو چچا کچھ اور . . ."

حلیمہ کا باپ گھبرا گیا۔ سب دیکھنے والے دھک کا سا کھا گئے۔ حلیمہ کی ماں دُور سے جھانک رہی تھی اور اسی کے پاس ٹٹی کی آڑ سے حلیمہ

بھی دیکھ رہی تھی ۔ ایسے کہ کسی کو خبر تک نہ ہو ۔ پھر رحمت نے حلیمہ کے باپ کے قدموں میں صافہ رکھدیا اور پھر ہاتھ جوڑ کر اور چلّا کر کہا "سب پنچ لوگ گواہ رہنا ۔ میں اُن کا غلام ہو کر رہوں گا اور جو ان کی لڑکی کو تکلیف دوں تو جو چور کا حال سو میرا ۔"

اور حلیمہ کے باپ نے دعائیں دیں اور اس کا صافہ اٹھا کر اپنے ہاتھ سے پہنا دیا ۔

اس بات نے سارے گاؤں میں آگ سی لگادی ۔

ظاہر ہے کہ محمد کا وہ حال کہ زمین سخت اور آسمان دُور ۔ مگر نہیں اس کو اطمینان تھا کہ یہ ڈرامہ حلیمہ کی فراری پر ختم ہوگا ۔ وہ حلیمہ کو لیکر پردیس چلدیگا ۔

(۹)

محمد موقع کا منتظر تھا اور ایک روز اس نے گاؤں کے باہر موقعہ سے رحمت کو گھیر لیا ۔ رحمت کے پاس ایک کلھاڑی تھی ۔ محمد نے کہا "آج ہی اپنی مانگ اور چڑھاوا واپس لے " رحمت نے انکار کیا تو محمد نے جنگ کا چیلنج دیا ۔ رحمت نے چیلنج نامنظور کیا تو اس نے راستہ روک لیا ۔

"ہٹ جاؤ راستہ سے ۔" رحمت نے گرجکر کہا لیکن جب محمد نے اپنی خوفناک گولے دار لاٹھی سنبھالی تو وہ غصہ پی کر پھر خاموشی سے گردن جھکا کر اسی پتھر پر بیٹھ گیا جہاں سے اٹھا تھا ۔ اور اس نے اپنی کلھاڑی زمین پر ٹیکا کر اس کے خوفناک پھل کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی ٹھوڑی ٹکالی ۔ ایک مُسکراہٹ ۔ حقارت آمیز مُسکراہٹ اُس کے چہرے پر آئی ۔

"فیصلہ کیوں نہیں کرتا ؟" محمد نے اپنے قوی بازوؤں سے لاٹھی کو جنبش دیتے ہوئے کہا ۔

"اس لئے کہ . . . ." رحمت نے سر اُٹھا کر کچھ رُک کر کہا "اس لئے کہ اس خوفناک کلھاڑی سے میں تمھارے اور تمھاری لاٹھی کے ٹکڑے ٹکڑے کرسکتا ہوں ۔"

ایکدم سے رحمت کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے اور اس نے اپنے قد آور جسم کو ایک خوفناک جنبش دی ۔

محمد مُسکرا کر بولا "تو پھر آجاؤ نا ؟"

رحمت نے کہا "میں تجھے نہیں مار سکتا ۔ میں نے قرآن اٹھایا ہے کہ کسی کو جان سے نہیں ماروں گا ۔ . . ."

"ارے ! یہ کب ؟" محمد نے ہنس کر کہا ۔

رحمت نے سنجیدگی کے ساتھ قصہ سنایا ۔ سندھ کی طرف ایک آدمی کو اس نے قتل کر دیا تھا ۔ جج نے پھانسی کا حکم سُنایا ۔ ہائیکورٹ میں اپیل پر دو جج تھے اور دونوں میں اختلاف ہوگیا ۔ ایک نے کہا پھانسی ہو اور دوسرے نے کہا بری ہو ۔ تین دن تک بحث رہی اور رحمت کی موت وزندگی ایک ڈورے میں جھولا کی حتی کہ معاملہ تیسرے جج کے سپرد ہوا ۔ اس نے پہلے دن پھانسی کی رائے سے اتفاق کیا ۔ مگر رحمت کے وکیل نے مزید بحث کی مہلت چاہی ۔ اور دوسرے دن مقدمہ جیت لیا ۔ رحمت بری ہوگیا ۔ جس دن چھوٹا اسی دن مسجد میں جاکر نمازِ شکرانہ ادا کر کے اس نے قرآن اٹھایا کہ اب کسی کی جان نہیں لوں گا ۔

محمد نے یہ قصہ سُنا تو خوب ہنسا اور کہا "ابے جا بے بُزدل . . . . لے اب تیار ہو . . . . سنبھل . . . . تیار . . ہوشیار . . . . . یا علی . . . ."

ایک خوفناک ہونکارے کے ساتھ محمد اپنی زبردست لاٹھی کو جنبش دیتا ہوا۔ پینترہ بدلتا۔ یا علی کا نعرہ مارتا رحمت پر حملہ آور ہوا۔
رحمت کی پوزیشن نازک تھی۔ لاٹھی اس کے پاس نہ تھی اور کلہاڑی اس کی قسم کے ساتھ بیکار۔ مگر کیا کرتا۔ بل کھا کر وہ بھی اٹھا اور اپنا بچاؤ کرتا پیچھے ہٹتا۔ اس نے وار پہ وار خالی دیئے۔ اچھل کر۔ بھاگ کر۔ ہٹ کر۔ اپنی کلہاڑی پر روک کر۔ وہ اس کا منتظر تھا کہ موقع ملے تو لپٹ پڑوں۔ اور جلد اس کو موقع مل گیا۔ وزنی لاٹھی نے جھونک کھایا بجلی کی طرح تڑپ کر کلہاڑی پھینک کر اس نے سینہ سے سینہ ملا دیا۔ محمد نے بھی لاٹھی چھوڑ دی اور دونوں گتھ گئے۔ پیشہ ور کی طرح۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ جوش و خروش کے ساتھ۔ دونوں جوان تھے ایسے کہ جوانی پھٹی پڑتی تھی۔ محمد چوڑے چکلے سینہ کا فولادی بدن کا پستہ قامت، سینہ معلوم دے چکی کا پاٹ اور شہتیر کی طرح فولادی بازو۔ ایک فولادی گولا تھا۔ اُدھر رحمت خاں قد آور، دیو ہیکل، اسی مناسبت سے کلہ جبڑا، لانبے اور قوی ہاتھ۔ بلا کا طاقتور۔
دونوں پوری قوت سے لڑے۔ وہی مکا بازی ہوئی۔ دھکا پیل اور ریلا پیلی ہوئی۔ دونوں کے منہ لہولہان ہو گئے۔ خوفناک کشتی ہوئی۔ اور اسی طرح دونوں گتھے ہوئے تھے کہ گاؤں والے آ گئے۔ جب کسی طرح چھڑائے نہ چھوٹے تو بڈھوں نے عورتوں کو حکم دیا کہ پل پڑو اور کوئی بیس پچیس عورتیں دونوں کو مارنے پل پڑیں۔ تلے اوپر پل پڑیں کہ دونوں کو پیس کر دھر دیا۔ دونوں علیحدہ ہو گئے۔ اور مثل سابق ہر ایک کو دس پندرہ نے اپنے نرغے میں لیلیا۔ بہت جلد معلوم ہو گیا کہ دونوں میں مثل سابق صلح کرانا ناممکن ہے۔ رحمت تیار تھا مگر محمد نے انکار کر دیا۔

(۱۰)

شادی کا قرب آیا۔
گاؤں کی نوعمر لڑکیاں حلیمہ پر رشک کرتی تھیں تو محمد سے ہمدردی۔ محمد خاموش تھا۔ اِدھر اُدھر نکلتا بیٹھتا تو سایہ کی طرح۔
کوئی بھی راہگیر فقیر۔ گانے بجانے والا۔ نٹ۔ جوگی۔ غرض کوئی بھی گاؤں میں آ نکلے تو سارے گاؤں کو تماشہ دکھاتا اور گاتا سناتا اور اس کی اُجرت رحمت دیتا۔
جو سنار حلیمہ کا زیور بنا رہا تھا وہ تین کوس پر رہتا تھا اور حلیمہ کا بھائی روزانہ اس کے پاس جاتا تھا کیونکہ رحمت نے نقد اور زیور دیکر کہہ دیا تھا کہ جیسے چاہے بنواؤ۔ زیور اور نقدی کے قصے الف لیلیٰ کی داستان کی طرح دُہرائے جارہے تھے۔ اور رحمت کے پاس پندرہ ہزار کی مالیت بتائی جاتی تھی۔

(۱۱)

محمد نے اپنے ایک دوست کا تیز اُونٹ مانگ لیا تھا کہ اس پر حلیمہ کو لیکر اُڑ جائیگا۔ محمد نے مغرب کے دُھندلکے میں انتظار کیا۔
مگر وہ نہیں آئی۔ تاروں کی چھاؤں میں انتظار کیا اور وہ نہیں آئی۔ شب کی تاریکی دم توڑ رہی تھی اور تارے رخصت ہو رہے تھے۔ اور محمد منتظر کا منتظر رہا حتیٰ کہ سورج نکل آیا۔ وہ نہیں آئی۔ ہر پیغامبر یہی معذرت لایا کہ موقع نہ ملا۔ وقت نہ نکل سکا۔ پھر یہ خبر آئی کہ اس نے سُنی ان سُنی ایک کر دی۔ توجہ نہیں کرتی۔ کوئی جواب نہیں دیتی۔ بات نہیں کرتی۔ اور آخری خبر حد درجہ دل شکن تھی۔ اس نے دھمکی دیکر کہا کہ خبردار جو مجھ سے ایسی بات پھر کہی۔
محمد حیرت میں رہ گیا! کیا یہ بیوفائی ممکن تھی۔ اور وہ بھی حلیمہ سے! ناممکن! ناممکن! در اصل وہ باپ بھائی اور مخالفوں کے نرغے

ہیں ایسی لگوری ہے کہ وہ اس کو دم بھر کو نکلنے نہیں دیتے ۔

لیکن پنگھٹ پر نوعمر لڑکیوں کی بات بھی حد درجہ دلخراش ہوگئی ۔ لڑکیاں کہتی تھیں کہ حلیمہ تو اب رحمت کے گیت گاتی ہے ۔ محمد کے نام سے چڑتی ہے ؟"

"سب جھوٹ" محمد جل کر دل کو سمجھاتا ۔ اب نہ سہی شادی بعد سہی ۔ حلیمہ میری ہے ۔ موقع ملنے کی دیر ہے ۔

(۱۲)

محمد کو یقین کامل تھا اور وہ ڈر رہا تھا کہ اگر حلیمہ کو آنیکا موقع نہ ملا تو وہ خودکشی کریگی ۔ باوجود پیغامبروں کے دل شکن جوابات کے اس کا یقین کیا بلکہ عقیدہ تھا ۔

شادی کی تاریخوں میں وہ گاؤں سے باہر چلا گیا ۔ اور ہر لحہ حلیمہ کی خودکشی کی خبر کا منتظر رہا ۔ مگر شادی ہوگئی اور حلیمہ نے خودکشی نہیں کی اور محمد کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اب خوش ہو یا رنجیدہ ؟ خودکشی کی خبر سُنکر اس کا کیا حال ہوتا ۔ رنج ہوتا ؟ خوشی ہوتی ؟ خوشی نہ ہوتی ۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ خودکشی کی خبر نہ آنا ایک زبردست صدمہ سا تھا ۔ ایک سخت اور عجیب وغریب ضرب ! غرض شادی ہوگئی ۔ اسی خوشی اور کامیابی کے ساتھ جو عام دستور ہے ۔

محمد نے معلوم کرنا چاہا کہ حلیمہ نے خودکشی کی کوشش کی یا نہیں تو معلوم ہوا کہ کوشش درکنار وہ تو خوش تھی بیحد خوش ۔

مگر ان باتوں پر محمد نے یقین نہیں کیا ۔ خودکشی نہیں کی ۔ لہٰذا اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ بہت جلد اس کے ساتھ پردیس چلی چلیگی ۔

(۱۳)

شادی کے مشاغل بھی حلیمہ کیلئے عجیب وغریب تھے بھینیں ۔ گائیں ۔ بیل ۔ کھیت کے نوکر چاکر سب رحمت کے باپ کی زیر نگرانی تھے اور خود رحمت اپنے کمرے میں وہ اور حلیمہ دن بھر گراموفون بجایا کرتے ۔ حلیمہ کیلئے یہ عیش عجیب وغریب تھا ۔ اس کی چھوٹی مندیں پر لٹھے پکا پکا کر کھلاتیں ۔ کوئی کام نہیں ۔ کھانا پینا اور سو رہنا ۔ ایک ڈیڑھ مہینہ اسی طرح عیش میں نکل گیا ۔ اور اس ڈیڑھ ماہ میں حلیمہ کچھ سے کچھ ہوگئی ۔ گھر سے باہر نکلنے تک کی اسے فرصت نہ تھی ۔ بلکہ یہ مشہور ہو رہا تھا کہ رئیسوں کی طرح اب وہ پردہ میں رہیگی ۔

رفتہ رفتہ حلیمہ مثل سابق گاؤں میں نکلنے بیٹھنے لگی ۔ جو دیکھتا اُسے حیرت میں رہ جاتا ۔ خدا کی شان نظر آتی ۔ سونے چاندی میں غرق ایک چمکتی ہوئی تصویر تھی کہ ایک تارا جو تیرتا ہوا آسمان میں چمکتا چلا جا رہا ہے ۔

اس کی ہر جنبش میں رعنائی و دلبری تھی اور لوگ اس کی چال ڈھال دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ۔ ع

دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے جھک جائیں !!

اس کا حُسن پُرشکوہ تھا ۔ سر سے پیر تک نسوانی وقار کی ایک مغرور مگر دلکش تصویر ! کشیدہ اور بلند قامت ۔ وہ جھومتی ہوئی چلتی ۔ اور جو دیکھتا وہ دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ۔ شادی اور عیش نے کچھ کا کچھ کر دیا ۔

اور اس حالت میں کوئی لڑکی یا بڑھیا محمد کا پیغام لیکر جو پہنچتی تو مارے ڈر کے اس کی ہمت ہی نہ پڑتی ۔

محمد اوّل تو نظر نہ پڑا اور نظر پڑتا بھی کیسے حلیمہ نے اپنے حُسن اور عیش کے غرور میں ویسے بھی ادھر اُدھر دیکھنا چھوڑ دیا تھا کہ دیکھنے والے اس کے لُطفِ دید سے محروم نہ ہوں ۔ کیونکہ جب کبھی وہ آنکھ اُٹھا کر دیکھتی تو سب کو اپنی طرف دیکھتا ہوا پاتی اور اُن کے دیکھنے

میں مخل نہ ہوتی ۔

(۱۴)

وقت کے گذرنے سے معاملات اپنی قدیمی رفتار پر آگئے۔ گاؤں پھر گاؤں ہے اور کسان پھر کسان اور حلیمہ ایک کسان کی بیوی تھی، عیش و عشرت کا ریلا ختم ہوا۔ اور لوگوں نے دیکھ لیا کہ یہ تو وہی محنتی اور جفاکش حلیمہ ہے۔ اسی طرح کنوئیں پر جانا۔ اسی طرح مویشی سنبھالنا۔ اسی طرح شوہر اور سسرے کی چاکری۔

برسرِ عام محمد اسے بچاتا اور وہ اُسے۔ اور محمد کیلئے اب کوئی لطف اگر دُنیا میں تھا تو حلیمہ سے امید وفا! جی ہاں!! وہ فکر میں تھا۔ محمد کے پیغام دینے والے خود جی چھوڑ چکے تھے۔ لہٰذا اب محمد خود حلیمہ سے ملنے کی تاک میں تھا۔

(۱۵)

ایک دفعہ حلیمہ اُسے ایک کھیت کے نشیب میں ملی۔ یہ پہلی دفعہ ملی۔ محمد نے آکر سوال کیا۔ حلیمہ نے عذر کیا کہ اس کو کوئی موقعہ گھر سے نکلنے کا نہ ملا۔ اور وہ مجبور تھی اور یہ کہ اس نے کسی پیغامبر کو نہیں دُھتکارا۔ وہ مجبور تھی۔ تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ اس کی خطا نہ تھی۔ جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔

محمد نے کہا کہ اب وہ اس کے ساتھ چلی چلے تو اس نے اپنی خوبصورت آنکھوں سے محمد کو دیکھا۔ اور پھر نظریں نیچی کرلیں۔ دو دفعہ اسی طرح کیا اور بس۔ محمد نے زور دیا تو وہ روتی ہوئی چلی گئی۔ اور محمد کا کلیجہ ہل گیا۔

محمد پھر اُسے باغ میں ملا اور پھر اُس نے وہی کیا اور پھر محمد اس کے پیچھے پڑگیا۔ بار بار ملتا اور وہ چُپ رہتی۔ ایک دن رحمت نے گرج کر حلیمہ سے پوچھا "کیا تجھے ملا تھا؟"

حلیمہ لرز گئی۔ سہم گئی "ہاں ملا تھا" اس نے دبی زبان سے کہا "اور وہ تجھے بھگا لیجائیگا؟" رحمت نے پوچھا۔ ایک مسکراہٹ رحمت کے چہرے پر تھی۔ اور حلیمہ نے بگڑ کر کہا "جو خود بھوکا ہو وہ کیا کسی کو بھگا لے جائیگا۔ . . . مگر ہاں وہ ضرور بھگا لے جائیگا مجھے . . . . . . اس لئے کہ کمزور کی جورو ہوں . . . . . اور ہاں وہ تمھیں پیٹے گا بھی . . . . "

رحمت ہنسنے لگا اور اس نے ہلکے سے ایک طمانچہ مارا۔ پھر ایکدم سے سنجیدگی سے کہا "خبردار جو اس سے پھر کبھی بات کی" اور حلیمہ نے دیکھا کہ اس کے دیوہیکل شوہر کا کیا مطلب ہے۔ یہ کہ اس کے حکم کی تعمیل ہو اور اگر نہ ہو تو حلیمہ اس کے تصوّر ہی سے کانپ گئی۔

(۱۶)

محمد نہیں مانا وہ حلیمہ کے پیچھے پڑگیا۔ حلیمہ حیران ہوگئی۔ اُسے محمد سے ہمدردی تھی۔ وہ اپنے دیوہیکل شوہر کو بیحد چاہتی تھی اور جتنا چاہتی تھی اتنا ہی اس سے ڈرتی بھی تھی۔ اور اب محمد ایک عزیز بھائی سے زیادہ اس کے دل میں کوئی وقعت نہ رکھتا تھا۔ جب وہ تنگ آگئی تو پہلے تو اس نے لاپرواہی برتی۔ پھر تیور چڑھائے۔ اور پھر آخر کو ایک روز محمد کو جھڑک دیا "شرم نہیں آتی تجھے" اس نے چیخ کر اور نڈر ہو کر زور سے کہا "کس نے تجھے منع کیا تھا میں تو تیری تھی۔ تو نے خود چھوڑا۔ سو روپے بھی میرے لئے تو نے نہ نکالے اور اب آیا ہے وہاں سے۔ میں اپنی عزت و آبرو نہیں گنواؤں گی۔ میرے باپ نے جسے سونپ دیا میں اس کی ہو گئی۔

نہ میں پہلے تیرے ساتھ بھاگتی اور نہ اب۔ اب تو میرا بھائی اور زینب تیری بہن۔ چل آ میرے ساتھ۔ چل میرے گھر۔ مجال نہیں رحمت کی جو بول بھی سکے۔"

اور محمد نے جھنجلا کر کہا کہ "ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں" اور اپنی ضد پر قائم رہا۔ اور وہ بڑبڑاتی چلی گئی۔

(۱۷)

محمد نے تقاضوں کے مارے حلیمہ کی زندگی تلخ کر دی کہ میرے ساتھ نکل چل۔ یہاں تک کہ حلیمہ نے اب اس کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ اور آخری دھمکی یہ دی کہ وہ اپنے شوہر سے کہہ دے گی۔ اُدھر محمد نے خونی آنکھوں سے اس کو ایک آخری مہلت دی کہ سوچ لے اور سیدھی طرح اس کے ساتھ پردیس چل دے۔ ورنہ . . . .

"تو کیا کر لیگا؟" حلیمہ نے کہا "کیوں میری عزت و آبرو کے پیچھے پڑا ہے . . . . دور ہو"

وقت گذر گیا اور حلیمہ نے توجہ بھی نہ کی۔ ایک دن صبح کا سہانا وقت تھا۔ حلیمہ پانی لینے کئی عورتوں کے ساتھ آئی تھی کہ محمد نے ایک دم سے نکل کر کہا "چل میرے ساتھ" ظاہر ہے کیا جواب ملا ہوگا۔ اور محمد نے اپنی چوڑی پھل والی کلھاڑی لیکر۔ ادھر وہ حقارت آمیز دھتکار کے ساتھ گھومی ہے اور ادھر اس کی پشت پر ایک بھرپور کلھاڑی کا دوہتڑ دیا۔ ایسا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی کو خیارہ کی طرح کاٹ کر کلھاڑی چار انگل بدن میں پیوست ہو گئی۔ حلیمہ زمین پر گری۔ اور بل کھا کر چت جو ہوئی تو ایک اور کلھاڑی کا ہاتھ دیا کس کر کہ کلھاڑی اس کے سینے میں غرق ہو گئی۔ اور پھر اس کی چوٹی کو پیر سے دبا کر کلھاڑی کھینچ کر ایک اور ہاتھ جو مارا ہے تو دانتوں اور ٹھوڑی کو چیر کر رکھ دیا۔ حلیمہ کو قتل کر کے محمد دیوانہ وار بھاگا۔

سارے گاؤں میں بلڑ ہو گیا۔ رحمت اُدھر سے اپنی زبردست لاٹھی لیکر گرجتا ہوا چلا اور اس نے مع دو چار ساتھیوں کے محمد کو میدان میں جا لیا۔ محمد کو جلدی لوگوں نے بے قابو کر کے باندھ لیا اور رحمت کو خفیف مار پیٹ سے آگے کچھ بھی نہ کرنے دیا۔ اسے پولیس کے حوالے کر دیا اور رحمت بدلہ لینے کو تڑپتا رہ گیا۔

(۱۸)

حلیمہ کی لاش ایک دل دہلا دینے والی شے تھی۔ حسن اور خون! اللہ اکبر! اس کی قابلِ رشک جوانی اور رعنائی خاک و خون میں غلطاں تھی۔ پُرشباب اور یہ خون کی کیچڑ! الٹ پٹ!! رحمت ایسا دیوہیکل جوان اس نے مارے غم کے اپنی چھاتی پیٹ لی اور سینہ کوٹتا ہوا حلیمہ کے لاشے پر گرا۔

سارا گاؤں کیا اس خبر سے سارا علاقہ ہل گیا۔ محرم کے ڈھول کی طرح رحمت اپنا چوڑا چکلا سینہ کوٹتا تھا۔

حلیمہ کا حسن اور اس کی جوانی ایک کہانی ہو کر رہ گئی۔ ایک کھنچی ہوئی تصویر تھی کہ ایک دم سے مٹ گئی۔

جو ہونا تھا وہ ہو چکا مگر سب کا تقاضہ تھا کہ خون کے بدلے خون۔ محمد کو پھانسی ہونا چاہیے۔

(۱۹)

جج نے محمد کو پھانسی کا حکم دیا اس نے اپیل کی۔ وہاں دو جج تھے اور محمد مطمئن تھا کہ دونوں میں اختلاف ہوگا۔ وہ رحمت سے سُن چکا تھا۔ اس نے بھی منت مانی کہ چھوٹ گیا تو رحمت کی طرح مسجد میں قرآن اٹھاؤں گا۔ اس کو قوی امید تھی کہ وہ چھوٹ جائیگا۔ رنج تھا تو یہ کہ رحمت کو قتل نہ کر سکے گا۔ مگر وہاں تو دونوں جج ایک رائے ہو گئے۔ اور انھوں نے اپیل خارج کر کے پھانسی کا حکم بحال رکھا۔ محمد فیصلہ سنتے ہی ہکا بکا

رہ گیا۔ اور عدالت میں رو پڑا اور کانپتا ہوا جیل میں لایا گیا۔ وہاں اُسے مارے دہشت کے بخار چڑھ آیا۔ مگر دوسرے دن وہ ٹھیک ہو گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سال بھر کا مریض ہے۔

آخری تدبیر دربار میں رحم کی درخواست تھی۔ اور وہ بھی نامنظور ہوئی۔ اُسے مطلع کیا گیا کہ تم کو فلاں دن صبح چار بجے پھانسی ملیگی۔ اگر کسی عزیز قریب سے ملنا چاہو مل لو۔ محمد نے اپنے باپ، بہن اور ماموں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور ان کو خط لکھوایا کہ میرے والد اور ماموں صاحب اور بہن کو معلوم ہو کہ مجھے فلاں دن صبح چار بجے پھانسی ملے گی۔ لہٰذا اس سے پہلے مجھ سے مل لو۔ اور میری بکریاں سب کی سب میرے بھانجے احمد کو دیدو۔ اور گاؤں میں سب جان پہچان والوں سے میرا سلام کہنا اور کہا سُنا معاف کریں۔

(۲۰)

جیل کی تاریک کوٹھڑی میں محمد سر پیٹ رہا تھا۔ وہ اپنے طاقتور بازوؤں کو دیکھتا تھا کہ افسوس یہ اب شل ہوں گے اور اس کا جی اُلٹنے لگتا۔ ایک لمبی سانس لیکر وہ کہتا "ارے مجھے چھوڑ دو۔ اب کسی کو نہیں ماروں گا"

جیل کے جمعدار گھومتے ہوئے آئے "کہو محمد کیا حال ہے۔ اللہ اللہ کرو"

اور محمد نے جمعدار سے پوچھا "پھانسی کیسے لگتی ہے؟" پہرہ کا سپاہی مُسکرا کر بولا "بھیّا جلدی کیا ہے۔ اب دیکھ ہی لوگے" اور محمد نے سہمے ہوئے لہجہ میں کہا "بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔ کتنی دیر لگتی ہے؟ کیسے لگتی ہے؟"

سپاہی بولا (چٹکی بجا کر) "اتنی دیر میں لگ جاتی ہے۔ آنکھ جھپکتے کام ہوتا ہے۔ اب دیکھ ہی لوگے تم۔ بس گلے میں پھندا لگا اور کھٹکا دبا نہیں کہ ایک جھٹکے میں ختم"

محمد سچ مچ لرز گیا۔ اس نے اپنا گلا گھٹتا محسوس کیا۔ سپاہی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ بولا "بہادر ڈرتے کیوں ہو اس میں کاہے کا ڈرنا۔ تم نے اس لڑکی کو چیر کر پھینک دیا۔ اس کی آدھی بھی تکلیف نہ ہوگی"

اور محمد پھر سہم گیا۔ اور چہرہ اس کا فق ہو گیا۔ ایسا کہ جمعدار نے سپاہی کو ڈانٹا "اب کیوں ڈراتا ہے اُسے" "بھائی محمد اللہ اللہ کرو"

اور سہمی ہوئی آواز میں محمد نے کہا۔ جیسے روتے ہوئے "اللہ اللہ"

اور سپاہی نے قہقہہ لگایا "یار تم تو بن پھانسی مرے جاتے ہو۔ پھر اس بیچاری لڑکی کو کیوں مارا۔ سنتے ہیں بڑی حسین تھی۔ . ."

محمد سہما ہوا بیٹھا رہا۔ کچھ نہ بولا گیا۔

(۲۰)

رات بھر محمد کو نیند نہ آئی۔ صبح ہوتے آنکھ جھپکی تھی کہ خواب میں دیکھا کہ پھانسی ہو گئی۔ جاگ اٹھا۔

جمعدار ایک تولنے کا کانٹا لایا۔ اور اس پر محمد کو بٹھا کر اس کا وزن لیا اور ایک فیتہ سے اس کے قد کی لمبائی ناپی۔ وجہ نہ بتائی۔ جب وہ چلے گئے تو سپاہی نے بتایا۔ کہنے لگا "بھائی تیاری ہو رہی ہے۔ تمھیں ناپا اس لئے کہ معلوم ہو جائے کتنے لمبے ہو۔ اتنی ہی رسّی لمبی رکھیں گے کہ تمھارے پاؤں زمین پر نہ ٹِک جائیں اور تم ہوا میں لٹکتے رہو"

"اور تولا کیوں ہے؟"

"تولا تم کو اس لئے ہے کہ کتنے اُونچے سے تمھیں گرائیں۔ ایسے کہ گردن پر خوب جھٹکا لگے۔ جتنا آدمی ہلکا ہوتا ہے اتنا ہی رسّی کو

لمبا کرتے ہیں کہ جھٹکا خوب آئے ۔ ۔ ۔ ۔"

"ارے بھیا ۔ مجھے بچاؤ ۔ ۔ ۔ ۔" گھبرا کر بات کاٹ کر محمد نے کہا اور سپاہی نے قہقہہ لگا کر کہا: "اے یار! تم تو بن پھانسی مرے جاتے ہو ۔ تم تو بھاری آدمی ہو ایک جھٹکے میں گردن ٹوٹ جائیگی ۔ ذرہ بھر تکلیف نہ ہوگی۔"

"گردن کیسے ٹوٹ جائیگی؟"

سپاہی نے کہا: "پھانسی میں گردن ٹوٹ جاتی ہے ۔ ہڈی ٹوٹ جاتی ہے۔"

"اور کیا ہوتا ہے؟"

"بعض وقت زبان باہر نکل پڑتی ہے۔"

محمد لرز گیا ۔ بولا "دم گھٹ جاتا ہوگا۔"

"دم وم کا ہے کا گھٹنا ۔ گردن ٹوٹی نہیں کہ غائب ۔ کیا یار تم نے بھی کیا ۔ عورت مار کر پھانسی پہ جاتے ہو ۔ ارے مارا ہوتا کسی مرد کو ۔ اس کے خاوند کو مارا ہوتا ۔ مگر سنا ہے وہ بڑا اکڑا ہے یقیں بن پھانسی چپٹی کر ڈالتا۔"

محمد نے بھولے پن سے یہ سنا ۔ گلے میں آواز گھٹ کر رہ گئی ۔ کچھ نہ بولا ۔ سہما بیٹھا رہا ۔

(۲۱)

باپ اور ماموں اور بہن سے ملا ۔ وہ سب رو رہے تھے ۔ اس نے سب کو تسلی دی ۔ بڑی دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا ۔ آخر چلنے کا وقت آیا ۔ عبرتناک سین تھا ۔ بڈھے باپ نے آہ سرد کھینچی ۔ چھ بیٹوں میں صرف یہی تھا جو کل ختم ہو رہا تھا ۔ وقت ختم ہوا اور سپاہی نے کہا کہ "بڑے میاں اب تم جاؤ۔"

چلتے چلتے جمعدار نے بڑے میاں سے کہا: "ارے بڈھے میاں کل صبح سات بجے آجانا ۔ لاش تیار ملے گی۔"

محمد نے سنا اور سہم گیا: "لاش!" اس کے منہ سے نکلا آہستہ سے: "اس کی خود کی لاش!!"

ایک دوسرے سپاہی نے کہا: "بڑے میاں سرکار سے ڈھائی روپیہ ملے گا نقد کفن دفن کا ۔ نقد لوگے تو ہم کپڑا نہ منگائیں لینا ہو تو ابھی بتا دو۔"

بڈھا کچھ نہ بولا ۔ سپاہی بول اٹھا: رہنے دے ۔ کل نقد دیدینا ۔ اس میں پوچھنا کیا ۔ کفن دفن کا یہ اپنا انتظام کریں گے۔"

محمد سب باتیں مردہ کی طرح بیٹھا سنتا رہا ۔ اور اس کے عزیز روتے ہوئے چلے گئے ۔

(۲۲)

دوسرے دن صبح تین بجے اسے جگایا گیا ۔ آنکھ لگی ہی تھی: "اٹھو بھیا محمد اب جی بھر کے قیامت تک سو لینا۔" سپاہی نے کہا ۔ کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ۔ محمد نیم مردہ ہو رہا تھا ۔ اس سے ہلا نہ گیا ۔ جمعدار نے کہا: "محمد وضو کر کے نماز پڑھ لو۔"

محمد ایک دم سے ۔ ۔ ۔ ۔ چونک پڑا ۔ وضو کر کے نماز پڑھی ۔ ایک قوت سی آئی ۔ مگر توبہ کیجئے ۔ جلد لرزہ شروع ہو گیا ۔ زبان بند اللہ اکبر!

جب اسے لے چلے تو وہ نیم مردہ اور بیدم تھا ۔ گھسٹتا جاتا تھا! ہاتھ پیر میں خفیف رعشہ ۔ اور زبان سے آہستہ لہجہ میں نکل

رہا تھا" ہو۔ ہو ہو ہو . . . . ارے اللہ رے . . . ."

لرزتا کانپتا اسے جاکر تختہ پر کھڑا کیا گیا۔ پھندہ ڈال کر ٹوپ چڑھا کر ایک متمسخر آمیز لہجہ میں انتہائی خباثت کے ساتھ جلاد نے کہا۔ "شاباش ہے بہادر" دابا جو کھٹکا تو چکرا کر ایک چیخ کے ساتھ گرا جان آدھی نکل گئی کہ دھچکہ کی آواز آئی۔ دو چار جنبشیں اور ختم۔

(۲۳)

پھانسی گھر کے باہر ایک تختہ پر جوانی اور شہزوری محوِ خواب تھی۔ باپ نے کپڑا اٹھا کر دیکھا! جوانی . . . . . . اور موت گلے مل رہی تھیں۔ اب بھی سارا بدن کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ لاشہ تھا کہ ایک نگینہ!! بازو کا خم اور سینے کا اُبھار! شہزوری اور موت! چوبیس سال کی عمر! مگر کیا کڑیل جوان تھا کہ جو شخص دیکھتا وہ اس کی جوان موت پر کانپ جاتا۔ حلیمہ کی جوانی بھی کوئی چیز تھی! لاحول ولا قوۃ! جوانی یہ تھی کہ لاشہ پھٹا پڑتا تھا۔ موت میں اور جوانی کا روپ! لاش پڑی چمک رہی تھی۔

باپ کی عمر ۹۴ سال کی تھی اور یہ اس کا سب سے چھوٹا اور چہیتا بیٹا تھا۔ چھ میں سے ایک بچا تھا اور وہ یوں ختم ہوا۔ بڈھے کے منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ آنسو ڈھلک رہے تھے۔ گردن اور ہاتھ میں رعشہ۔ لرزتے ہوئے ہاتھ سے اس نے چہرے پر سے کپڑا اٹھایا۔ دیکھنے والوں کے دلوں پر برچھی لگی۔ بڈھے نے لاش کی پیشانی چومی اور گریاں وبریاں اسی حالت میں لاشہ پر گر پڑا۔ اور لاش کے منہ پر اپنا منہ ملتا رہا۔ آنسو اور رال سے سارا منہ تر ہو گیا۔

(۲۴)

محمد کو ۱۲۔ جنوری ۳۶ء صبح چار بجے پھانسی ملی اور ۱۶۔ جنوری کو گھر جاکر بوڑھا باپ بھی مرگیا۔

نوٹ:۔ قاتل اور مقتولہ کے نام اصلی ہیں۔

گرلز کالج کی لاری

ہے سڑکوں پہ پھر صبح کا رنگ طاری
گئی ہے ابھی گونجتی، گنگناتی
ہوا کی طرح ہانپتی، سنسناتی
ہر اک موڑ پر لڑکھڑاتی ہوئی سی
اچھلتی ہوئی سی، لچکتی ہوئی سی
حسینوں کو خوابوں سے بیدار کرتی
وہ ہلکا سا اک شور کرتی ہوئی سی
وہ سڑکوں پہ پھولوں کی دھاری سی کھنچتی
چھلکتے وہ شیشوں میں شاداب چہرے
وہ ماتھوں پہ ساری کے رنگیں کنارے
وہ نکھری سی زلفیں وہ بکھری سی خوشبو
کسی کی نگاہوں میں امرت کا دھارا
کسی کی جبیں صبح کی اوّلیں لَو
کسی کی ادا سے عیاں خوش مذاقی
کسی کی نظر میں محبت کے دوہے
کسی شوخ عارض میں پھولوں کی گرمی
کسی مست آنکھوں میں وحشت کا جادو
وہ آنکھیں وہ حکمت کے لبریز ساغر
سخن آفریں وہ نگاہیں کسی کی
وہ شعلہ سا اک علم کی روشنی کا
کسی کی ادا حکمت و فن کا زیور
کسی کی نظر میں ذہانت بلا کی
یہ رنگین کھڑکی کا شیشہ گرائے
یہ کھڑکی سے اک ہاتھ باہر نکالے
یہ چلتی زمیں پر نگاہیں جماتی
یہ انداز سے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے
کسی کی وہ ہر بار تیوری سی چڑھتی
وہ لاری میں گونجے ہوئے زمزمے سے
وہ لہجوں میں چاندی کھنکتی ہوئی سی
سروں سے وہ آنچل ڈھلکتے ہوئے سے

گئی ہے ابھی گرلز کالج کی لاری
زمانے کی رفتار کا راگ گاتی
یوں ہی دوڑتی، جھومتی، ڈگمگاتی
دھڑکتی ہوئی دھڑدھڑاتی ہوئی سی
چھلکتی ہوئی سی، بہکتی ہوئی سی
یہاں پر ٹھہرتی، وہاں پر ٹھہرتی
وہ ذرّوں میں اک روح بھرتی ہوئی سی
ادھر سے اُدھر سے حسینوں کو چنتی
وہ کلیاں سی کھلتی ہوئی منہ اندھیرے
سحر سے نکلتی شفق کے اشارے
وہ چھایا ہوا منہ اندھیرے کا جادو
کوئی صبح کا جگمگاتا ستارا
کسی نرم چہرے پہ شبنم کا پرتو
کسی کی نگاہوں میں کچھ نیند باقی
"سکھی ری یہ جیون پیا بن نہ سوہے"
کسی میں سبک رَو ہواؤں کی نرمی
کہ لاری میں آیا کہاں سے یہ آہو
وہ سنجیدگی علم کی ہر جبیں پر
کسی میں نمایاں جھلک سرسوتی کی
وہ پرتو کسی میں حسیں گارگی کا
کسی میں وہ میتری کے پُر علم تیور
ہنرمند آنکھیں وہ مہرالنسا کی
وہ شیشے سے رنگین چہرہ ملائے
ادا سے وہ بالوں کا جوڑا سنبھالے
وہ دانتوں میں اپنے قلم کو دباتی
وہ زانو پہ گرتی کتابیں سنبھالے
وہ کانوں کے تختے ادھورے سے پڑھتی
دبی مسکراہٹ، سبک قہقہے سے
وہ نظروں میں کلیاں چٹکتی ہوئی سی
وہ شانوں کے ساغر چھلکتے ہوئے سے

کوئی اک طرف کو سمٹتی ہوئی سی
کنارے کو ساری کے بٹتی ہوئی سی
جوانی نگاہوں میں دہکی ہوئی سی
محبت تخیل میں بہکی ہوئی سی
وہ آپس کی چھیڑیں وہ جھوٹے فسانے
کوئی ان کی باتوں کو کیسے نہ مانے
ترانہ بھی ان کا، فسانہ بھی ان کا
جوانی بھی اُن کی، زمانہ بھی اُن کا

کبھی دوست! یہ گرلز کالج کی لاری
نگاہوں کی جنت تھی میرے لئے بھی
جو لڑکی مری رُوح کی تازگی تھی
سمن زار فطرت کی کھلتی کلی تھی
کبھی "پل" پہ ہر روز میرا گذر تھا
سڑک سے ذرا ہٹ کے لڑکی کا گھر تھا
وہ جاتی تھی پیدل وہاں سے اُتر کر
میں اکثر اُسے دیکھتا واپسی پر
وہاں آکے جس وقت لاری ٹھہرتی
کتابوں کو سینہ پہ رکھے اترتی
وہ بے لوث نظریں وہ معصوم چہرا
وہ نازک سے شانہ پہ ڈھیلا سا جوڑا
وہ آنکھوں میں اک راز کھویا ہوا سا
وہ پلکوں پہ اک ساز سویا ہوا سا
وہ ماتھے پہ چندن کا رنگیں ستارا
وہ سنگم کی راتوں کا کافر ستارا
وہ کندن جبیں کا دمکتا ہوا سا
وہ کاشی کا سورج چمکتا ہوا سا
وہ بے رنگ آنچل وہ بے رنگ ساری
کنارے پہ پتلی سی اک سُرخ دھاری
وہ کچھ بے ارادہ سی رفتار اس کی
ہر ایک موج گنگا پرستار اس کی
وہ بازو پہ اُڑتا سا آنچل کا پرچم
وہ چلنے میں گردن کا ہلکا سا اک خم
نظر اُس سے پہلی دفعہ جب ملی تھی
ہواؤں میں کوئی کلی سی کھلی تھی
کچھ ایسا سا محسوس مجھکو ہوا تھا
نگاہوں میں کافر کی کیا جانے کیا تھا
وہ برسوں سے جیسے مجھے جانتی ہے
کہ میں اس کو، وہ مجھکو پہچانتی ہے

کہاں ہے کہاں ہے ارے او پریما!
کہ سونی ہے تجھ بن یہ آنکھوں کی دنیا
نظر تو جو لاری میں آتی نہیں ہے
تو کیا اب تو کالج کو جاتی نہیں ہے
بتا، کیا ہوا تیرا پڑھنا پڑھانا
وہ کالج کا آنا، وہ کالج کا جانا
کبھی یاد کالج کی آتی ہے تجھ کو
مری یاد بھی کیا ستاتی ہے تجھ کو
گذرتی ہے اب بھی تری سبز لاری
وہ مہکی ہوئی مست موج بہاری
وہی قہقہے ہیں، وہی زندگی ہے
فضا اب بھی لاری کی گونجی ہوئی ہے
ہیں رنگین کلیاں کیاری میں اب بھی
جھلکتے ہیں شعلے سے لاری میں اب بھی
ہے پھر بھی گراں دل پہ آنکھوں پہ بھاری
کہ سونی ہے تجھ بن یہ لاری کی لاری

جاں نثار اختر (ملیگ)

"فریب!"

عشق کی ناکامیوں پر دل کو سمجھاتا رہا
میں زمانے تک فریبِ آرزو کھاتا رہا

اضطرابِ دل کو سمجھا موجبِ تسکینِ دل
میں سکونِ دل کی خاطر دل کو تڑپاتا رہا

قبلہ گاہِ شوق تھے میرے لئے تیرے قدم
تو مگر میرا سرِ پُرشوق ٹھکراتا رہا

اکتسابِ حُسن کرنا چاہتا تھا تجھ سے میں
دین و دل پر مگر تو برق کوندا تا رہا

آرزو مندِ کرم تھی میری افسردہ دلی
تو دلِ افسردہ پر لیکن ستم ڈھاتا رہا

میں سراپا بندگی تھا تیرے حُسنِ ناز پر
میرے عجزِ شوق پر تو ناز فرماتا رہا

میرے دل کو آہ تجھ پر اعتبارِ عشق تھا
تو فریبِ حُسن سے دل میرا بہلاتا رہا

خونِ دل سے میں نے سینچا تھا ہر اک نخلِ مُراد
گلشنِ امید پر تو آگ برساتا رہا

ہر نفس پر ڈوب جاتی تھی مری نبضِ حیات
تو جبیں کی ہر شکن میں رُوح دوڑاتا رہا

عشرتِ غم تھی متاعِ زندگی میرے لئے
تو غمِ عشرت میں لُطفِ زندگی پاتا رہا

ناروا ظلموں کو سمجھا تیرا اندازِ کرم
سرد مہری سے تری میں دل کو گرماتا رہا

تیرے زعمِ جور پر بھی مجھکو عذرِ جور تھا
تو ستم کرتا رہا میں تجھ سے شرماتا رہا

تجھ سے حُسنِ ظن تھا مجھکو، تیری ہر تقصیر پر
موردِ الزام میں خود ہی کو ٹھہراتا رہا

تو وفا کوشی کو سمجھا اک ادائے دلبری
میں جفا میں لذتِ ذوقِ وفا پاتا رہا

رہ گذارِ دل پہ میرے تو رہا گرمِ خرام
میں چراغِ راہ بنکر راہ دکھلاتا رہا

آہ تیرا حسن ارزاں تھا زمانے کے لئے
میں دو عالم کو تری قیمت سے شرماتا رہا

یک بیک میرے غرورِ عشق نے کروٹ جو لی
وہ تمنائیں وہ سارا ولولہ جاتا رہا

تابش دہلوی

ریڈیائی ڈرامہ:۔

طبیب مرو

۲۲۔ مارچ ۳۸ء کو پہلی بار ریڈیو اسٹیشن دہلی سے نشر ہوا

افراد

کردار		کیفیت
حکیم ابو نواس	————	کڑی آواز والا اکھڑ انٹ حکیم
عبدل	————	مہین آواز والا وفادار ملازم
ڈاکٹر	————	مہذب اوسط درجہ کا لب و لہجہ
کرنل	————	خوشامدی ٹٹو۔ کرخت آواز
جمعدار		
شاعر رنجور	————	گڑگڑانی آواز والا مصیبت زدہ
جاگیردار	————	بھاری آواز والا۔ تنومند
بیگم صاحبہ	————	تیز۔ طرار
ولی عہد	————	بُرد بار
مسکین		

مَنظر

(ارسطوئے زمان فلاطون ثانی حاذق الملک حکیم
ابونواس کا مکان)
(گھنٹہ سات بجاتا ہے)

عبدل ملازم:۔ ناشتہ حاضر ہے، حکیم صاحب!!
(قدرے خاموشی کا غذوں کی کھڑبڑ)

حکیم:۔ ہُوں۔ کیوں عبدل، کوئی آیا تو نہیں؟؟

عبدل:۔ حضور ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہیں بہت دیر سے

حکیم:۔ کون ڈاکٹر صاحب؟

عبدل:۔ جو کل کاغذات دے گئے تھے۔

(دو تین قدم چلنے کی آواز)

حکیم:۔ اچھا اچھا وہ ــ بلاؤ ــ اور دیکھو، یہ انڈے آج دو کیسے ہیں ــ ایک اور لاؤ ————

عبدل:۔ بہت اچھا حضور ———— (جاتا ہے)
(برتنوں کی آواز۔ پھر کچھ پینے کی آواز)

عبدل:۔ (دُور سے) ڈاکٹر صاحب ـــ!!

ڈاکٹر:۔ (تیز قدموں سے داخل ہوتے ہوئے) آداب عرض ہے، حکیم صاحب میں اس لئے حاضر ہوا تھا کہ ————

حکیم:۔ جانتا ہوں کس لئے آئے ہو ———— (چار کا گھونٹ) ———— بیٹھو ———— !!

ڈاکٹر:۔ مجھے امید ہے جناب نے نواب قدرت اللہ خاں کی کیفیت ————

حکیم:۔ (مُنہ میں توس رکھتے ہوئے) کون نواب قدرت اللہ خاں؟

ڈاکٹر:۔ وہی جن کے متعلق میں نے کل عرض کیا تھا۔ اور کاغذات بھی پیش کئے تھے۔

حکیم:۔ کیا وہ نواب ہیں ———— (چار کا گھونٹ) میں سمجھا تھا صرف انسان ہی ہیں۔

ڈاکٹر:۔ جی ہاں جناب ———— میرا خیال ہے جناب نے حالات کا مطالعہ فرما لیا ہوگا۔

حکیم:۔ تمھارا خیال بالکل ٹھیک ہے ———— (لمبا گھونٹ)

ڈاکٹر:۔ جناب کی عنایت۔ تو پھر جناب کیا تشخیص فرماتے ہیں؟
(قدرے خاموشی)

حکیم:۔ جانتے ہو آج میرا شفاخانہ جانے کا دن ہے۔ اس لئے زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔

ڈاکٹر:۔ جناب مختصر ہی فرما دیں ———— صرف مرض کی نوعیت معلوم ہو جائے

حکیم:۔ (گھونٹ) مرض کی نوعیت ———— کیا خوب! ———— فارسی بولتے ہو ———— کیوں؟؟

ڈاکٹر:۔ (خفیف ہنسی) ہیں ہیں ہیں ــ جی نہیں ———— میں تو ———— ہیں ہیں ہیں ......

حکیم:۔ اس میں ہنسنے کی کونسی بات ہے ———— ہُوں!!
(قدرے خاموشی)

ڈاکٹر:۔ تو پھر جناب کی کیا رائے ہے۔ یعنی میرا مطلب نواب قدرت اللہ خاں

کو کیا بیماری ہے ؟

حکیم :- (بڑا سا توس منہ میں رکھکر) زیادہ کھانیکی ——— اور ———

(بڑا گھونٹ) زبان پینے کی ——— کیا سمجھے ؟

ڈاکٹر :- جی !

حکیم :- نتیجہ یہ کہ ——— (ڈکار لیکر) ہاضمہ کمزور ——— خون میں حدت

——— مزاج میں جنون ——— بس زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ عبدل ! کاغذات میز پر کیا تھا

عبدل :- یہ لیجئے جناب ـ

(کاغذوں کی خفیف کھڑبڑ)

حکیم :- یہ کیا کتاب ہے تمہارے ہاتھ میں ؟

ڈاکٹر :- میری نوٹ بک ہے جناب ـ

حکیم :- نوٹ بک !! ——— نوٹ بک کیا کرتے ہو ؟

ڈاکٹر :- یادداشت کے لئے ———

حکیم :- یادداشت کیلئے نوٹ بک !! کیا خوب ! ——— سر ہے یا نہیں ؟

ڈاکٹر :- ہے کیوں نہیں جناب !

حکیم :- (پیالی زور سے رکھتے ہوئے) تو سر سے کام کیوں نہیں لیتے۔

——— لڑکے ، عبدل !!!

عبدل :- (دُور سے) جی !!

حکیم :- انڈا لاؤ ـ جلدی ———

عبدل :- بہت اچھا صاحب !

حکیم :- (دوسری پیالی بناتے ہوئے) ——— ہاں تو اب اور کیا چاہتے ہو ؟

ڈاکٹر :- آ ، آ ، میں چاہتا تھا کہ آپ نواب قدرت اللہ خاں صاحب کیلئے

کوئی علاج تجویز ———

حکیم :- ہُوم ———!!!

عبدل :- انڈا ـ حضور ـ

(انڈا توڑنے کی خفیف آواز)

ڈاکٹر :- کیا میں جُلاب دیدوں ؟

حکیم :- جُلاب کس لئے ——— نمک ؟؟؟

ڈاکٹر :- تو پھر کوئی مقوی دیا جائے ؟

عبدل :- نمک ، حضور !

حکیم :- مقوی ، کیوں ـ کس لئے ؟ ؟ ——— توس !!

ڈاکٹر :- جی ہاں مقوی دینا تو ٹھیک نہیں ہے ـ تو پھر کیا فصد کھولی

جائے ؟

حکیم :- فصد کس واسطے ——— کافی اور !!!

ڈاکٹر :- تو پھر کیا کیا جائے جناب ؟

(خفیف خاموشی)

حکیم :- فاقہ ——— لڑکے ، دوسرا توس ! ——— یہ نواب لوگ صرف فاقہ

سے ٹھیک ہو سکتے ہیں ـ (توس منہ میں رکھکر) بہت کھاتے ہیں اور (لمبا

گھونٹ) بہت پیتے ہیں ——— فاقہ ، صرف فاقہ ——— لڑکے ، کافی اور لاؤ

——— فاقہ سمجھے ———

ڈاکٹر :- جی جی ـ جی ہاں ـ

حکیم :- نواب آپکو تشریف لیجانیکے متعلق کیا اعتراض ہے ؟

ڈاکٹر :- جی ہاں ـ جی جا رہا ہوں ـ آپ کی بڑی مہربانی ـ لیکن ـ لیکن

آپ جانتے ہیں کہ نواب قدرت اللہ خان میرے بہترین مریض ہیں ———

اس لئے ———

حکیم :- اس لئے بہترین مریض کو ہمیشہ مریض ہی رکھنا بہتر سمجھتے ہو ———

کیوں ؟ ؟

ڈاکٹر :- جی ہاں ـ جی نہیں ـ جی یہ کہہ رہا تھا ـ میں کہنا چاہتا تھا ـ

میرا مطلب یہ ہے کہ جناب ——— یہ یہ کہ اگر میں نواب قدرت اللہ سے یہ

کہوں کہ آپ کا علاج صرف فاقہ کشی ہے تو ممکن ہے ان کی تشفی نہ ہو ـ اور وہ

اسے پسند نہ کریں ـ

حکیم :- ہرگز پسند نہیں کرینگے ـ فاقہ کو کون پسند کرتا ہے لیکن علاج

میں پسند کا کیا سوال ؟ فاقہ تمہارے بہترین مریض کیلئے بہترین علاج ہے ـ

——— لڑکے عبدل ——— کافی کیوں نہیں دیتا ——— کسی دوا کی ضرورت

نہیں ـ سمجھے ؟

عبدل :- جا جا جا جناب ، آپ تین پیالیاں پی چکے ہیں ـ

حکیم :- پھر چوتھی کیوں نہ پیوں ، نالائق ———

ڈاکٹر :- تو جناب گذارش یہ ہے ـ کہ اگر دوا نہ استعمال کی جائے تو

پھر کیا چیز استعمال ———

حکیم :- دماغ ، بھیجہ ، کھوپڑی ـ سمجھے ؟ ؟

ڈاکٹر :- لیکن اگر وہ رضامند نہ ہوں تو پھر ———

حکیم :- پھر میں کیا بتاؤں ـ تم اپنے بہترین مریض پر اتنا بھی قابو نہیں رکھتے ؟

——— رضامند نہ ہوں ـ کیا خوب ——— زبردستی ـ تشدد (بلند آوازی)

——— مت بھولو کہ طبیب کو مریض کی بہتری کیلئے ہر طرح کا حق حاصل ہے ـ

ڈاکٹر :- یہ تو درست ہے جناب . . .

حکیم :- درست ہے تو پھر ؟ ؟ ؟

(خفیف خاموشی)

عبدل :۔ کافی جناب ۔۔۔ خدا بخشے حضور بیمار ۔۔۔!!!

حکیم :۔ کمبخت ۔۔۔!!

(بے تمیزی سے پیتا ہے۔ دور سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

عبدل :۔ کوئی مریض ہے جناب ۔

حکیم :۔ (پیالی رکھتے ہوئے) اور کوئی نازل ہوا ۔۔۔ ڈاکٹر تھیں اجازت ہے ۔

ڈاکٹر :۔ جی ہاں ۔ وہ ۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ اس قیمتی مشورہ کی کیا فیس پیش کروں !

حکیم :۔ فیس !!! (خفیف ہنسی) ہاں کیوں نہیں ۔۔۔ وہ تمہارا بہتر بن کلف کچھ مالدار بھی ہے ؟

ڈاکٹر :۔ جی ہاں بہت ۔

حکیم :۔ دو سو روپے ۔

ڈاکٹر :۔ دو سو روپے جناب !!! (حیرت سے)

حکیم :۔ جی جناب، کیوں، کم ہیں نا۔ کیا خیال ہے ؟؟

ڈاکٹر :۔ جی نہیں، میرا مطلب ہے ۔ نواب صاحب اسے ضرورت سے زیادہ سمجھیں گے ۔

حکیم :۔ (غصہ میں بتدریج آواز بلند کرتے ہوئے) ضرورت سے زیادہ ۔! ضرورت سے زیادہ کا کیا مطلب ؟؟ ۔۔۔ ضرورت سے زیادہ کھاؤ اور ضرورت سے زیادہ پینے میں ضرورت سے زیادہ خرچ کیا۔ اب سب سے ضروری چیز صحت کیلئے دو سو روپے ضرورت سے زیادہ معلوم ہوتے ہیں، کیوں ؟؟

ڈاکٹر :۔ جی ہاں، جی نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ ۔۔۔

حکیم :۔ تمہارا مطلب کچھ نہ ہونا چاہئے ۔۔۔ سنو ! نواب فاقہ کریگا یا تم

ڈاکٹر :۔ نواب ۔

حکیم :۔ فیس تم دو گے یا نواب ؟؟

ڈاکٹر :۔ نواب ۔

حکیم :۔ پھر کیا اعتراض ہے ؟

ڈاکٹر :۔ بہت بہتر میں ابھی پیش کرتا ہوں ۔

(قدرے خاموشی ۔ کاغذوں کی خفیف کھڑبڑ)

حکیم :۔ روپے جیسی ضروری چیز ۔ ضرورت کے وقت ۔ ضرورت سے زیادہ کام آتی ہے ۔ سمجھے !

ڈاکٹر :۔ درست ہے ۔ یہ لیجئے نوٹ حاضر ہیں ۔

(کاغذوں کی خفیف کھڑبڑ)

حکیم :۔ ٹھیک ہے تم جانتے ہو۔ جب مریضوں کو ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے پڑتے ہیں تب وہ ہمارے مشورہ کی کتنی قدر کرتے ہیں ۔۔ ؟

ڈاکٹر :۔ جی ہاں، جناب ۔

حکیم :۔ جی ہاں کیا ؟ تفصیل بتاؤ ۔

ڈاکٹر :۔ بہت ۔۔۔

حکیم :۔ بہت نہیں ۔ ضرورت سے زیادہ !

(ہنستے ہیں حکیم کم اور ڈاکٹر زیادہ)

حکیم :۔ زیادہ ہنسنے کی ضرورت نہیں ۔ تمہارے پھیپھڑے مضبوط معلوم ہوتے ہیں ۔۔۔ اچھا اب تم جاؤ اور اپنے بہترین مریض کو میری یہ کتاب پڑھنے کو دے دو ۔ اور کہنا کہ اکیسویں گیارھواں صفحہ ضرور پڑھیں ۔ فائدہ مند ثابت ہوگا ۔ تم بھی پڑھ لینا نقصان تمھیں بھی نہیں ہوگا ۔۔۔ جاؤ ۔

ڈاکٹر :۔ (اٹھتے ہوئے) آپکی بڑی مہربانی ۔۔۔ میں نہیں جانتا آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں ؟

حکیم :۔ کرتے ہی کیوں ہو بھائی ۔۔۔ جاؤ

ڈاکٹر :۔ آداب عرض ۔ آداب ۔۔۔ (جاتا ہے)

عبدل :۔ (تیز قدموں کی آواز) حح حح حضور !!!

حکیم :۔ کیا ہے عبدل ؟؟

عبدل :۔ حضور کرنل صاحب ۔۔۔ کرنل صاحب !!

حکیم :۔ کون کرنل صاحب ؟

عبدل :۔ کرنل صاحب حضور ۔ ولی عہد بہادر کے سکریٹری ۔

حکیم :۔ کیا ہوا انھیں کیا مر گئے ؟؟

عبدل :۔ جی نہیں حضور آئے ہیں ۔

حکیم :۔ (اطمینان سے) اسے صرف آئے ہیں ۔

عبدل :۔ جی ہاں حضور ۔ بلالوں ۔۔۔

حکیم :۔ اور کتنے مریض ہیں ؟

عبدل :۔ پانچ چھ اور ہیں ۔ لیکن حضور کرنل صاحب ۔

حکیم :۔ بکے جاتا ہے کرنل صاحب، کرنل صاحب ۔۔۔ کرنل صاحب ہیں تو میں کیا کروں ۔ شے !!! ٹھیرو ابھی ۔۔۔ کھانے کیلئے بتاؤ کیا ہے ؟

عبدل :۔ (قدرے تامل کے بعد) کھانے کیلئے حضور ۔۔۔ یخنی ۔

حکیم :۔ یخنی اچھی چیز ہے ۔ خوب اشتہا پیدا کرتی ہے ۔۔۔ ہوں ۔ اور ؟؟

عبدل :۔ مچھلی ۔۔۔

حکیم :۔ اوہ ! مچھلی ۔۔۔ بہت خوب ۔ دماغ کیلئے بے نظیر چیز ہے ۔۔۔ اور کیا ہے ؟

عبدل :۔ مرغ مسلّم ۔

حکیم :۔ (خوش ہوکر) مرغ مسلّم !! شاباش ۔ بہت ہی اچھی چیز ہے ۔ خوب اور کیا ہے ؟

عبدل :۔ اور ۔ اور حضور ۔۔ بریانی اور بورانی ۔۔

حکیم :۔ ہم ۔ خیر ۔ اوسط درجہ کی خوراک ۔۔۔ اور ؟

عبدل :۔ او ۔۔۔ اور ۔۔ اور

حکیم :۔ بولو جلدی اور کیا ہے ؟

عبدل :۔ اور جو آپ کہیں حضور ۔

حکیم :۔ ابھی میرا کہنا باقی ہے ۔۔۔ افوہ !! تم لوگ دو کوڑی کام کے نہیں ۔۔۔ اور کیا ہونا چاہئے ۔۔۔ بولو ۔۔۔ انڈے کی کوئی چیز ۔۔۔ خاگینہ سمجھے ؟!

عبدل :۔ حضور آج چار انڈے نوش فرما چکے ہیں ۔۔۔ زیادہ انڈے نقصان نہ دیں پچھلی مرتبہ بھی جب ۔۔۔

حکیم :۔ نقصان کیسا ۔ خاموش ۔ تیرے پیٹ میں جائیں گے یا میرے ۔۔۔ شریف آدمی کی خوراک اتنی بھی نہ ہو ۔

عبدل :۔ لیکن حضور ۔۔۔

حکیم :۔ بس کچھ نہیں ۔۔۔ یہ کشتی لیجاؤ ۔۔۔ (برتنوں کی آواز) اور ہاں دیکھو ، چٹنی ، اچار ، مُربّے وغیرہ خوب ہوں ۔ چٹپٹے مسالہ دار ۔۔۔ جاؤ ۔۔۔ مریضوں کو بلاؤ ۔۔۔ سب کے سب پیٹو ہیں ۔ کھا کھا کر بیمار پڑنے جاتے ہیں ۔۔۔ بلانوش ۔۔۔

عبدل :۔ بہتر بہتر حضور ۔۔۔ (جاتا ہے)

(قدرے خاموشی)

حکیم :۔ (زور دار ڈکار لیتے ہوئے) ایہم ۔۔۔ ایہم ۔۔۔ تو یہ کچھ گڑبڑ ہوگئی ۔۔۔ عبدل ٹھیک کہتا تھا ۔۔۔ چوتھی پیالی نہیں پینی چاہئے تھی ۔

عبدل :۔ (دور سے) کرنل صاحب !!

کرنل ۔ (تیزی سے آتا ہے) آداب عرض حکیم صاحب !!

حکیم :۔ ہوں ۔ کیا شکایت ہے ؟

کرنل :۔ میں اپنے لئے نہیں آیا بلکہ ولی عہد بہادر نے یاد فرمایا ہے ۔

حکیم :۔ کیا ہوا انھیں ؟

کرنل :۔ ولی عہد بہادر کا ارشاد ہے کہ آپ فوراً کوٹھی پر حاضر ہوں ۔

حکیم :۔ اوں ہوں !! ناممکن !! شفاخانہ کا دن ہے ۔۔۔ وقت نہیں ۔

کرنل :۔ لیکن حکیم صاحب ۔ ولی عہد بہادر آپ سے ضروری مشورہ کرنا چاہتے ہیں ۔

حکیم :۔ تو یہاں کیوں نہیں آجاتے ۔ آج تو دُنیا بھر کے ولی عہد بھی بلائیں تو میں نہیں جا سکتا ۔

کرنل :۔ لیکن حکیم صاحب آپکو معلوم ہونا چاہئے کہ ولی عہد بہادر ۔۔۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ولی عہد بہادر کا ارشاد ......

حکیم :۔ ولی عہد بہادر ! ولی عہد بہادر !! کتنی دفعہ اس سبق کو دہراؤ گے ولی عہد بہادر ہیں تو میں کیا کروں ۔۔۔ ان کا نوکر ہوں ؟ ۔۔۔ ان کا تنخواہ دار ہوں ؟ ؟ ۔۔۔ ان کے شاہی طبیب سب مر گئے کیا ؟!

کرنل :۔ شاہی طبیب سب حاضر ہیں لیکن مرضی عالی یہی ہے کہ وہ آپ کو خدمت کا موقع دیں ۔

حکیم :۔ بیوقوفی کی حد ہے ۔ شاہی طبیبوں کی موجودگی میں مجھ سے کیوں مغز زنی کرنا چاہتے ہیں ؟

کرنل :۔ (خوشامدانہ) لیکن حکیم صاحب آپ میں اور شاہی طبیبوں میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔

حکیم :۔ بالکل غلط صرف یہ فرق ہے کہ وہ خوشامد کرتے ہیں اور میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں ۔

(قدرے خاموشی)

کرنل :۔ تو پھر ولی عہد بہادر کی خدمت میں کیا عرض کروں ؟

حکیم :۔ ان سے کہدو کہ یہاں تشریف لے آئیں ۔ میں زیادہ سے زیادہ رعایت یہ کر سکتا ہوں کہ اُن کا معائنہ کروں ۔ حالانکہ پہلے سے وقت مقرر کئے بغیر میں کسی کا معائنہ نہیں کرتا ۔

کرنل :۔ لیکن جناب ، میں ولی عہد بہادر کو اس قسم کا جواب ہرگز نہیں دے سکتا ۔

حکیم :۔ تو پھر نہ دو ۔

(قدرے خاموشی)

کرنل :۔ حکیم صاحب ، میں آپ سے کہے دیتا ہوں کہ ولی عہد بہادر یہاں ہرگز تشریف نہیں لائیں گے ۔

حکیم :۔ میرا کیا بگڑ جائیگا ۔ میں تو ان سے مشورہ کرنا نہیں چاہتا ۔ مجھے کیا ۔۔۔ اچھا اب آپ جا سکتے ہیں ۔۔۔ آداب عرض ۔۔۔

ارے عبدل !! دوسرے مریض کو بلاؤ ۔۔۔

کرنل :۔ حکیم صاحب مجھے بھی آپ سے کچھ عرض کرنا ہے ۔

حکیم :۔ ہم ۔۔۔ اور ابتک آپ مجھ سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے کیا ؟ ۔۔۔

کرنل: جی نہیں کچھ اپنے متعلق کہنا چاہتا تھا ــــــ بات یہ ہے کہ کئی دن سے میرے ہاتھ میں کچھ ایسی تکلیف ہے کہ جب اسے ذرا زور سے یوں جھٹکا دیتا ہوں تو سخت درد ہوتا ہے۔ (ہاتھ کو جھٹکا دیتا ہے)

حکیم: تو عقلمند اسے ذرا زور سے یوں جھٹکا دیتے ہی کیوں ہو۔ ــــــ بس یہی کہنا چاہتے تھے؟

کرنل: جی نہیں روزانہ میرے سر میں درد رہتا ہے۔ شدت کی اعضا شکنی۔ پیاس بہت لگتی ہے۔ حلق میں کانٹے، آنکھوں میں جلن۔ دل کی دھڑکن، سانس . . . . .

حکیم: پیٹ، پیٹ، پیٹ، پیٹ کے سوا کچھ نہیں۔ کھاتے بہت ہو

کرنل: جی نہیں حکیم صاحب۔ مجھے تو بھوک ہی نہیں لگتی۔ کیا تدبیر کی جائے۔

حکیم: میرے مشورے پر کل کرو۔ اس سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ عبدل، دوسرا مریض۔

کرنل: تو حکیم صاحب! مہربانی کر کے کوئی مشورہ . . . .

حکیم: مشورہ کیلئے پہلے سے وقت مقرر کرو۔ بس۔ رخصت۔ عبدل اگر یہ چاہیں تو کل کوئی وقت دیدو۔

عبدل: بہت بہتر ــــــ جناب رنجور لکھنوی (دور سے کھانسی کی آواز)

کرنل: (دبی زبان سے) نامعقول، بے تمیز۔ (جاتا ہے)

رنجور: آداب بجا لاتا ہوں، قبلہ۔

حکیم: بیٹھئے! کیا شکایت ہے؟

رنجور: تسلیمات، تسلیمات، شکریہ شکریہ۔ عرض ہے کہ یہ خاکسار ایک طویل مسافت طے کر کے حاضر خدمت ہوا ہے۔

حکیم: میں تو نہیں پوچھتا آپ کہاں سے آئے ہیں۔

رنجور: جناب کا فرمانا درست ہے۔ لیکن عرض ہے کہ بندہ کو آپ سے مشرف ہونیکا بیحد اشتیاق تھا۔ زہے نصیب کہ آج آپ کی نیاز حاصل ہونیکا شرف حاصل ہوا۔

حکیم: میری سمجھ میں نہیں آیا ــــــ کیا کہتے ہو ــــــ اشتیاق اور نصیب اور کیا نام لیا تم نے؟ ــــــ نیاز وغیرہ کسی بیماری کا نام نہیں ہے۔ صاف صاف کہو۔ (آہستہ) زبان دکھاؤ۔

رنجور: کیا فرمایا جناب نے؟

حکیم: زبان!!

رنجور: اے حضرت! آپ میری زبان کے متعلق کچھ استفسار نہیں کر سکتے۔ واللہ کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی ٹھینٹ زبان رکھتا ہوں۔ یہ آپ نے کیا فرمایا۔ واللہ چار دانگ عالم میں میری زباندانی کا چرچا ہے۔ (جوش میں) ــــــ ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے ــــــ قبلۂ عالم ــــــ محاورات، روزمرہ۔ صنائع، بدائع۔ کلام و بیان۔ رزم بزم ــــــ محاکات۔ روزمرہ . . . .

حکیم: (گھبرا کر) یہ کیا بکواس ہے۔ ٹھیرو ٹھیرو ــــــ سنو ــــــ عبدل!!

رنجور: (جوش میں مسلسل) نہیں حضرت آپ کو ماننا پڑیگا کہ سخن سنجی اور سخن فہمی میں آج کوئی ایسا نہیں جو مجھ سے ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ زبان کے معاملہ میں آپ لب تک نہیں ہلا سکتے۔

آج مجھ سا نہیں زمانہ میں
شاعر نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستان گر سُنیئے
ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجیے
ہے قلم میرا ابر گوہر بار

حکیم: (بیخ کر) ختم کرو اس بکواس کو ــــــ عبدل، دوسرا مریض ــــــ اس شخص کو تو جنون ہے۔

رنجور: (حالتِ سکون میں) سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے ــــــ

حکیم: پھر یہ کیا بکواس ہے ــــــ میرا مذاق اڑاتے ہو۔

رنجور: اے توبہ، توبہ ــــــ استغفراللہ حضرت واللہ۔ میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ کیا میری ہرزہ سرائی بار گوش ثابت ہوئی؟

حکیم: (زور سے میز پر ہاتھ مار کر) آخر مطلب کیا ہے تمہارا سیدھی سیدھی بات کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔

رنجور: (نہایت نرمی سے) میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آپ نے جو میری زبان کے متعلق شبہ ظاہر کیا اس سے میرے پندار میں خلل واقع ہوا اور مجھے اپنی زبان کی سلاست اور بلاغت کی توجیہ کرنی . . . .

حکیم: شش شش!! توبہ توبہ۔ آخر یہ مرض کیا ہے ــــــ میرے پاس کیوں آئے ہو؟

رنجور: قبلۂ عالم! یہ خاکسار اس لئے ــــــ

حکیم: خاکسار پاکسار میں کچھ نہیں جانتا۔ ٹھیک ٹھیک بولو۔

رنجور: چاہتا تھا کہ جناب معائنہ کر کے کوئی علاج تجویز کر دیں

حکیم: معائنہ کیا خاک کروں۔ کہتا ہوں زبان دکھاؤ تو تم بڑ ہانکنے لگے ہو

رنجور:۔ (گویا چونک کر) اوہو! آپ کا مطلب اُس زبان سے نہیں اس زبان سے تھا۔ اے حضرت واللہ سخت غلطی ہوئی۔ تقصیر معاف فرمادیں۔
لیجئے یہ حاضر ہے۔ آں۔

حکیم:۔ اور نکالو ــــ

رنجور:۔ آں ــ آں ــ

حکیم:۔ اتنی سی چیز پر زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہو۔ بند نبض!

(قدرے خاموشی)

حکیم:۔ ہوں! کھڑے ہو ـــ سانس لو، زور سے ـــ ہوں، ٹھیک ہے ــــ شادی ہوگئی؟

رنجور:۔ جی۔

حکیم:۔ بچے؟

رنجور:۔ جی چشم بد دور ــــ تو ہیں۔

حکیم:۔ ہوں ـــ کیوں نہیں ـــ کیا کام کرتے ہو؟

رنجور:۔ شاعر ہوں۔

حکیم:۔ جانتا ہوں۔ میں نے پوچھا۔ پیشہ کیا ہے؟

رنجور:۔ شاعری!

حکیم:۔ کیا مطلب، کیا شعروں سے روٹیاں کھاتے ہو؟

رنجور:۔ (نحیف آواز میں) جی ہاں، قبلہ کیا عرض کیا جائے۔

حکیم:۔ تو ٹھیک ہے۔ میرا ہی خیال تھا ـــ بیٹھ جاؤ ـــ ہوں!!

(قدرے خاموشی)

رنجور:۔ تو قبلہ، میں یہ دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ جناب کا کیا خیال ہے۔ یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ میرا مرض کیا ہے؟

حکیم:۔ تمھارا مرض ہے شاعری۔

رنجور:۔ یعنی حکیم صاحب اس سے جناب کا مدعا؟

حکیم:۔ بچے زیادہ۔ پیشہ ناقص ـــ خوراک کم۔ سمجھے؟؟

رنجور:۔ اے حضرت تو پھر علاج؟

حکیم:۔ خوب کھاؤ۔ خوب کھاؤ۔ بس یہی علاج ہے ـــ اکثر مریض بہت کھاتے ہیں تم کم کھاتے ہو ـــ ڈٹ کے کھایا کرو۔ مرغ مچھلی انڈا وغیرہ۔ کیا سمجھے؟

رنجور:۔ لیکن حضرت میں تو۔ میرا مطلب ہے کہ۔ یہ چیزیں کس طرح مہیا کروں۔ میں تو ـــ کیا عرض کروں ـــ شرم دامنگیر ہے۔

حکیم:۔ تو شاعری کیوں کرتے ہو کوئی اور ڈھنگ کا کام کرو ـــ کیا نام؟؟

رنجور:۔ خاکسار کو رنجور کہتے ہیں۔

حکیم:۔ خاکسار رنجور، کیا یہ دونوں نام ہیں؟

رنجور:۔ خاکسار تو میں نے ویسے ہی عرض کیا۔ رنجور تخلص رکھتا ہوں۔

حکیم:۔ خاکسار تو ویسے ہی رہا۔ رنجور تخلص۔ اور نام ندارد۔

رنجور:۔ خاکسار کو مرزا جاوید بخش کہتے ہیں۔

حکیم:۔ خاکسار پھر ویسے ہی کہہ دیا۔ تم فضول باتوں میں کیوں وقت ضائع کرتے ہو ـــ یہ بیماری کیا ہے آخر ـــ لیکن تمھارا تو در اصل کام ہی وقت ضائع کرنا ہے۔ اس لئے فضول باتیں عمدہ طریقہ سے کرتے ہو ـــ اور ہاں رنجور کسے کہتے ہیں؟

رنجور:۔ رنجور: بیمار کو کہتے ہیں۔

حکیم:۔ اچھا تخلص ہے ـــ بیماری تو تمھارا پیشہ ہے ـــ پھر یہاں کیوں آئے؟

رنجور:۔ جی، وہ کیا عرض کیا جائے۔

حکیم:۔ جی وہ، جی وہ۔ لگائی ہے۔ تم شاعر لوگ در اصل ہمیشہ ہی مصیبت زدہ رہنا چاہتے ہو۔ کوئی آزردہ ہے۔ کوئی مجروح ہے۔ کوئی مجنوں ہے۔ کوئی آزار ہے۔ جسے دیکھو مجسم آزار ـــ سنو رنجور اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو شاعری ختم۔ کوئی اور کام کرو۔ بس۔

رنجور:۔ آپ کا فرمانا بجا ہے لیکن فی الحال تو زندہ رہنا محال ہے۔

حکیم:۔ کیوں محال ہے۔ ڈٹ کے کھاؤ خوب۔

رنجور:۔ لیکن عرض ہے کہ ـــــ

حکیم:۔ فکر نہ کرو ـــ ایک نامعقول نے صرف یہ جاننے کیلئے کہ وہ زیادہ کھاتا ہے۔ دو سو روپے دیئے۔ تم کم کھاتے ہو اس لئے یہ دو سو روپے تم لو ـــ اور ـــ (کاغذوں کی کھڑبڑ) خوب کھاؤ ـــ یہ لو۔

رنجور:۔ اے حضرت واللہ۔ یہ کیسے۔ نہیں نہیں نہیں۔ آپکو تکلیف..

حکیم:۔ چلو چلو جلدی کرو ـــ یہ لو ـــ (کاغذ کی دوبارہ کھڑبڑ)

رنجور:۔ ہیں ہیں حضرت ـــ شرم ـــ ہیں۔

حکیم:۔ فکر نہ کرو خوب کھایا کرو۔ اور شاعری کی بجائے کشتی لڑا کرو۔

رنجور:۔ آپ کا احسان عظیم۔ میں تو فیس بھی نہیں دے سکا۔ اور اُلٹا احسان۔

حکیم:۔ اور ایک بات یاد رکھو۔ آئندہ بچے بند۔ کیا سمجھے۔ لیکن تم باز نہیں آؤ گے ـــــ عبدل، دوسرا مریض۔

رنجور:۔ لیکن حضرت عرض ہے کہ ـــــ

حکیم :- کوئی عرض ورض نہیں ـــــ جاؤ بھاگ جاؤ ۔ وقت نہیں ـــــ عبدل !!!

رنجور :- قبلہ ! سنئے تو میں نے عرض کیا کہ جناب ازراہِ کرم ایک فی البدیہہ قصیدہ پیش کرنے کی اجازت دیں ۔

حکیم :- کیا حماقت ہے پش شش شن شے ۔ مجھے قصیدہ وصیدہ کچھ نہیں چاہئے جاؤ جلدی ـــــ بھاگ جاؤ ۔۔

رنجور :- (جاتے ہوئے) آپکی شرافت اور نیکی نے ثابت کر دیا کہ ابھی دنیا میں دردمند انسانوں کی کمی نہیں ۔

حکیم :- بالکل غلط، بالکل غلط، ابھی دنیا میں بیوقوف انسانوں کی کمی نہیں ۔

رنجور :- ہیں ہیں ہیں ۔ اجازت ہے ۔ آداب بجا لاتا ہوں ۔ (جاتا ہی)

(قدرے خاموشی)

حکیم :- (آہ سرد کے ساتھ) اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے !! (مصرع)

عبدل :- (دور سے) جاگیردار صاحب اور بیگم صاحبہ ۔

بیگم :- (تیزی سے آتے ہوئے) شکر ہے حکیم صاحب موجود ہیں ـــــ اب تمھارا ٹھیک ٹھیک علاج ہو سکے گا ۔ حکیم صاحب ! آداب عرض ـــــ ادھر آ کر بیٹھو میز سے ـــــ حکیم صاحب ! یہ میرے شوہر جاگیردار ۔

حکیم :- (بیٹھئے بیٹھئے) آپ دونوں میں سے کون مریض ہے ؟

بیگم :- بات یہ ہے حکیم صاحب ہم نے اپنے ڈاکٹر سے صاف کہدیا کہ تمھاری سمجھ میں مرض نہیں آ سکتا ۔ اس لئے ہم حکیم ابونواس صاحب کو دکھائینگے اس لئے . . . .

حکیم :- میں یہ نہیں پوچھتا ـــــــــ

بیگم :- جی نہیں حکیم صاحب ہمارے ڈاکٹر کی رائے تھی . . . .

حکیم :- مجھے آپکے ڈاکٹر کی رائے سے کوئی دلچسپی نہیں ـــــ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ دونوں میں سے کون مریض ہے ؟

بیگم :- یہ میرے شوہر جاگیردار ۔

حکیم :- کہئے جاگیردار صاحب کیا شکایت ہے ؟

بیگم :- بات یہ ہے حکیم صاحب ۔

حکیم :- میں آپسے کوئی بات وات پوچھنا نہیں چاہتا ۔ جاگیردار صاحب کیا آپ کے منہ میں زبان نہیں ہے ؟

جاگیردار :- (بمشکل تمام) م م میں ـــــ وہ ـــ کیا کہتے ہیں ـــ میں میں . . . . .

بیگم :- آخر حالت تو مجھے ہی بتانی پڑیگی ۔ حکیم صاحب بات یہ ہے کہ . . .

حکیم :- بیگم صاحبہ ۔ ذرا اپنی زبان دکھائیے ۔ جلدی کیجئے ۔ وقت نہیں ۔

بیگم :- لیکن میں تو بالکل اچھی ہوں ۔

حکیم :- (تحکمانہ) زبان باہر نکالئے فوراً ـــ اور ـ ادر ـ بس ـــ یونہی رہنے دیجئے ۔ اب آپ خاموش رہ سکیں گی ـــــ ہاں جاگیردار صاحب نبض دکھائیے ۔

(قدرے خاموشی)

بیگم :- حکیم صاحب ۔ م م میں . . . . .

حکیم :- خاموش ، میں نے کہا تھا ۔ زبان باہر نکالے رہو ۔

بیگم :- آخر اس کا کیا مطلب ہے ۔ آج تک میری کسی نے اتنی توہین نہیں کی ۔

حکیم :- افسوس ہے کیوں نہ کی ورنہ آپکی طبیعت درست رہتی ـــــ ہاں جاگیردار صاحب آپ کو کیا شکایت ہے ؟

جاگیردار :- (بمشکل) م م میری شکایت ـــــ بیگم تم بتاؤ ۔

بیگم :- کہتی تو ہوں ۔

حکیم :- آپ چپ رہئے یا تشریف لیجائیے ـــــ میں اس طرح علاج نہیں کرتا ـــــ جاگیردار صاحب آپ ذرا کھڑے ہوں ۔

جاگیردار :- اوئہ ۔ آں ح ـ اُف ـ (بمشکل کھڑا ہوتا ہے)

حکیم :- ذرا چلئے ـــ ہاں ـــ اس دیوار سے اُس دیوار تک ـــــ ذرا دوڑ جائیے ـــ چلئے چلئے ـــ جلدی کیجئے ـــ فوراً ـــ (دوڑتا ہی) تیزی سے ـــــ اب واپس ـــ فوراً ـــــ (بھاری قدموں کی آواز) ۔ جلدی ، جلدی ـــــ اور ـــ ہاں ـــــ اب ذرا دس تک گن جائیے ۔

جاگیردار :- (ہانپتے ہوئے) بے بے بیگم ۔ ت تت تم گنو ۔

بیگم :- (جلدی سے) ایک دو تین چار پانچ چھ سات ـــــ

حکیم :- (ڈانٹ کر) خاموش ـــــ آپ گنئے جلدی کیجئے ـــ ہاں ـــ ایک ـــــ

جاگیردار :- (ہانپتے ہوئے) اے ی ی ک ـ د ددو ـــ تی تی تین چ چ چار ـــ پ پ پاں پنچ ـ ب ب ابس

(دھڑ سے کرسی پر گرتا ہی سانس زور زور سے لیتا ہے)

(خفیف خاموشی)

بیگم :- آپ کا کیا خیال ہے حکیم صاحب ؟

حکیم :- آنکھیں دیکھوں ـــــ ہوں ۔ نبض ۔

بیگم :- رات رات بھر جاگتے رہتے ہیں ۔ چھینکتے ہیں ۔ کبھی سر میں درد ـ کبھی پیٹ میں تکلیف ۔ کبھی ٹانگوں میں اینٹھن ـــــ اور کبھی ـــــ اور کبھی ـــــ

حکیم :۔ دوسرا ہاتھ ۔۔۔ ہوں ۔
جاگیردار :۔ نیند نہیں آتی ۔
حکیم :۔ دیر میں کیوں سوتے ہیں آپ ۔
جاگیردار :۔ سو کر اٹھتا ہوں تو تھکن معلوم ہوتی ہے ۔
حکیم :۔ سویرے کیوں نہیں اٹھا جاتا ؟
جاگیردار :۔ بھوک بالکل نہیں لگتی ۔
حکیم :۔ پھر بھی کھائے چلے جاتے ہیں ۔۔۔ کیوں ؟
جاگیردار :۔ پیاس بہت لگتی ہے ۔۔۔ پینے کیلئے کچھ بتایئے ۔
حکیم :۔ پانی ، صرف پانی ،

(قدرے خاموشی)

بیگم :۔ تو حکیم صاحب آپکی کیا رائے ہے ؟
حکیم :۔ دیکھئے گوشت قطعی بند ۔ صرف سبزی ترکاری اور پھل ۔ نارنگی انار وغیرہ اور صبح و شام روزانہ ٹھنڈے پانی سے غسل ۔۔۔ ایک ہفتے بعد پھر معائنہ کرونگا ۔ بس ۔ اب ۔ رخصت ۔۔۔ زیادہ وقت نہیں دے سکتا ۔۔۔ ہاں یہ لیجئے میری کتاب لیتے جایئے ۔ ایکسو گیارھواں صفحہ غور سے پڑھئے ۔۔۔ آپ جیسے بیٹھو مریضوں کیلئے بہت سی کارآمد باتیں درج ہیں ۔۔۔ بیگم صاحبہ آپ بھی اس کتاب کا مطالعہ کیجئے ۔ آپکو معلوم ہوگا کہ زبان کو زیادہ استعمال کرنے سے کیا کیا امراض پیدا ہوسکتے ہیں ۔۔۔
بیگم :۔ آپ نے میری سخت توہین کی ہے ۔ مجھے اگر یہ معلوم ہوتا کہ آپ اسقدر بے تمیز ہیں تو میں ہرگز یہاں نہ آتی ۔
حکیم :۔ آئندہ تکلیف نہ کیجیئے گا ۔
بیگم :۔ فیس کیا دی جائے ؟
حکیم :۔ دس روپئے ۔
بیگم :۔ آپ نے کوئی دوا بھی تجویز نہیں کی ۔
حکیم :۔ کسی دوا کی ضرورت نہیں ۔ علاج میں نے بتادیا ۔
بیگم :۔ ایسا علاج تو میں بھی بتا سکتی تھی ۔
حکیم :۔ اگر بتا سکتیں تو دس روپے یوں ضائع نہ ہوتے ۔۔۔ عقل کی ضرورت ہے ۔۔۔ بیگم صاحبہ جو افسوس کہ آپ کے پاس نہیں ۔۔۔ تشریف لے جایئے ۔ لڑکے عبدل !!!

(جاگیردار صاحب اٹھتے ہوئے اور بیگم بڑبڑاتی ہوئی جاتی ہیں)

حکیم :۔ ناحق وقت ضائع کرنے چلے آتے ہیں ۔ شفاخانہ میں غریب بیمار میری راہ تک رہے ہونگے ۔ اور یہ موٹی توند والے منحوس کسی طرح میرا پیچھا نہیں چھوڑتے ۔۔۔ عبدل اور کتنے آدمی ہیں ؟
عبدل :۔ آٹھ دس ہیں حضور ۔
حکیم :۔ صرف ایک کو دیکھ سکتا ہوں ۔ وقت نہیں ۔ کہدو باقی تین بجے آئیں دوسرا کون ہے ؟
عبدل :۔ دوسرا تو وہ لنگڑا جمعدار ہے ۔ مگر وہ فیس تو دیتا نہیں تیسرے کو بلاتا ہوں ۔
حکیم :۔ عبدل ، خبردار ۔ آئندہ ایسی بات تیرے منہ سے نہ سنوں ۔ وہ لنگڑا فیس نہیں دے سکتا تو کیا اُسے بیمار پڑنے کا کوئی حق حاصل نہیں ۔ بلاؤ اُسے ۔۔۔
عبدل :۔ بہت اچھا حضور ۔ (جاتا ہے)

(خفیف خاموشی)

جمعدار :۔ (لنگڑاتا ہوا آتا ہے) بندگی حضور ۔
حکیم :۔ کہو جمعدار آج پٹی کھلے گی ۔
جمعدار :۔ جی ہاں آج پورے چالیس دن ہوگئے حضور ۔ میں تو ڈر سے کانپ رہا ہوں ۔
حکیم :۔ شش ش ۔ ڈر کاہے کا بیٹھو ۔

(بیساکھی رکھنے اور بیٹھنے کی آواز)

حکیم :۔ ذرا دکھاؤ ۔۔۔ ہوں ۔ عبدل ۔ سامان لاؤ ۔ اور گرم پانی جلدی ۔

(قدرے خاموشی)

(سٹریچر کی آواز)

حکیم :۔ کچھ تکلیف تو نہیں ہوتی ۔
جمعدار :۔ آپکا ہاتھ ریشم سے زیادہ ملائم ہے ۔ چیونٹی کو بھی تکلیف نہیں پہونچ سکتی ۔
حکیم :۔ ہوں ! ۔۔۔ خوب جڑی ۔۔۔ بالکل ٹھیک جڑ بیٹھا ۔۔۔ قدرت کا کمال ہے ۔۔۔ کاش طبیب قدرت سے کچھ بھی سبق سیکھ سکتے ۔

(پانی میں کسی چیز کے ڈھلنے کی نرم آواز)

جمعدار :۔ آپ تو قدرت سے بھی .....
حکیم :۔ شے ۔ بکومت ۔ طبیب زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتا ہے کہ قدرت کو اپنا کام کرنیکا موقع دے ۔۔۔ ذرا موڑو ۔ ٹھیک ۔۔۔ کوئی درد تو نہیں ہوتا ۔۔۔

(پانی کی آواز بند)

جمعدار :۔ بالکل نہیں حضور ۔

حکیم :۔ تھوڑی دیر اس تیل کی مالش ہونی چاہیئے ــــ عبدل ، یہ پانی کا تسلہ اٹھاؤ ۔

عبدل :۔ بہت اچھا حضور (سٹریچر کی آوازیں)

حکیم :۔ اس طرف کچھ تکلیف ؟

جمعدار :۔ بالکل نہیں ۔

حکیم :۔ اب ــ ؟؟؟

جمعدار :۔ بالکل نہیں دبانے سے آرام آتا ہے ۔

حکیم :۔ اچھا اب کھڑے ہو جاؤ سنبھل کے ــــ اس لکڑی کا سہارا لو ۔

جمعدار :۔ (کھڑے ہوتے ہوئے) یہ لیجئے ۔

حکیم :۔ اس ٹانگ پر ہلکا سا زور دو ــــ پورا پنجہ ٹکاؤ ــــ زیادہ دو نہیں ۔ تکلیف ہوتی ہے ــــ ؟

جمعدار :۔ بالکل نہیں ۔

حکیم :۔ اچھا آہستہ آہستہ دو تین قدم چلو ــــ زیادہ زور نہ دو

(چلنے کی آواز)

بہت آہستہ سنبھل کے ــ ہاں، شاباش ــــ کوئی تکلیف ــــ

جمعدار :۔ بالکل نہیں حضور ــــ

حکیم :۔ اچھا ادھر آؤ ــــ ٹھیک ہے ۔ ذرا گھٹنہ موڑو ــــ بہت آہستہ ۔

جمعدار :۔ یہ لیجئے ۔

حکیم :۔ دیکھو زیادہ نہیں ۔ بس ۔ بس ۔ بس ۔ کھڑے ہو ۔ اب دونوں ٹانگوں پر زور دیکر آگے کو جھکو ــــ آہستہ آہستہ ــــ شاباش ــــ درد تو نہیں ہوتا ۔

جمعدار :۔ بالکل نہیں حضور ۔

حکیم :۔ ٹھیک ہے ۔

جمعدار :۔ (جوش میں بتدریج آواز بلند کرتے ہوئے) حکیم صاحب آپ کا بول بالا ہو ۔ میری ٹانگ جڑ گئی ۔ جڑ گئی ۔ ٹھیک ہو گئی اور وہ کمبخت ڈاکٹر کہتا تھا کہ کٹوانی پڑیگی ۔ ہا ہا بالکل جڑ گئی ۔ حکیم جی میری ٹانگ میری ٹانگ ، مجھے سلامت مل گئی ۔ ح ح حکیم جی ۔ او ۔ ہو ۔ ہو ۔ میں خوش ہوں ۔ میں چل سکتا ہوں ۔ میں دوڑ سکتا ہوں ۔ حکیم جی ۔ بس ۔ میں میری ٹانگ ۔ میں دوڑ رہا ہوں ۔ حکیم جی ۔ حکیم جی ۔ میں جھک سکتا ہوں دیکھئے ۔ دیکھئے حکیم جی میں جھک کے آپ کے قدم چھوتا ہوں کہ آپ نے میری ٹانگ واپس دیدی ۔

حکیم :۔ بس نے نہیں بھائی خدا نے دی ہے ۔ اسی کے سامنے جھکنا چاہئے ۔ میں تو معمولی طبیب ہوں ۔

جمعدار :۔ مگر آپ ہی نے ــــ حکیم جی آپ ہی نے خدا سے میری ٹانگ دلوائی ہے ــــ خدا آپ کو سلامت ــــ آپ نے اسے کٹنے سے بچا لیا ۔ حکیم جی ۔ یہ آپ ہی کی ٹانگ ہے ۔ خدا آپ کو سلامت ....

عبدل :۔ (گھبرایا ہوا آتا ہے) ح ح ح حضور ۔ ولی عہد بہادر ، ولی عہد صاحب ....

حکیم :۔ عبدل ، (ڈانٹ کر) اس طرح شور مچانے کو کس نے کہا تم سے ہیں ....

عبدل :۔ حضور ۔ ولی عہد بہادر ــــ ولی عہد بہادر کی سواری حضور سواری آگئی ۔

حکیم :۔ سواری کا بچہ ــــ ــــ دیکھتا نہیں میں مریض کا معائنہ کر رہا ہوں ۔ اس وقت کوئی شخص اس کمرے میں نہیں آسکتا ۔ وہ ولی عہد بہادر ہی کیوں نہ ہو ...... دفعان ہو یہاں سے ۔

(قدرے خاموشی)

عبدل :۔ تو پھر میں ولی عہد بہادر سے کیا کہوں ؟

حکیم :۔ کہو کہ انتظار کریں ۔

عبدل :۔ (جاتے ہوئے) کیسے کہوں ۔ کیسے کہوں ۔ ولی عہد بہادر ۔

(قدرے خاموشی)

حکیم :۔ اچھا جمعدار ــ ایک امتحان اور ــــ ٹھیرو ، اس ٹانگ کو ذرا یوں کرو ۔

جمعدار :۔ یہ لیجئے حضور ۔

حکیم :۔ کوئی تکلیف ہوتی ہے ؟

جمعدار :۔ بہت معمولی حضور ۔

حکیم :۔ اچھا اگر اس طرح دباؤں تو ؟

جمعدار :۔ بالکل نہیں حضور ۔

حکیم :۔ بس ــ بالکل ٹھیک ہے ــــ میں اب زیادہ وقت نہیں دے سکتا ۔ جمعدار تم اپنی چیزیں اٹھاؤ اور چلدو ۔

جمعدار :۔ بہت بہتر حضور ــــ خدا آپ کا بھلا کرے ــــ میرے بچے آٹھوں پہر حضور کی جان و مال کو دعائیں دینگے ۔ مجھ غریب کے پاس سوائے دعا کے اور کیا رکھا ہے ۔

حکیم :۔ دعا ــــ ہوں ــــ دعا کی کسے ضرورت نہیں ــــ اچھا جمعدار اب تم چلدو ۔ اٹھاؤ اپنا یہ ــــ کیا نام اس کا ــ یہ ۔ یہ ــــ

بیساکھی ۔
جمعدار :۔ اوہ ۔ یہ منحوس ۔۔۔ اس نے مجھے ستایا ہے ۔ اب مجھے اس کا کیا کرنا ہے ۔۔۔ لائیے مجھے دیجیے ۔ میں ابھی اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہوں ۔ ستیاناسی چیز ۔۔۔ (لکڑی کو توڑتا ہے) ہاتּ تیری ۔۔۔ ہاہا ۔۔۔ اب تیری ضرورت نہیں ۔ ہات تیری ۔ ہاہاہا ......
(شور کرتا ہوا دوڑتا ہے)
عبدل :۔ ولی عہد بہادر ۔۔۔ (ولی عہد آتا ہے ۔ جمعدار کا شور جاری ہے ۔ ولی عہد کے ہمراہ کرنل بھی ہے)
حکیم :۔ میں نے تجھ سے کیا کہا تھا عبدل ؟؟
عبدل :۔ حضور مجھے معاف کر دیجیے ۔ میں نہیں کہہ سکا ۔ معاف حضور ،
جمعدار :۔ (قریب آتے ہوئے) اب میں اچھا ہو گیا ۔۔۔ میری دونوں ٹانگیں ۔۔۔ اوہو میری دونوں ٹانگیں ۔۔۔ میں پھدکتا ہوا ۔ ناچتا ہوا گھر جاؤں گا ۔۔۔ ہاہاہا ۔۔۔ میری ٹانگ ۔۔۔
(تیز قدموں اور دھکا لگنے کی آواز)
جمعدار :۔ اوہ ۔ حضور معافی دیں ۔
ولی عہد :۔ یہ کیا مذاق ہے ۔
جمعدار :۔ (آہستہ آواز میں سہم کر) اوہ ! یہ تو ولی عہد صاحب ہیں ۔۔۔ سرکار کو بندگی ۔۔۔ میری ٹانگ سرکار ۔۔۔
حکیم :۔ (تحکمانہ) جمعدار !
جمعدار :۔ بہت اچھا حضور ۔۔۔ جاتا ہوں ۔۔۔ سلام حضور ۔۔۔ دونوں ٹانگیں ۔۔۔
ولی عہد :۔ ٹھیرو ۔۔۔ حکیم صاحب کیا آپ نے ہی اسکی ٹانگ درست کی
جمعدار :۔ (فوراً آگے آ کر پُرشوق لہجے میں) جی ہاں سرکار ۔۔۔ حکیم جی ہی نے میری ٹانگ واپس دلوائی ہے ۔۔۔ ہسپتال والے ڈاکٹر نے کہا حضور "نکل جاؤ یہاں سے ۔ تمھاری ٹانگ کا کچھ علاج نہیں ۔۔۔ فوراً کٹوا ڈالو اسے" زبردستی کاٹے ڈالتے تھے سرکار ۔۔۔ خدا نے بچایا حضور اور کہا کرا سے کٹواؤ گے نہیں تو نوکری سے علیحدہ کرا دیں گے ۔ حضور بڑھاپے میں بھوکا مرجاتا حضور ۔ بال بچے سرکار ۔۔۔ اب دیکھ لیں کہ حکیم جی نے کیسی مضبوط جوڑ دی ۔ لوہے کے موافق ۔ دیکھیے دیکھیے حضور ۔ چار مہینے کی میں لنگڑا اپاہج تھا ۔ اب دوڑ سکتا ہوں ۔۔۔ دیکھیے دیکھیے حضور کود سکتا ہوں ۔۔۔ میں ناچ سکتا ہوں حضور ۔۔۔ ہاہاہا ۔۔۔ دیکھیے حضور ۔۔۔ ہاہاہا ۔۔۔ معافی دیں حضور میں آج بہت خوش ہوں ۔ میں آج خوب ناچوں گا ۔۔۔ پہلے ایک ہی ٹانگ تھی سرکار ۔۔۔ اب دو ہیں ۔۔۔ دو ٹانگیں سرکار ۔۔۔ دونوں ۔۔۔ دونوں ۔۔۔ ہاہاہا ۔۔۔
حکیم :۔ (ڈانٹ کر) جمعدار ۔۔۔ !!
جمعدار :۔ جاتا ہوں ۔ جاتا ہوں حکیم جی ۔ آج ہی مسجد میں روشنی کروں گا ۔ اور حکیم جی کی سلامتی کیلئے دُعا کروں گا ۔ خدا ایک ٹانگ کی تکلیف کسی کو نہ دے بندگی ۔۔۔ (روانہ ہوتا ہے)
ولی عہد :۔ (چھن کی آواز) (دو ایک روپے پھینکتے ہوئے) لو ہمارے لئے بھی دعا کرنا ۔۔۔
جمعدار :۔ (دُور سے) ہر دم دعا کرتے ہیں ۔ نمک خوار ہیں ۔ خدا سرکار کو سلامت رکھے ۔
(جاتا ہے ۔ قدرے خاموشی)
حکیم :۔ معاف کیجیے گا جناب ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ کی بھی ٹوٹی ہوئی ٹانگ جڑ جاتی تو آپ بھی ایسی حرکتیں کرتے ۔
کرنل :۔ حکیم صاحب ادب سے گذارش ہے کہ آپ ولی عہد بہادر سے گفتگو کر رہے ہیں ۔
ولی عہد :۔ بکومت کرنل ۔۔۔ حکیم صاحب میں عرصہ سے آپکی تعریف سنتا تھا کہ آپ نہایت لائق ہونیکے علاوہ گفتگو وغیرہ کے معاملہ میں امیر غریب کو یکساں سمجھتے ہیں ۔
حکیم :۔ جناب میرے پاس امیر اور افسر کبھی نہیں آتے ۔ بلکہ صرف انسان آتے ہیں ۔ اور اگر بغور دیکھا جائے تو ہر شخص قدرت کا ایک نرالا کرشمہ ہے ۔
ولی عہد :۔ میں تو کوئی نرالا کرشمہ نہیں ہوں بلکہ صرف ولی عہد ہوں ۔
حکیم :۔ مجھے ولی عہد سے کوئی سروکار نہیں ۔ میں تو قدرت کاملہ کی تخلیق کا ایک نمونہ دیکھ رہا ہوں اور بس ۔
ولی عہد :۔ لیکن یہ نمونہ ہے ۔ ذرا کمزور اور بے ڈھنگا سا کیا خیال ہے حکیم صاحب ؟
حکیم :۔ بنانیوالے پر کیوں بہتان رکھتے ہیں ۔ اس کمزوری کے آپ خود ذمہ دار ہیں ۔ خیر ۔۔۔ فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کیجیے ۔۔۔ آئیے آپ کا معائنہ کروں ۔۔۔ عمر ؟؟
ولیعہد :۔ میری عمر آپ کو نہیں معلوم ۔ تعجب ! کیا آپ میری سالگرہ کی دعوت میں شریک نہیں ہوئے ؟
حکیم :۔ آپ کیا سمجھتے ہیں ۔ ان فضولیات میں وقت ضائع کرتا پھرتا ہوں ۔۔۔ عمر بتائیے ؟؟
ولیعہد :۔ تیس سال !
حکیم :۔ چالیس سے کم نہیں معلوم ہوتی ۔

ولیعہد:۔ تعجب ہے۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ میں پچیس برس کا بھی نہیں معلوم ہوتا۔ کیوں کرنل؟

کرنل:۔ درست فرمایا سرکار نے۔

حکیم:۔ خوشامد کو سچ سمجھنا بیوقوفی ہے۔ کبھی آئینہ نہیں دیکھتے ــــــ لباس اتاریئے!

کرنل:۔ میں حاضر ہوں سرکار۔ (کپڑوں کی سرسراہٹ)

حکیم:۔ وزن کتنا؟

ولیعہد:۔ کیوں کرنل کتنا وزن ہے ہمارا؟

کرنل:۔ گذشتہ ہفتہ ایک من تیس سیر تھا حضور!

حکیم:۔ آپ کے قد کی نسبت سے بیس سیر زیادہ (سینہ وغیرہ پہ ہاتھ مار کر) اوہ!! بہت چربی ہے۔ سانس لیجیے۔ زور سے ــ اور زور سے۔ ہوں۔ اور۔

(زور سے سانس لیتا ہے)

حکیم:۔ بس؟ ــــ (قدرے خاموشی) ــــ ہوں۔ بس۔

کرنل:۔ یہ لیجیے حکیم صاحب۔ ولیعہد بہادر کے متعلق شاہی طبیبوں کی تازہ رپورٹ۔

حکیم:۔ لایئے۔ شکریہ!

(کاغذ پھاڑنے کی آواز)

کرنل:۔ ہائیں! آپ نے تو پڑھا بھی نہیں۔

حکیم:۔ دوسروں کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنا میرا اصول نہیں خود بھی عقل رکھتا ہوں۔ آپ کپڑے پہن لیں۔

ولیعہد:۔ (پہنتے ہوئے) شکریہ۔

(قدرے خاموشی)

حکیم:۔ سر میں گرانی رہتی ہے؟

ولیعہد:۔ ہاں!

حکیم:۔ پیاس زیادہ لگتی ہے؟

ولیعہد:۔ ہاں۔

حکیم:۔ کبھی کبھی حرارت؟

ولیعہد:۔ جی ہاں اکثر

حکیم:۔ نیند کم آتی ہے؟

ولیعہد:۔ ہاں ــــ لیکن یہ سب باتیں آپ نے کیسے جانیں؟ (قدرے ترش لہجہ میں) کیوں کرنل؟

کرنل:۔ (گھبرا کر) سرکار میں نے ایک لفظ بھی نہیں بتایا۔ حکیم صاحب ذرا انصاف کیجیے۔ میں نے سرکار کے متعلق آپ سے کچھ بھی کہا؟؟؟

حکیم:۔ تمہیں اپنا دکھڑا رونے سے کب فرصت تھی؟

ولیعہد:۔ پھر آپ سے کس نے کہا؟؟

حکیم:۔ خود آپ نے ــ میری آنکھوں نے ــ میری عقل نے۔ بھوک لگتی ہے؟؟

ولیعہد:۔ بالکل نہیں۔

حکیم:۔ صبح کو ناشتہ میں کیا کھاتے ہیں آپ؟

ولیعہد:۔ معمولی ناشتہ۔ مچھلی۔ انڈا۔ ڈبل۔ کافی اور مربّے وغیرہ۔

حکیم:۔ ہوں ــــ اور کھانا؟

ولیعہد:۔ بالکل ہلکی غذا۔ شوربا مچھلی۔ بُھنا ہوا گوشت اور کچھ مٹھائی۔

حکیم:۔ رات کو سوتے وقت کچھ؟

ولیعہد:۔ بالکل کچھ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ دو ایک کباب۔

حکیم:۔ اور شراب بھی ــ کیوں؟؟

ولیعہد:۔ بہت تھوڑی۔

حکیم:۔ کوئی تعجب نہیں جو آپ کی غذا مفقود ہے۔

ولیعہد:۔ یہی تو سب سے بڑا سوال ہے کہ اشتہا کیسے پیدا ہو؟

حکیم:۔ بہت آسان ہے۔ فاقہ کیجیے۔

ولیعہد:۔ بالکل ہی مر جاؤنگا۔

حکیم:۔ نئے۔ ہرگز نہیں۔

ولیعہد:۔ اگر بھوک لگے تو کیا کھاؤں؟

حکیم:۔ جَو اور بھوسی کی روٹی۔

ولیعہد:۔ (خفیف ہنسی) خوب! لیکن ــ یہ تو معلوم ہو کہ آخر خرابی کیا ہے؟

حکیم:۔ پیٹ، پیٹ، پیٹ، اور کچھ نہیں۔

ولیعہد:۔ کبھی اچھا بھی ہو جاؤں گا؟

حکیم:۔ میں کیسے جان سکتا ہوں۔ عالم الغیب نہیں ہوں۔ لوگ سمجھتے ہیں سب کچھ جانتا ہوں۔ حالانکہ میں سوائے اس کے کچھ نہیں جانتا کہ آپ لوگ بُری طرح کھاتے ہیں۔ ساری دولت کھانے پر صرف کر ڈالتے ہیں۔ یہ لیجیے میری کتاب پڑھیے گا۔ بالخصوص انچاسواں گیارھواں صفحہ ــــ آپ کو معلوم ہو گا کہ پیٹ جیسی نازک چیز پر گدھے کا بوجھ لاد دینے کے کیا نتائج ہوتے ہیں؟

ولیعہد:۔ شکریہ۔

کرنل:۔ تو حکیم صاحب آپ کا کیا خیال ہے۔ سرکار کو خدانخواستہ کوئی خاص تکلیف تو نہیں۔ جلدی تندرست ہو جائیں گے۔

حکیم :۔ بالکل تندرست اسی وقت ہو سکیں گے جب چار آنہ روز پر بسر اوقات کریں۔ اور صبح سے شام تک ٹوکری ڈھو کر چار آنہ خود ہی پیدا کریں۔۔۔۔۔ کیا سمجھے! افسوس ہے کہ زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ شفاخانہ کا دن ہے۔ اب رخصت۔

ولیعہد :۔ کرنل! میری گاڑی۔

کرنل :۔ ابھی حاضر کرتا ہوں سرکار۔ (جاتا ہے)

ولیعہد :۔ حکیم صاحب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

حکیم :۔ میری فیس ادا کر دیجئے اور بس۔

ولیعہد :۔ کتنی فیس؟

حکیم :۔ دس روپئے۔

ولیعہد :۔ لیکن یہ تو آپکی معمولی فیس ہے۔

حکیم :۔ آپ بھی میرے معمولی مریض ہیں۔ پھر میں آپ سے زیادہ کیوں لوں آپ کا پیٹ ایسا ہی ہے جیسا سب زیادہ کھانیوالوں کا۔

ولیعہد :۔ یہ لیجئے دس روپئے لیکن میں اگر آپ کے علاج سے اچھا ہوگیا تو آپ کو سرکار سے کوئی جاگیر دلوانیکی کوشش کروں گا۔

حکیم :۔ شکریہ، میں پہلے ہی دو مرتبہ جاگیر لینے سے انکار کر چکا ہوں۔ مفتی چیز ہے اور بیکار۔

ولیعہد :۔ آپ نہایت دلچسپ آدمی ہیں۔ مجھے بڑی خوشی ہو اگر آپ شاہی طبیبوں کی صدارت قبول کریں۔ اس طرح میں آپ سے وقتاً فوقتاً ملتا رہوں گا۔

حکیم :۔ شکریہ! لیکن وہ غریب جن کو میری ضرورت ہے محروم رہجائینگے دوسرے یہ کہ درباری آب و ہوا مجھے موافق نہیں۔۔۔۔۔ زبان کی شیرینی کہاں سے لاؤں۔!

ولیعہد :۔ خیر۔ لیکن میں آپ کے لئے کروں کیا۔

حکیم :۔ کچھ نہیں۔ بھائی میرے تم جلدی اچھے ہو جاؤ۔ اور مضبوط بننے کی کوشش کرو۔ ہمیں کمزوروں سے زیادہ مضبوط آدمیوں کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ اچھا اب رخصت۔۔۔۔۔ آداب عرض۔

ولیعہد :۔ آداب عرض۔ (جاتا ہے۔ قدرے خاموشی)

حکیم :۔ افسوس ہے کہ ولی عہد ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر صرف آدمی ہوتا۔ (رک کے) عبدل!

عبدل :۔ حضور۔

حکیم :۔ ہمارے کپڑے۔ شفاخانے چلنے کی تیاری کرو۔

عبدل :۔ بہت بہتر حضور۔۔۔ کپڑے حاضر ہیں۔

حکیم :۔ (ڈکار لیتے ہوئے) پیٹ میں واقعی کچھ گڑبڑ ہوگئی۔

عبدل :۔ حضور خطا معاف۔ آج آپ کو چوتھی پیالی نہیں پینی چاہئے تھی۔

حکیم :۔ تو ٹھیک کہتا ہے۔ لیکن کیا کروں۔۔۔

عبدل :۔ خطا معاف، اگر اجازت ہو تو آپ کی کتاب کا لکھو گیارھواں صفحہ پڑھ کر سناؤں۔

حکیم :۔ (غصہ میں) بھاڑ میں جائے میری کتاب۔ نامعقول۔ وہ اوروں کیلئے ہے ہمارے لئے نہیں۔ بے تمیز چل گاڑی منگا۔ آیا کہیں کا طبیب کا استاد۔

عبدل :۔ جی نہیں سرکار۔ طبیب کا خادم!!!

انصار ناصری دہلوی

مسٹر انصار ناصری دہلوی کی تصانیف

بجھمہ نوری

ماں کی ممتا سے متعلق ایک دلدوز تمثیل۔ بچہ کی المناک سرگذشت۔ ممتا کی ماری ماں کس طرح تڑپتی پھرتی ہے۔ گناہ کی لرزہ خیز تصویر۔ قیمت ۱۲

سلمیٰ

آسکر وائلڈ کی تمثیل "سالومی" کا ترجمہ۔ حسن خون آشام کی ہوسناکی اور موت۔ تخیل اور طرز بیان خاص ہے۔ قیمت صرف ۸

چندرا موہنی

حسن و عشق کی داستان خونچکاں۔ محبت کا مذہب نہیں کیا سکھاتا ہے۔ سچے عشق کی المناک کہانی۔ موثر اور مفید۔ ۸

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بُک ڈپو کھاری باولی دہلی

تم بڑے چور ہو۔ میں تم کو اس بار نوکری سے علیحدہ کئے بغیر نہیں رہوں گا" شمیم نے اپنے ملازم کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"سرکار میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں آپ کا آئینہ کہاں گیا" نصیرا نے لرز کر جواب دیا۔

"تمھارے سوا اس مکان میں اور آتا کون ہے؟" شمیم نے پھر گرج کر کہا۔

"اللہ قسم سرکار ہم نے نہیں لیا آپ کا آئینہ۔ ہمیں خدا نے ایسی صورت ہی کہاں دی ہے حضور کہ آئینہ میں منہ دیکھیں۔ یہ تو آپ ہی دن میں ہزار دفعہ ——"

"دن میں ہزار دفعہ، بولو، دن میں ہزار دفعہ کیا؟" شمیم نے نصیرا کے منہ پر تھپڑ رسید کر کے کہا۔

"یہ کیا شور و غل ہے۔ شمیم ہر وقت تم چیختے چلاتے رہتے ہو۔ کیوں مار رہے ہو اس غریب کو؟" شمیم کے والد نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

"سرکار مجھے مار ڈالا۔ آقا چھوٹے سرکار نے میری جان لے لی" نصیرا نے شمیم کے والد کے قدموں سے لپٹتے ہوئے کہا۔

"چپ بدتمیز! کیوں شور مچاتا ہے۔ ایک چانٹے میں تمام مکان سر پر اٹھا لیا" شمیم کے والد نے اس کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو حضور اور پٹوں گا۔ یہ مجھے آج مارے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ بچائیے آقا ——"

"کیوں مرا جاتا ہے۔ نکل یہاں سے دور ہو" شمیم کے والد نے اس کو کمرے میں سے نکالتے ہوئے کہا۔

نصیرا اس گھر میں پرانا نوکر ہو گیا۔ تھے آپ بڑے ہاتھ چالاک ہفتہ عشرہ میں آپکی مرمت ہوتی رہتی تھی۔ مگر آپ کو پرواہ نہ تھی۔ پچھلے ہفتہ میں آپ ایک ٹائم پیس پر ہاتھ صاف کر چکے تھے۔ اس سے قبل آپ شمیم کا نیا مفلر اور بنیان اڑا چکے تھے۔ اور چھوٹی موٹی چیزوں کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔ آپکی اہلیہ محترمہ نے بارہا آپ کی اس قبیح عادت کی شکایت کی لیکن آپ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

شمیم کے والد ایک جہاندیدہ بزرگ تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ انسان کے اندر جو برائیاں ہوتی ہیں وہ عارضی ہیں۔ ممکن نہیں کہ خدا کا خلیفہ شیطانی حرکات کرے۔ اسی کی بنا پر وہ نصیرا کی اصلاح کی فکر میں رہتے تھے۔ ایک روز انھوں نے نصیرا کو بلایا اور ان سے کہا "دیکھو نصیر میں تم پر بہت اعتماد رکھتا ہوں۔ میری جیب میں چند روپے پڑے ہوئے ہیں ان میں سے پانچ روپے لیکر بازار سے پھل لے آؤ" نصیر صاحب نے ابتک نقد روپے پر ہاتھ صاف نہیں کیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس کا شرف بھی اب ان کو حاصل ہو رہا ہے۔

نصیر نے شمیم کے والد کی جیب میں سے پانچ روپے نکالے۔ اس میں دس گیارہ روپے اور پڑے ہوئے تھے شمیم کے والد کو شاید روپیوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں تھی۔ اسی وجہ سے انھوں نے "چند روپے" کہا تھا۔ نصیر کا دستِ حرص دو روپیوں کی طرف بڑھا۔ اس نے دو روپے چرا لینے چاہے۔ ان کو چرا لینے میں کوئی چیز مانع بھی نہ تھی لیکن دفعتہً اس کو شمیم کے والد کے یہ الفاظ یاد آئے "میں تم پر اعتماد رکھتا ہوں" اس یاد کے ساتھ اس کے ہاتھوں میں رعشہ آگیا۔ وہ کپکپا اٹھا۔ اصل انسان نے اس کو آگاہ کیا کہ یہ تو سخت غلطی کر رہا ہے۔ تیرا آقا تجھ پر بھروسہ کرتا ہے اور تو اس حرکت کا ارتکاب کر رہا ہے۔ چرائے ہوئے دونوں روپے اس نے واپس جیب میں ڈال دیئے۔ اور ہلکے ضمیر کے ساتھ کمرے میں سے نکل آیا۔ شمیم کے والد کا منتر کامیاب ہوا۔

جب روپے چرانے کے معاملہ میں اس کا ضمیر کپکپانے لگا تو دوسری چیزوں پر ہاتھ ڈالنے میں بھی اس کو ہچکچاہٹ ہونے لگی۔ حتیٰ کہ اس پندرہ یوم میں وہ کچھ نہ چرا سکا۔

ابھی نصیر کی روح کی تطہیر کامل نہیں ہوئی تھی شمیم کے والد نے دو ایک اسی قسم کے اس کو مواقع دیکر اس کی کایا پلٹ کر دی۔

ایک روز انھوں نے نصیر کو دو سو روپے کے نوٹ دیئے کہ وہ میلہ میں جا کر عمدہ بیلوں کی جوڑی خرید لائے۔ نصیر نے اپنی گاڑی جوتی اور علی الصباح میلہ میں روانہ ہو گیا۔ نوٹوں کی پڑیا سی باندھکر اس نے صافے کے پلو میں لپیٹ لی۔ اور اس پلو کو اچھی طرح سر پر جما لیا۔ وقفہ وقفہ سے اس کا ہاتھ صافہ کے پیچ پر جا تا تھا۔ اور وہاں نوٹوں کو پا کر مطمئن لوٹ آتا تھا۔

دوسو روپے میں وہ کم از کم سال چھ مہینے چین سے گذار سکتا تھا اس نے دل میں سوچا کہ بیوی کے ہاتھوں میں چاندی کے کڑے بھی بن سکتے تھے۔ بچوں کے کپڑے نہیں تھے۔ سات روپے ماہوار میں وہ کیا کیا کر سکتا تھا۔ اب کپڑے بھی بن سکتے تھے۔ اس کا ہاتھ پھر ایک بار نوٹوں تک گیا۔ وہ وہیں موجود تھے۔ وہ اسی کے تھے۔ وہ ابھی ہر اُسے چندی قانون اور شمیم کے والد کی دست رَس سے دُور تھا۔ مگر پھر وہی اعتبار و اعتماد کا خیال آیا۔ اتنی بڑی رقم کے ساتھ آجتک اس کی ایمانداری کا امتحان نہیں لیا گیا تھا۔ دوسو روپے پر قبضہ نہ ہونیکا افسوس تھا لیکن وہ اس امتحان میں بھی کامیاب رہنے کا تہیّہ کر چکا تھا۔

دوپہر کو وہ میلے میں پہنچا۔ اس بار کچھ اچھے بیل بکنے نہیں آئے تھے۔ نصیر نے اچھے جانوروں کی کافی جستجو کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ مجبوراً لوٹنے کا قصد کیا۔ اس کو جھٹ پٹے تک واپس اپنے قصبہ میں پہونچ جانا تھا۔

نوٹ اور بتا کو دونوں ایک ہی پلو میں تھے۔ بتا کو نکالتے وقت نصیر کو نوٹوں کے باب میں بہت محتاط رہنا پڑتا تھا، چار بجے اس نے پھر گاڑی تیار کی اور اپنے قصبہ کا رُخ کیا۔ ایک ہاتھ میں بیلوں کی باگ تھی اور دوسرا ہاتھ وقتاً فوقتاً صافہ میں نوٹوں کو سنبھالنے کیلئے وقف تھا۔

گرمی کا زمانہ تھا۔ پانچ بجے شام کو بھی گرمی کا وہی عالم تھا جو دوپہر کو تھا۔ نصیر کبھی تپتی دھوپ میں اور درختوں کی گھنی چھاؤں میں سے گذرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس گرمی اور ٹھنڈک کے ملاپ نے اس پر اُونگھ طاری کردی۔ پہلے تو اس نے چند بار گاڑی پر سر ٹیک ٹیک دیا اس کے بعد ——— اس کے بعد کا اس کو ہوش نہیں۔

جب اسکی آنکھ کھلی تو وہ پسینہ میں تر تھا، اس کے صافہ کا پلو نظر کب سے زمین میں گھسٹتا ہوا آرہا تھا۔ اس کے سو جانے سے بیلوں نے بھی آرام لیا اور مرے مرے پیروں سے چلنے لگے۔ نصیر نے دیکھا کہ آفتاب غروب ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے سو جانے سے بیلوں کی سُست رفتاری نے ابھی نصف راستہ بھی طے نہیں کیا ہے۔ دفعتہً اس کو اپنے صافہ کی بے ترتیبی کا خیال آیا اور اس کے بعد رقم کا۔ بوکھلا کر اس نے صافہ کو سمیٹا اور جلد جلد اس کو ٹٹولنا شروع کیا۔ بجلی کی طرح اس کے ہاتھ کسی شے کو تلاش کر رہے تھے اور چشم زدن میں وہ ایسے سُست ہوگئے کہ گویا ان میں جان ہی نہیں رہی تھی۔ نوٹ غائب تھے۔

رات ہوگئی۔ پورے بارہ گھنٹے گذر گئے لیکن نصیر قصبہ میں نہیں پہونچا۔ شمیم کے والد کو سخت تردد ہوا۔ سمجھے کہ آخر مردود نے اتنی بڑی رقم پر ڈاکہ مارا۔ دو تین آدمیوں کو ساتھ لیا اور میلے کے گاؤں کا رُخ کیا۔ وہ ابھی قصبہ سے چند میل ہی گئے ہوں گے کہ دو بیل ان کو آوارہ پھرتے ہوئے نظر آئے۔ اُنھی کے بیل تھے۔ آگے چل کر گاڑی بھی مل گئی۔ اب نصیر کی تلاش تھی جو اُن کو باسانی مل گیا۔ ایک تناور درخت کی شاخ میں اس کا صافہ بندھا ہوا تھا اور اس سے نصیر کی لاش لٹک رہی تھی۔ یعنی وہ بددیانت شخص جس کیلئے حقیر اشیا بھی چُرا لینا معمولی بات تھی آج جذبۂ دیانت داری سے مغلوب ہو کر اپنے امتحان کی اتفاقیہ ناکامی کے باعث دُنیا سے کنارہ کش ہوگیا۔ کیا اب بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ انسان اصلاً بُرا جانور ہے؟

قیسی رامپوری

اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

رات اک مخلوط مجلس میں تھا میں گرمِ نوا
نغمہ و نکہت کا وہ طوفان وہ ٹھنڈی ہوا

دیدنی تھا نازنینانِ تمدن کا ہجوم
بے حقیقت تھے نگاہوں میں مہ و مہر و نجوم

ناز پروردہ، حسین افکارِ غم سے بے نیاز
مہ جبینانِ حرم قیدِ حرم سے بے نیاز

جن کی اک جنبش سے بنیادِ حرم میں ارتعاش
جن کی اک ٹھوکر سے زنجیرِ قدامت پاش پاش

بن گیا تھا یک بیک فردوسِ کیف و انبساط
ایک دیرینہ کرم فرما کا ایوانِ نشاط

نرم صوفے گود میں فردوسِ رعنائی لئے
زلف کے خم، مرمریں شانوں کی برنائی لئے

وہ جبیں پیشانیاں آئینۂ تمکینِ ناز
وہ رسیلی، مدھ بھری آنکھیں وہ مژگانِ دراز

وہ سُبک چاندی سی پیکر وہ جوانی کا نکھار
آذرِ فطرت کی صنّاعی کے زندہ شاہکار

رخ پہ شادابی، لبوں میں رس تبسم برق پاش
چست پیراہن، نمایاں جسمِ سیمیں کی تراش

شوخ آنکھیں بادۂ گلگوں کے پیمانے لئے
گیسوئے شبرنگ پیچ و خم میں افسانے لئے

آہ وہ حسنِ مقابل، وہ جمالِ ہم نشیں
دامنِ موجِ ہوا میں اک بہشتِ عنبریں

شوخیاں اک حیا کے رنگ میں ڈوبی ہوئی
سادگی اُس کی ادا کے رنگ میں ڈوبی ہوئی

اک طرف سحرِ ملاحت اک طرف افسونِ ناز
اک طرف زلفِ بُریدہ اک طرف لفِ راز

یہ سراپا رنگ و طلعت، وہ بہ اندازِ دگر
مہ جبیں، گل پیرہن، سیمیں بدن، زرّیں کمر

آنچلوں کی سرسراہٹ زمزمے گاتی ہوئی
پیرہن سے نکہتِ خلدِ بریں آتی ہوئی

آہ وہ دوشیزہ لب، گلریز لب، گلنار لب
آہ وہ لب آشنا لب، شوخ لب، خونبار لب

وہ حجاب آگیں تکلم، وہ رسیلے قہقہے
وہ نشاط آگیں تبسم، وہ سُریلے قہقہے

قہقہے جن میں صبا کا راگ، سیاروں کے گیت
نقرئی نے کی صدا، جنت کے مہپاروں کے گیت

جامِ زرّیں کی کھنک سی، قلقلِ مینا کے ساتھ
قدسیوں کی لے، سرودِ بربطِ زہرا کے ساتھ

شوخئ لب ناز فرما خندۂ بے باک پر
نور و موسیقی کی اک بارش سی فرشِ خاک پر

گفتگو کچھ اس سلیقے سے کچھ اس انداز سے
دل بچانا سخت مشکل تھا کمندِ ناز سے

وہ سمٹنے کی ادا طوفانِ رعنائی کے ساتھ
ذوقِ خود بینی، مذاقِ بزم آرائی کے ساتھ

وہ لچک سی جسمِ نازک میں خود اپنے بار سے
پھوٹ نکلی تھیں شعاعیں عارض و رخسار سے

عارضوں پر اک گلابی پن سا ماتھے پر دمک
انکھڑیوں میں اک سرورِ فتحمندی کی جھلک

بام و در پر اک تبسم سا، فضا گلرنگ تھی
جنبشِ مژگاں دھڑکتے دل سی ہم آہنگ تھی

میرا نغمہ باعثِ دلدارئ خوباں تو ہے
میرا رونا خیر سے وجہ نشاطِ جاں تو ہے

اسرار الحق مجاز
بی اے (علیگ)

ایک ایکٹ کا ڈرامہ:۔

کھلونے

افرادِ تمثیل

(اس ترتیب سے سامنے آتے ہیں)

بُشریٰ ---------- ایک بیوہ

سجاد ---------- بُشریٰ کا عزیز اور عاشق

زاہد ---------- بُشریٰ کا نوجوان بیٹا

دینا ---------- بُشریٰ کا ملازم

مقام:۔ ہر جگہ اور کسی جگہ نہیں ——— وقت:۔ یہی آجکل کا

ہدایات

ایک خاصہ کشادہ کمرہ۔ بائیں جانب ایک دروازہ۔ اس کے برابر دریچہ جس کے شیشے ابھرے ہوئے اور رنگین ہیں۔ اسٹیج کے دائیں جانب ایک الماری ہے اس میں کھانے کے برتن، چھری، گلاس وغیرہ ہیں۔ سامنے کی دیوار سے ملحق دو کرسیاں ہیں۔ ایک خالی، دوسری پر بُشریٰ بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی ہے۔ اس کی عمر پینتیس کے قریب ہے۔ مگر آثارِ جوانی ہنوز معدوم نہیں ہوئے ہیں۔ وہ اب بھی خوبصورت ہے۔ پُشت پر کارنس ہے، جہاں ایک ٹائم پیس اور کچھ کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ اوپر دو روشندان ہیں۔ دروازے پر کوئی دستک دیتا ہے۔ دستک کی آواز پھر آتی ہے۔

بُشریٰ:۔ (سر اونچا کر کے) کون ہے؟

آواز:۔ سجاد۔

بُشریٰ:۔ (قدرے حسرت سے) اچھا آؤ۔

(سجاد آتا ہے۔ شریف صورت، نحیف جسم، بُشریٰ کا ہمعصر)

بُشریٰ:۔ بیٹھو۔

(سجاد بُشریٰ کے پاس دوسری کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

سجاد:۔ میرے آنے سے تمھیں تعجب ہوا ہوگا؟

بُشریٰ:۔ تمھارے آنے سے نہیں بلکہ اتنے عرصہ بعد آنے سے ہوا۔ اچھے تو ہو؟

سجاد:۔ ہاں ——— اور زاہد کہاں ہے؟

بُشریٰ:۔ ذرا شکار کو گیا ہے۔ (مسکراتے ہوئے) اس دن جو تم آئے تھے تو تمھارے جانے کے بعد وہ کہنے لگا: امی! یہ ماموں سجاد میرے آنے کے بعد گم سم کیوں بیٹھے رہے؟ تم سے انھوں نے کوئی بات ہی نہیں کی؟

(دونوں کی نظریں ملتی ہیں۔ ایک طویل خاموشی)

سجاد:۔ (ہولے سے) تمھیں وہ دن یاد ہیں بچپن کے۔ جب ہم دونوں مستقبل سے بےخبر ساتھ کھیلتے تھے۔ ساتھ رہتے تھے۔ جب دنیا ہمیں عزیز اور اجنبی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ برسات کے دنوں میں وہ جو تمھارے ہاں آم کا درخت تھا اس میں ہم جھولا ڈالتے تھے۔ تم جھولتی تھیں، میں جھلاتا تھا۔ ایک دفعہ رسّا ٹوٹ گیا ——— یاد ہے، پھر کیا ہوا تھا؟

بُشریٰ:۔ (اس کے چہرے پر پُرسکون مُسکراہٹ ہے) ہاں میں گرنے لگی مگر تم نے مجھے گود میں اٹھالیا۔

سجّاد:۔ ہاں بُشریٰ! کتنا اچھا زمانہ تھا وہ۔ آلامِ حیات سے بیگانہ زندگی کی الجھنوں سے آزاد۔ پھر آہستہ آہستہ ہم دونوں کے راستے ایک دوسرے سے دُور ہوتے رہے (آہ سرد بھر کر) لیکن آخر کیوں؟

بُشریٰ:۔ اس لئے کہ ہم میں سمجھ آگئی تھی۔ . . . مگر اس سے بڑا سبب ایک اور تھا۔ (چہرے پر سنجیدگی طاری ہوجاتی ہے)

سجّاد:۔ کیا؟

بُشریٰ:۔ (معنی خیز نظروں سے دیکھتی ہے) تم نہیں جانتے ــــ تمھاری شادی؟

سجّاد:۔ (آہستہ سے) ہاں، لیکن وہ مجبوری تھی۔ تم تو کبھی راضی ہی نہیں ہوئیں۔ کئی بار میں نے تم سے التجا کی مگر تم نے اسے پسند نہیں کیا۔ گویا لڑکپن ایک طلسم تھا جسے تمھاری خاموشی نے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے درہم برہم کردیا۔

بُشریٰ:۔ تم جان کر بھی نہیں جاننا چاہتے کہ ہم عورتوں کی کیا حیثیت ہے۔ ہم تو بس کھلونے ہیں جن سے مرد جس طرح چاہتے ہیں کھیلتے ہیں شادی سے پہلے باپ اور باپ کے بعد بھائی ہم عورتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ اور جب شادی ہوجائے تو شوہر اور شوہر کے بعد بیٹے کا اختیار ہوتا ہے۔ وہ جو چاہے ہم سے سلوک کرے۔ ہماری کیا مجال کہ کسی معاملہ میں اپنی رائے دے سکیں۔

سجّاد:۔ لیکن تم تو پڑھی لکھی اور آزاد ہو۔ تم اگر چاہتیں تو کون مخالفت کرسکتا تھا۔

بُشریٰ:۔ معاف کرنا، تمھاری یہ رائے صرف اس لئے ہے کہ تم غرضمند ہو۔ مانتی ہوں کہ آجکل عورتوں کی آزادی کا چرچہ ہے مگر یہ آزادی صرف نام کی ہے حقیقی نہیں۔ ممکن ہے بعض خاندانوں میں عورتوں کو واقعی ہر طرح کا اختیار حاصل ہو لیکن ایسے خاندان ہیں کتنے؟ سچ پوچھو تو ہماری حالت اس پرندکی سی ہے جس کی قوتِ پرواز پنجرے میں مقید کرکے سلب کرلی گئی ہو۔ اب اسے آزاد چھوڑ دو، وہ چاہے بھی تو نہیں اُڑ سکے گا اعضاء جو مفلوج ہوگئے ہیں۔

سجّاد:۔ (لاپروائی سے) . . . لیکن تم میرے ساتھ شادی کرنے پر رضامند کیوں نہیں ہوئیں؟

بُشریٰ:۔ ابھی تو کہا۔ یہ میرے بس میں نہیں تھا۔ جب تک ابّا جیتے رہے، تمھارے پیغام کو منظور کرنے نہ کرنے کا حق ان کو حاصل تھا اور ان کے بعد بھائی جان کو۔ مجھ میں بھلا اتنی جرأت کیونکر ہوسکتی تھی کہ ان سے اختلاف کرکے کہتی "نہیں! میں تو سجّاد سے شادی کروں گی"! مجھے معلوم ہے تمھیں میری شادی سے صدمہ ہوا۔ لیکن میرے صدمے کا تم اندازہ نہیں کرسکتے۔ بچپن میں ایک سُہانا خواب دیکھا تھا کہ کہیں دُور ہم دونوں اپنی زندگی ایک ساتھ گذاریں گے۔ مگر جوانی نے اس خواب کی تعبیر الٹی کردی۔ پھر بھی میں سمجھتی تھی کہ ہم دونوں آنکھوں سے دُور سہی، پر دل سے قریب ہیں۔ کچھ دنوں بعد تمھاری شادی ہوگئی۔ یا جیسا کہ تم نے کہا کردی گئی۔ بس اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ قسمت نے ہماری راہیں الگ الگ تجویز کردی ہیں۔

سجّاد:۔ (ہولے سے) ہاں۔

بُشریٰ:۔ اور پھر تم نے شادی کی اس وقت خواہش کی جب میں بیوہ ہوگئی تھی۔ یقین مانو تمھاری اس خواہش نے مجھے عرصہ دراز تک ایک ذہنی کش مکش میں مبتلا کردیا۔ اور اس خلجان سے میرے ہوش و حواس مختل ہوگئے۔ کبھی مستقبل کے چہرے سے مجھے خوش آئند جھلکیاں نظر آتیں اور کبھی میں سوچتی یہ زاھد ابھی ننھا سا ہے۔ ممکن ہے تمھارے پاس رہکر محبت مجھے اپنے فرائض سے غافل کردے اور میرا بچہ بڑا ہوکر در در کی بھیک مانگتا پھرے۔ بس اس خیال سے میں کانپ اٹھی۔ اپنے مرحوم شوہر کی نشانی میں اس طرح تو نہیں ٹھکرا سکتی تھی۔ لیکن سچ جاننا کہ میں نے بارہا دل میں کہا "کاش یہ ممکن ہوتا کہ ہم تم دونوں ساتھ رہ سکتے۔"!

سجّاد:۔ اگر اسی وجہ سے تمھیں تامل تھا تو ــــ اب تو

زاھد بڑا ہو گیا ہے۔

بشریٰ :۔ (اس کے چہرے پر دکھ اور طنز کی ملی جلی مسکراہٹ ہے) تم اب بھی یہی چاہتے ہو سجاد! تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ تم یہ خواہش بیوی اور بچوں کے ہوتے ہوئے کر رہے ہو۔ تمھاری بیکس بیوی! تم زہر جذبات کے پیچھے اس بیچاری کو بھی بھول رہے ہو۔ جب ہی تو کہتی ہوں کہ عورت مرد کے ہاتھ میں کھلونے سے زیادہ نہیں۔ جب وہ ایک سے اکتا جاتا ہے تو دوسرے کے لئے ضد کرتا ہے۔ بھلا بیوی سے زیادہ مضبوط اور نازک رشتہ اور کس سے ہوگا؟ لیکن مردوں کو یہ سوچنے کی مہلت ہی کہاں ہے؟ اور تمھارے ننھے ننھے بچے! انھیں ان پر بھی ترس نہیں آتا اور پھر تمھاری سماج! بیوی کا نکاحِ ثانی کیسے برداشت کریگی۔

سجاد :۔ جب ہمارا مذہب اس کی اجازت دیتا ہے تو ہمیں سماج کی کیا پروا؟

بشریٰ :۔ یہ تم سے اپنی بیوی بہن کیلئے نہیں کہا گیا؟ وہ غریب چندا کی بیاہی بیوہ ہو گئی مگر تم اس کی دوسری شادی کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ کیا تم نے نہیں کہا تھا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہمارے بزرگوں کی ناک کٹ جائیگی۔ خاندانی روایات کو برقرار رکھنا ہمارا فرض ہے؟"

سجاد :۔ (خجل ہوتے ہوئے) کہا تو تھا۔

بشریٰ :۔ پھر! یہی تو تم لوگوں کا وطیرہ ہے۔ جس کام کو تمھارا دل چاہے اس کے جواب کیلئے بیسیوں تاویلیں گھڑ لیتے ہو۔ مصیبت تو ہم کمزوروں کی ہے۔

سجاد :۔ خیر! چھوڑو ان باتوں کو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تم سے پھر التجا کرتا ہوں مجھ سے شادی کر لو۔ تم کو حاصل کر کے میری زندگی کا چراغ پھر سے روشن ہو جائیگا۔ تم مجھے مایوس نہ کرو۔ بولو، مجھ سے شادی کرو گی نا؟

یکایک کوئی غصہ میں ہنکارتا ہے۔ شادی!

(زاھد داخل ہوتا ہے وہ نوعمر اور طاقتور ہے۔ اس کا چہرہ خشمناک اور آنکھیں زہر آلود معلوم ہوتی ہیں۔ وہ بجلی کی طرح سجاد پر جھپٹتا ہے)

زاھد :۔ (اس کا تنفس تیز ہے) تمھیں میں اب سمجھا۔ تم اس لئے میرے گھر آتے ہو۔

(سجاد کچھ کہنے بھی نہیں پاتا کہ زاھد اس پر حملہ کرتا ہے۔ بشریٰ سکتے میں ہے اور بت بنی ہوئی زاھد کو دیکھ رہی ہے۔ اس کی آنکھیں خالی ہیں گویا اس نے کوئی جرم کیا ہے اور اُسے دکھائی نہیں دیتا۔ سجاد حملہ جارحانہ نہیں کرتا۔ اس کا سر دریچہ کے شیشوں سے ٹکراتا ہے۔)

سجاد :۔ (اس کی کوشش مدافعانہ ہے۔ بیچارگی میں) زاھد!

(زاھد کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں۔ اس کا ہاتھ الماری میں رکھی ہوئی چھری پر پڑتا ہے۔ وہ اسے کھینچ مارتا ہے۔ چھری سجاد کے پہلو میں لگتی ہے۔ جیتا جیتا خون بہہ رہا ہے۔ سجاد گر پڑتا ہے۔)

زاھد :۔ آہ! یہی انجام ہونا تھا!

(سجاد کے پاس جاتا ہے۔ جھک کر دیکھتا ہے۔)

زاھد :۔ (زیرِ لب لہجہ میں) مر گیا۔

(زاھد کے چہرے پر اُداسی کھنڈ جاتی ہے۔ ماں کی طرف اس کی پیٹھ ہے۔ بشریٰ چپکے چپکے رو رہی ہے۔)

زاھد :۔ (اپنے اس فعل کے عواقب کا خیال کر کے جو اس سے بے سمجھے بوجھے سرزد ہوا، خائف ہو جاتا ہے ـــ پھر نڈر ہو کر آواز دیتا ہے) دینا! (اس کی آواز گھٹی ہوئی ہے) دینا!!

(دینا آتا ہے)

زاھد :۔ (لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) پہچانتے ہو؟ ـــــ ماموں سجاد! انھیں ان کے گھر پہنچا آؤ اور کہہ دینا میں نے ان کو قتل کیا ہے۔ میں اب تھانہ جاتا ہوں اور وہاں میں اپنے جرم کا اقبال کرونگا۔

دینا :۔ چھوٹے بابو! آپ نے؟

زاھد :۔ ہاں دینا۔ دیر نہ کرو تم جلدی اس لاش کو لے جاؤ۔

(دینا لاش لے جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد
زاہد، بشریٰ کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کو رخساروں
پر آنسو جھلک رہے ہیں۔)

زاہد:۔ (آہستہ سے) امّی!

بشریٰ:۔ (شکستہ آواز میں) خدا مغفرت کرے۔

(تھوڑی دیر خاموشی)

زاہد:۔ (بشریٰ کے پاس جاکر) امّی! میں جارہا ہوں۔

بشریٰ:۔ (حسرت اور غم سے اس کا چہرہ سُت گیا ہے) کہاں؟

زاہد:۔ جہاں انصاف ہوتا ہے۔

بشریٰ:۔ کیسا انصاف؟

زاہد:۔ میں نے ماموں سجّاد کو قتل کیا ہے نا؟ اس کی سزا ملیگی۔ میں خود ہی کیوں نہ چلا جاؤں۔ امّی! ماموں سجّاد کے رشتہ دار بڑے امیر ہیں۔ اس لئے انکی طرف سے تو سب سے بڑا وکیل پیروی کریگا معلوم ہے روپیہ اس سے کیا کہلوائیگا؟ یہ کہ حضور والا۔ یہ عدالت ہے۔ یہاں انصاف ہوتا ہے۔ قانون کے مطابق مجرم کو پھانسی ملنی چاہئے اور قانون کوئی کھلونا نہیں جسے جذبات سے مجبوری، انجام سے لاعلمی اور رحم کی درخواست کی بدولت توڑ مروڑ دیا جائے۔ ہمیں قانون کا ہر حالت میں احترام کرنا چاہئے۔ حضور والا! میں آپ سے انصاف چاہتا ہوں۔“ اور پھر مجھے پھانسی ہوجائیگی۔

(بشریٰ سسکیاں لینے لگتی ہے۔ وہ بھی کچھ سوچ کر
متاثر ہوجاتا ہے۔)

زاہد:۔ (پُرنم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے) امّی! انھوں نے بات بھی تو ایسی نازیبا کہی تھی۔ انھیں تمھارے تقدس کا خیال تک نہ رہا؟ کون جانتا ہے اگر میں اتفاقاً نہ آجاتا تو وہ کیا کرتے!

بشریٰ:۔ (زاہد کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے) بیٹا! (بے اختیار ہوکر اس سے لپٹ جاتی ہے) تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ سجّاد بُرے آدمی نہیں تھے۔

زاہد:۔ انھوں نے شادی کیلئے کیوں کہا۔

بشریٰ:۔ شادی کی درخواست کرنا گناہ نہیں ہے بیٹا! ایک معمولی آدمی کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ چاہے تو ایک ملکہ سے شادی کی درخواست کرسکتا ہے۔

(تھوڑی دیر بعد۔ دینا آتا ہے)

دینا:۔ چھوٹے بابو!

زاہد:۔ امّی! میں تمھیں تنہا چھوڑ کر جارہا ہوں۔ بس اسی کا رنج ہے۔ میں کیا کروں۔

بشریٰ:۔ (گویا وہ خواب سے بیدار ہوئی ہو) دیوانے ہوئے ہو زاہد جب تک میں زندہ ہوں کوئی تمھارا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔ بیٹا! آج تو وہ دن آیا ہے کہ میں تم پر سے اپنی جان قربان کردوں۔ قتل کا الزام میں اپنے سر لونگی۔ (دینا جلد آگے بڑھ آتا ہے)

دینا:۔ (زاہد کے کچھ کہنے سے پہلے) قتل وتل کوئی نہیں ہوا چھوٹے بابو!

زاہد:۔ (حیرت میں) ہیں!

(بشریٰ ـــ خاموش)

دینا:۔ جب میں نے انھیں پلنگ پر لٹایا تو وہ ہوش میں آگئے۔ میں نے کہا چھوٹے بابو تھانہ جارہے ہیں۔ خدا کیواسطے انھیں بچائیے۔ وہ سمجھتے ہیں انھوں نے آپکو قتل کردیا ہے۔ بس انکی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ کہنے لگے دینا جلدی جا۔ بیٹے بچے سے کہیو میں زندہ ہوں میرے پاس آجاؤ۔

(بشریٰ اور زاہد کی نظریں ملتی ہیں)

زاہد:۔ امّی! سجّاد ماموں! وہ بُرے آدمی نہیں ہیں۔ میں انکے پاس جاؤں، معافی مانگوں گا۔ (دینا کی طرف مڑکر) دینا! تو فوراً ڈاکٹر کو لیکر آ۔

(زاہد اور دینا جلدی سے چلے جاتے ہیں)

بشریٰ:۔ (اس کی آنکھوں میں شکرگذاری اور امید کی جھلک ہے) ہم قدرت کے ہاتھوں میں کھلونے ہیں!!

(پردہ)

× × × × × × ×

صادق الخیری دہلوی
ایم۔ اے

اندھی دُنیا

حمید چوتھی جماعت کے امتحان میں اوّل آیا۔ منشی جی نے خوب پیٹھ ٹھونکی اور "ڈپٹی صاحب" مدرسہ میں آئے تو انھوں نے انعام میں کتابیں دلوانے کا وعدہ کیا۔ سب سے زیادہ یہ کہ دو روپیہ ماہوار وظیفہ ملنے لگا۔ ان باتوں سے حمید کے ذوق و شوق میں بہت ترقی ہوئی اور اس نے تہیّہ کر لیا کہ اب ہمیشہ، ہر امتحان میں اوّل آیا کروں گا۔ اور اس امتیاز کو کبھی ہاتھ سے نہ دوں گا۔

چنانچہ جولائی میں نئے تعلیمی سال کی ابتدا ہوئی اور مدرسہ کھلا تو اس نے غیر معمولی انہماک کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا۔ جب لڑکے ایک جماعت سے ترقی پا کر دوسری جماعت میں آتے ہیں اور نئی نئی کتابیں انھیں ملتی ہیں تو وہ لکھنے پڑھنے میں بہت زیادہ جوش اور ولولہ کا اظہار کرتے ہیں۔ غبی سے غبی لڑکے کا ذہن بھی چند دنوں کیلئے متحرک ہو جاتا ہے۔ حمید تو یوں بھی بہت محنتی لڑکا تھا۔ اس نے کتابوں کو گلے کا ہار بنا لیا۔ صبح سات بجے سے بارہ بجے تک کا وقت مدرسے میں گذرتا پھر اس کے بعد جتنی دیر گھر پر رہتا، کتابوں ہی سے لپٹا رہتا۔ کبھی اُردو کی تاریخ پڑھ رہا ہے تو کبھی کتاب۔ سوال حل کرتے کرتے جی اکتا گیا تو جغرافیہ اٹھا لیا۔ کچھ نہیں تو کتابوں کی ورق گردانی ہی ہو رہی ہے۔ تصویریں اور نقشے کھول کھول کر دیکھے جا رہے ہیں۔ کاپیاں سجا سجا کر طاق میں رکھی جا رہی ہیں۔ غرض دن بھر کتابوں کے سوا اس کے پاس کوئی اور شغل نہ تھا۔

البتہ ایک بات بہت حوصلہ شکن تھی۔ وہ یہ کہ رات کو پڑھنا اس کے لئے ناممکن تھا، کیونکہ روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ گھر میں مٹی کا ایک دیا تھا۔ لیکن وہ باورچی خانہ میں پڑا رہتا تھا۔ اور مہینوں اس کے جلنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ اس کی ماں کو ترکاری بگھارنے کیلئے تو تیل ملتا نہ تھا، چراغ میں پھونکنے کیلئے کہاں سے لاتی۔ جب شام ہو جاتی تو اُسے مجبوراً کتابیں اٹھا کر طاق میں رکھ دینی پڑتیں۔ لیکن وہ اس مجبوری کے باوجود اپنے آپ کو کتابوں سے علیحدہ نہ کر سکتا تھا۔ اندھیرے کمرہ میں جا کر طاق کے سامنے ٹہلتا۔ ایک آدھ کتاب کو اٹھا کر دیکھتا اور پھر باہر آ جاتا۔ گلی میں اِدھر سے اُدھر پھرتا، لیکن تھوڑی دیر بعد قدم خود بخود دروازہ کی طرف اٹھنے لگتے۔ پھر اندر آ جاتا اور کتابوں کو ٹٹولتا اور پھر گھر سے نکل کر گلی میں آ جاتا۔ مغرب کے وقت سے لیکر رات کے نو دس بجے تک یہی چکر رہتا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔

جولائی کے آخری دن تھے۔ برسات شروع ہو گئی تھی۔ شام کو خوب بارش ہوئی تھی۔ اس وقت آسمان پر بادل کا نام و نشان نہ تھا۔ چودھویں رات کا چاند اپنے پورے نکھار کے ساتھ چمک رہا تھا۔ چاندنی نہایت شفاف تھی۔ اور رات روشنی میں نہائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ حمید ننگے سر، ننگے پاؤں، صرف ایک پاجامہ پہنے ہوئے گلی میں اِدھر سے اُدھر پھر رہا تھا۔ گلی کے ایک طرف کچے مکانوں کی قطار تھی۔ دوسری طرف ایک کھیت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ کچے مکانوں کے برابر میں ایک پکا مکان بھی تھا۔ اینٹوں اور پتھروں کا بنا ہوا۔ نہایت پختہ۔ یہ خدا کا گھر تھا۔ یعنی مسجد! مسجد کی مُنڈیر پر دو چار آدمی بیٹھے تھے۔ ایک صاحب کے ہاتھ میں کوئی کاغذ تھا جسے وہ پڑھ کر سنا رہے تھے۔ حمید کے ذہن میں بجلی کی سرعت کے ساتھ ایک خیال آیا۔ وہ بھاگا ہوا اپنے گھر میں گیا اور جب واپس آیا تو ایک کتاب اُس کے ہاتھ میں تھی۔ کھیت کی مُنڈیر پر بیٹھ گیا اور چاند کی بکھری ہوئی روشنی میں کتاب پڑھنی شروع کر دی۔ آج اس نے رات کی تاریکی پر فتح پا لی تھی۔ وہ بے انتہا خوش تھا۔ بابر کا قصہ پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ جیسے کوئی فاقوں کا مارا کھانے پر پل پڑے۔ پڑھتا رہا، پڑھتا رہا یہاں تک کہ تیس صفحوں کا

طویل سبق ختم ہوگیا۔ پھر وہ اٹھا اور گھر کا رخ کیا۔

"کہاں گیا تھا رے؟" اس کی ماں نے سوال کیا۔

"یہیں تھا اور جاتا کہاں!"

"یہاں کہاں تھا۔ میں نے تو ساری حویلی میں ڈھونڈھ مارا!"

"اری یہیں سامنے کھیت کی مینڈ پر بیٹھا تھا"

"وہاں کیا کر رہا تھا بیٹھا ہوا؟"

"کتاب پڑھ رہا تھا"

"کتاب پڑھ رہا تھا! کھیت کی مینڈ پر! آخر کہہ کیا رہا ہے؟"

"ارے ہاں کتاب پڑھ رہا تھا۔ دیکھتی نہیں۔ چاند نکلا ہوا ہے بجلی کے ہنڈے جیسی روشنی ہو رہی ہے"

"اچھا یہ بات ہے۔ ارے کمبخت! اندھا ہو جائیگا اندھا۔ پہلے ہی آنکھیں مچی مچی سی رہتی ہیں۔ بالکل ہی پھوٹ کے رہ جائینگی"

"نہیں پھوٹ کے رہ جائیں گی" حمید نے بے پروائی سے جواب دیا۔

اس کے دو تین دن بعد کا ذکر ہے کہ حمید بازار سے آیا اور شام کا کھانا کھانے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کی ماں سامنے باورچی خانہ میں بیٹھی تھی۔

"آماں کیا بجا ہوگا؟" اس نے بڑا سا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ہوں گے۔ کیوں کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں یونہی پوچھنا تھا"

کھانا کھا چکا تو اپنے چھوٹے سے آنگن میں ٹہلنے لگا۔ کرتہ کے دامن سے بدن کو ہوا کرتا جاتا اور سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا جاتا۔

"آماں! آج ابھی تک چاند نہیں نکلا" اس نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

ماں گویا اس سوال کی منتظر ہی بیٹھی تھی "چاند تو نہیں تیرے لئے سورج نکلے گا۔ اب کیا روز سر شام چاند نکل آیا کرے بس ہو چکی چار دن کی چاندنی"

"لیکن نکلے گا تو؟ دیر سے سہی"

"نکلے گا کوئی گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب"

کچھ دیر تک حمید خاموش رہا۔ پھر بولا "آماں مجھے گیارہ بجے جگا دینا۔ ذرا اردو کی کتاب پڑھوں گا"

"چل چل بڑا آیا پڑھنے والا"

"اچھی اماں!"

آماں نے جواب نہ دیا۔ وہ پتیلی چاٹنے میں مصروف تھی۔

"آماں!" حمید کچھ توقف کے بعد پھر بولا۔

"کیا ہے رے؟"

"گیارہ بجے جگا دیجو" اس نے گڑگڑا کر کہا۔

"اچھا جگا دونگی۔ چل جا کے سو"

وہ مطمئن ہو کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ تھکا ہوا تو تھا ہی فوراً نیند آگئی۔ رات کو کسی وقت آنکھ کھلی۔ دیکھا کہ چاند سر پہ ہے اور ہر طرف چاندنی پھیلی ہوئی ہے۔ گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔ ماں برابر چارپائی پر سو رہی تھی۔ بلکہ پڑی جاگ رہی تھی۔

چارپائی سے اترنے لگا تو ماں نے کہا "کیا ہے حمید، کہاں جاتا ہے"

"پانی پیوں گا" حمید جھوٹ بولا۔

گھڑے میں سے نکال کر پانی پیا اور پھر چارپائی پر آکر بیٹھ گیا۔

"آماں ابھی گیارہ نہیں بجے" اس نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"گیارہ کے بچے صبح ہونیوالی ہے۔ چپ چاپ پڑ کے سو جا"

اب اسے یہ معلوم ہوا کہ گیارہ کبھی کے بج چکے اور اب صبح کا وقت قریب ہے تو اسے بڑا قلق ہوا اور غصہ بھی آیا۔ اس نے کھسیانی آواز میں ماں سے کہا "جگایا نہیں تو نے آماں؟"

"ارے! میں کہتی ہوں چپکا ہو کے سو جا۔ زیادہ بکواس نہ کر"

ماں نے ناراض ہوکر کہا۔

وہ لیٹ گیا۔ لیکن نیند اُڑ چکی تھی۔ پانچ سات منٹ کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر بہت لجاجت کے ساتھ بولا: "اماں دینیات کی کتاب میں کر دعائے قنوت یاد کرتا"؟

"حمید! میں جوتی کھینچ کے مارونگی" ماں زور سے چلائی۔

اب سو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اور تاریکی پر جو اس نے فتح پائی تھی وہ ایک عارضی فتح ثابت ہوئی۔

حمید کا گھر جس گلی میں تھا اس کے پہلو میں ایک دوسری گلی تھی۔ یہاں ایک بابوجی رہتے تھے۔ جو بندوبست کے محکمہ میں ملازم تھے۔ حمید کی ماں ان کے ہاں اکثر جایا کرتی تھی۔ حمید بھی کبھی کبھی ان کے لڑکوں کے پاس چلا جاتا تھا۔ ایک رات وہاں گیا تو دیکھا کہ دروازہ کے باہر ایک تخت پر دونوں لڑکے اپنی کتابیں لئے بیٹھے ہیں۔ بڑا بھائی اونگھ رہا تھا اور نیند کے غلبہ سے اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ ایک کھلی ہوئی کاپی اس کے سامنے رکھی ہوئی تھی۔ چھوٹا بھائی ایک کتاب پر جھکا ہوا تھا۔ جیسے کوئی نماز پڑھ رہا ہو اور سجدہ میں ہو۔ دونوں کے بیچ میں ایک بڑی سی لالٹین رکھی تھی۔ اور نہایت تیز لَو کے ساتھ جل رہی تھی۔ حمید نے سوچا کہ اگر میں ان لڑکوں کے ساتھ پڑھ سکوں تو کیا ہی اچھا ہو۔ اماں ان کے ہاں آتی جاتی ہے۔ اگر بابوجی سے کہے گی تو وہ مجھے یہاں بیٹھ کے پڑھنے کی اجازت دیدیں گے۔ گھر گیا کہ ماں سے ذکر کرے۔ ماں گھر پر موجود نہ تھی۔ لیکن چولھا جل رہا تھا اور ہانڈی چڑھی ہوئی تھی۔ حمید نے ہانڈی کو کھول کر دیکھا۔ اس میں چاول پک رہے تھے۔ پھر چولھے کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور دست پناہ لے کے آگ کُریدنے لگا۔ لکڑیاں دھڑ دھڑ جل رہی تھیں۔ اور آگ کے شعلے نہایت دلفریب تھے۔ اس کی نظر اپنے بائیں ہاتھ کی پُشت پر پڑی۔ وہاں "عبدالحمید درجہ پنجم" لکھا ہوا تھا۔ یہ الفاظ اس نے شام کو اپنے ہاتھ پر لکھے تھے۔ اور ہتھیلی پر ہندوستان کا نقشہ بنایا تھا۔ جس میں مشہور مقامات کے نام بھی درج کئے تھے۔ آگ کی روشنی میں ایک ایک لفظ صاف پڑھا جاتا تھا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ میں یہاں چولھے پر بیٹھ کر اپنی کتاب پڑھوں۔ چنانچہ اندر سے اُردو کی کتاب نکال لایا۔ اور اقبال کی نظم "ماں کا خواب" پڑھنے لگا۔

"ارے حمید میں تجھے ڈھونڈھ رہی ہوں۔ کیوں مارا مارا پھرتا ہے" سامنے ڈیوڑھی سے اس کی ماں کی آواز آئی۔

اُس نے کتاب کو جلدی سے گود میں چھپالیا۔ لیکن اس کی یہ کوشش ناکامیاب رہی۔

"میں تیری کتابیں چولھے میں جھونک دونگی۔ سنا تو نے" ماں نے ڈانٹنا شروع کیا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگ کُریدنے لگا۔

"کیوں آگ کو بجھائے دیتا ہے ـــــ کم بخت کسی طرح باز ہی نہیں آتا۔ ارے تجھے پڑھنے کیلئے پہاڑ سا دن کافی نہیں ہے۔ نگوڑے اندھا ہوجائیگا" دیکھو لیجو لکڑی ٹیک کے چلا کریگا"

حمید جھلا گیا "تو پھر کیوں نہیں چراغ میں تیل ڈالتی" اُس نے چولھے کے پاس سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"تیرا باپ دولت چھوڑ مرا ہے نا کہ میں روز رات کو گیس کے ہنڈے روشن کیا کروں"

حمید کتاب ہاتھ میں لئے گھر سے نکل گیا۔ گلی میں پہنچکر اس نے گنگنانا شروع کیا:۔

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب
بڑھا اور جس سے مرا اضطراب
یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں
اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں!

گلی کے نکڑ پر پہنچکر وہ زور زور سے گانے لگا۔

کوئی اس سمے کا بیاں کیا کرے
اندھیرا خموشی بغلگیر تھے

اندھیرا خموشی بغل گیر تھے

اندھیرا خموشی ....

وہ دفعتاً خاموش ہو گیا۔ سامنے سڑک پر ایک لالٹین جل رہی تھی۔ یہ میونسپلٹی کی لالٹین تھی۔ اس نے خیال کیا کہ اس اندھی دنیا میں بھی کہیں نہ کہیں روشنی مل ہی جاتی ہے۔ وہ مسرت اور خفگی کے جذبات دل میں لئے آگے بڑھا اور لالٹین کے کھمبے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ یہ سڑک قصبہ سے باہر جاتی تھی۔ اور اس پر لوگوں کی آمد و رفت بہت کم تھی۔ خصوصاً رات کو تو مشکل ہی سے کوئی ادھر سے گذرتا تھا۔ حمید نے کتاب کھولی اور پڑھنا شروع کیا۔ وہ یہاں گھنٹوں اطمینان کے ساتھ پڑھ سکتا تھا۔ صرف آج نہیں بلکہ ہر اس رات کو جب آسمان پر چاند نہ ہو۔

~~~

یوں حمید کے تعلیمی سال کی ابتدا ہوئی۔ وہ برابر محنت کے ساتھ کام کرتا رہا۔ دن دن بھر پڑھا کرتا اور رات کو بھی پڑھنے سے باز نہ آتا۔ کبھی چاند کی روشنی میں کبھی چولھے کے سامنے بیٹھکر کبھی سڑک کی لالٹین کے نیچے اور اگر کسی شب اس کے گھر میں دیا جل جاتا تو وہ بارہ ایک بجے تک پڑھنا اپنا فرض خیال کرتا۔

~~~

اس طرح اس نے سال بھر محنت کی۔ امتحان سے چند دن پیشتر اس کی آنکھیں دُکھنے آگئیں۔ پھر بھی اس کے انہماک میں کمی واقع نہ ہوئی۔ اور جب تک امتحان ختم نہ ہو گیا اس نے کتابیں ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ امتحان دینے کے بعد اسے یقین تھا کہ کوئی دوسرا لڑکا اس پر فوقیت نہ پا سکے گا۔

لیکن قبل اس کے کہ امتحان کا نتیجہ معلوم ہو —— اپریل کی گرمی میں —— اس کی آنکھیں بالکل اُبل پڑیں۔ اور اس کو ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

~~~

ہسپتال میں چار مہینے رہا۔ اور جب وہاں سے "اچھا" ہوکے آیا تو آنکھوں کی بجائے اس کے ماتھے میں دو بڑے گڑھے تھے! —— اس کی دونوں آنکھیں ضائع ہو چکی تھیں اور وہ بالکل اندھا تھا۔

× × × × ×

—— اختر انصاری بی۔اے (آنرز)
~~~

شرارتوں کی ناقدری

گھر میں قدم رکھتے ہی کیا دیکھتا ہوں کہ صحن میں ایک ننھا سا پُتلا کھڑا ہے، پیچھے کی طرف سر سے پاؤں تک ایک النگ نیچرنگ سفید باقی نصف انسان کا بچہ اور بچیاں بچے اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ بیگم بانس کے گز سے اُسے پیٹ رہی ہیں، چھوٹے بچے بچیاں خوف اور ہمدردی سے چلا چلا کر رو رہے ہیں۔ مگر وہ پُتلا پٹ رہا ہے اور خاموش ہے۔ میں نے کہا "ارے یہ اکرم میاں ہیں! کیوں میاں یہ کیا شگوفہ کھلایا ہے" بیساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ "اے واہ یہ سانگ بھی بُرا نہیں رہا۔ سادھو والے سے کم نہیں"

داخلی حکومت کے غیر مدوّن قوانین کے دفعہ ۳ کے خوف سے ہنسی کو روکنا چاہتا ہوں اور کمبخت نہیں رُکتی۔ وہ دفعہ یہ ہے کہ "جس وقت کسی بچے یا بچی کو (آٹھ سال کی عمر تک) بیگم تنبیہ کر رہی ہوں جس میں چشم نمائی سے لیکر اس مار پیٹ اور بھوکا رکھنا یا ترک گفتگو سب داخل ہیں، تو کوئی شخص مرد، عورت، بالغ نابالغ مزاحم نہ ہو نہ ہنسے۔ خلاف ورزی کی سزا ملزم کو نہیں بلکہ زیر تنبیہ بچے کی عقوبت میں دوگنی سے لیکر دس گنی مقدار کا اضافہ۔ اور ملزم سے ستیہ گرہ کے اقسام سے حسب موقع یا مزاج کسی قسم یا قسموں پر عمل وغیرہ الگ۔۔۔۔"

بیگم نے پلٹ کر دیکھا ایسی تیکھی چتون سے جیسے میں ہی ملزم ہوں۔ "دیکھا صاحبزادہ بلند اقبال کا نیا کارنامہ؟ ہوا جی خوش؟ یہ آپ ہی کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے سوا کوڑی کا تین ہوکر رہ گیا۔ اور ابھی کیا ہے آگے چلکر منظور نہ بن گیا تو پھر کہنا کون جھک مارتا تھا۔ آج ہی نئے کپڑے پہنے تھے۔ یہ شکل بناکر آیا ہے۔ اور آپ ہنس ہنس کر داد دے رہے ہیں۔ لیجائیے آپ کے بیٹے کی سیوا مجھ سے نہیں ہو سکتی، میں بیٹیوں کو دیکھوں کہ بیٹوں کو۔ یہ آپ کا فرض ہے آپ کا ذمہ ہے۔ اپنے پاس رکھئے جیسے چاہئے کھلائیے پلائیے، سُلائیے، پہنائیے اڑھائیے، نہ آپ خبر لیتے ہیں نہ ماسٹر صاحب کسی ڈھنگ کے ہیں کہ رُعب نہیں رکھ سکتے۔

"کچھ بتاؤ بھی آخر ہوا کیا؟"

"ہوا کیا؟ دیکھتے نہیں؟ مسالہ (سرخی چونا) کے بھرے حوض میں غوطہ لگا رہا ہے"

"جلدی کپڑے الگ کر کے نہلا دو پھر لکچر دے لینا۔ ورنہ مسالہ تیز ہے کھال اُتر جائیگی"

بڑھکر میں نے کپڑے اتار دئے، بیگم مُنہ پھلاکر الگ جا کھڑی ہوئیں۔ میں جب پانی لینے چلا تو ہاتھ سے بالٹی لیکر اُسے خود نہلانے لگیں، ساتھ ہی گدگداتی جاتی تھیں۔ میں دیوانخانہ میں جا بیٹھا۔ معاملہ کی تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ گھسیٹا (نوکر کے بیٹے) اور اکرم میں مسالہ کے حوض پر لمبی چھلانگوں کا مقابلہ تھا۔ گھسیٹا بڑا ہے آسانی سے پھلانگ گیا۔ اکرم بھی پھلانگ گیا۔ گھسیٹا نے کہا اس کی ہی نہیں آپکے ہاتھ میں ڈنڈا تھا اسکا سہارا لے لیا۔ چھٹے ہاتھ پھلانگیے۔ اکرم نے ڈنڈا پھینک کر پھر جو چھلانگ ماری تو اُس کنارے پہونچا ہی چاہتا تھا کہ گھیسو نے ہاں ہاں کردی کنارے پہونچکر اُس کے پیر پھسلے اور وہ چت حوض میں جاگرا۔

کھانے پر بُلاوا آیا۔ دسترخوان پر بیٹھا تو اکرم نہ تھا۔ میں نے پوچھا "وہ کھانا کھا چکا؟"

"مسالہ سے پیٹ بھر چکا ہے اب کھائیگا کیا"

"مار اور رونے سے بھوک تیز ہو جاتی ہے اور اس غریب نے

دونوں کھاتے ہیں۔"

"آپ کا جو جی چاہے کیجئے۔ بلا کر پیار کیجئے معافی مانگیئے ہمت بڑھائیے، میں تو اُسے بستر پر بھیج چکی ہوں۔ میں نہیں بلاتی۔"

"اب تو اُسے بھر جی پیٹ چکیں۔ آخر سزا کی کوئی حد بھی ہونا چاہیئے؟"

"شرارت کی بھی کوئی حد ہونا چاہیئے۔ اور میں نے ابھی پیٹا ہی کیا ہو۔ آپ گھر میں نہ ہوتے تو مزہ چکھا دیتی۔"

"یہ تو کوئی غیر معمولی شرارت نہیں۔ بچپن میں ایسی حرکتیں سب کرتے ہیں۔"

"سزا بھی سب پاتے ہیں۔ نہ پائیں تو بگڑ جائیں۔"

"مگر... حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں"

جلال کے وقت بیگم پر بحث کا اُلٹا اثر ہوا کرتا ہے۔ جی تو نہ چاہا کہ اُس مظلوم کے بغیر کھانے کو ہاتھ لگاؤں۔ مگر میرے بھوکے رہنے کے معنی ہوتے بیگم کا بھوکا رہنا اور قصہ کا طول کھینچ جانا۔ میں نے کچھ زہر مار کرلیا۔ اور پوڈینگ کو جو اُس روز میری خاص فرمائش سے ایک نئے نسخہ سے پکی تھی میں نے ہاتھ نہیں لگایا۔ کہدیا صبح ناشتہ میں ٹھنڈی کھائی جائے گی۔ اس کا اثر میں جانتا تھا۔ اب وہ نرم ہو چلیں اور سونے کے وقت تک بالکل موم تھیں۔ صرف موم نہیں اُلٹی میری دلجوئی ہو رہی تھی اور میں ذرا اکڑ رہا تھا۔ تھوڑی سی گفت و شنید کے بعد میں مَن گیا۔

جب میں نے دیکھا وہ بالکل ٹھنڈی ہو چکی ہیں تو کہا "کہانی سُنو گی؟"

"نوازش! مدت بعد یہ عنایت ہو رہی ہے۔ کسی زمانہ میں روز افسانے سُنتے سُنتے سو جایا کرتی تھی۔ اب تو باتیں کرنے کی بھی "فرصت نہیں"۔ آدھی آدھی رات تک کتابیں اور رسالے پڑھنا ہی ضروری کام ہے۔"

"اچھا سچی کہانی سُنوگی یا جھوٹی؟"

"سچی۔ اگر کہانی سچی ہوتی بھی ہو۔"

"آپ بیتی یا جگ بیتی؟"

"آپ بیتی۔"

"میں بھی یہی چاہتا تھا۔ لو سُنو آپ بیتی۔ یہ تو تم جانتی ہو میں لڑکپن میں بڑا نٹ کھٹ تھا۔"

"آج ماشاءاللہ کیا کم ہیں؟"

"اور تم بھی کسی سے کم نہ تھیں۔"

"جی ہاں آپ ہی نے دیکھا تھا۔"

"بلاؤں بڑی بی کو؟ دلوا دوں گواہی؟ اِسی دن کے لئے میں نے اُن کو تبرک بنا کر رکھ چھوڑا ہے۔"

"وہ زندہ مُرغی کے سارے پر نوچ کر کس نے چھوڑا تھا؟ خیراتن بُوا کی پٹاری میں چوہیا پکڑ کر کس نے ڈال دی تھی؟ اُستانی جی کے دودھ میں کونین کس نے جھونکدی تھی؟ مولوی صاحب کی ناسدانی میں مرچوں کا سفوف کس نے ملا دیا تھا؟ اور پھر کیا ہوا تھا؟"

"بس بس!"

بیگم اب پسلی پکڑ کر لگاتار ہنسے جاتی تھیں۔ اور جب کبھی یہ ذکر چھڑ جاتا تو وہ ہنستے ہنستے لوٹ جایا کرتی ہیں۔ یہ نسخہ میں جانتا تھا۔

"اب کہانی بھی کہی جائیگی یا میری شرارتوں کی فہرست ہی گنائی جائیگی۔ آپ کی بھی بہت بچپن کی شرارتیں پھوپی اماں سے سُن چکی ہوں۔"

"میں تو خود سُنانے بیٹھا ہوں۔ خیر تو آج اکرم کی ہیئت کذائی دیکھکر میں جو ہنسنے لگا اصل میں اپنے بچپن کا ایک منظر آنکھوں میں پھر گیا۔

میری اماں نے بڑے ارمان سے مجھے ایک اچھا سا"

جوڑا سی دیا تھا کہ وقت بے وقت کسی خاص موقع پر پہنوں گا۔ زیادہ تر ماموں کے بیٹے کے بیاہ کی تقریب کا خیال تھا۔ مجھے بھی بڑا اشتیاق تھا۔ بڑے شہر میں جاتا تھا جہاں میرے کئی خالہ زاد اور ماموں زاد بھائیوں سے یاری تھی۔ پھر وہاں سے ننیال کا پروگرام تھا جہاں مٹر اور چنے کے کھیتوں، تالاب کی مچھلیوں، باغ کے پھلوں نصیر بھائی کے ساتھ شکار کے خواب دیکھا کرتا تھا۔

کپڑے میں بہت خراب کرتا تھا۔ اسی اکرم کی عمر ہوگی۔ ایک روز مدرسہ جاتے ہوئے کیچڑ میں پھسل کر گر گیا۔ کم سے کم اماں سے یہی کہا۔ اصل واقعہ یہ ہوا تھا کہ ایک ساتھی لونڈے سے اسی اکرم کی طرح چھلانگ مارنے کا مقابلہ تھا۔ وقت پر کوئی کپڑا موجود نہ تھا۔ سب دھوبی کے ہاں تھے۔ ناچار اماں نے وہی نیا جوڑا پہنا دیا اور تاکید کر دی کہ مدرسہ سے سیدھے گھر آنا اور پہلے یہ کپڑے بدل لینا۔ جب تک اترے ہوئے کپڑے دھلکر خشک ہو چکیں گے۔

میں اور سیدھا مدرسہ سے گھر آتا اور دن کے سب سے قیمتی گھنٹے برباد کر دیتا! میرا ایک ہم جماعت تھا عیدو، عیدو۔ ایک روز قبل میونسپلٹی کی آب پاشی والی گاڑی بیلوں سے جدا کنوئیں کے پاس کھڑی تھی میں اسے بھرتے دیکھ چکا تھا۔ عیدو سمجھا خالی ہے میں نے کہا یار اس پر چڑھکر چرخ ہنڈولے گا۔ (اوپر نیچے چڑھنے اترنے والا چرخہ نما) مزا لوٹا جائے۔ منہ سے نکلتے ہی وہ پیچھے سے اچک کر پہلے جا چڑھا اس کا چڑھنا گاڑی کا الٹنا۔ عیدو کا ناک میں چوٹ کھاتے ہوئے گرنا اور سر سے پاؤں تک شرابور ہو جانا، یہ سب واقعات دو سکنڈ کے اندر وقوع میں آ گئے۔ میونسپل جمعدار نے مدرسہ میں رپورٹ کر دی۔ اس دن جو وہ سوجی ہوئی ناک لئے مدرسہ آیا اور دوسری گواہیوں سے الزام کی تصدیق ہو گئی تو تو خوب بید بازی ہوئی۔"

"اس نے آپ کا نام نہیں لیا اور نہیں پٹوایا؟"

"نہیں!"

"کیوں؟ دلی دوست تھا؟"

"نہیں۔ اس وقت دشمن ہو چکا تھا۔ ہر گروہ کا ایک ذاتی اخلاق ہوتا ہے بالخصوص جرائم پیشہ کا۔ معمولی چور ڈاکو ہوں یا ملکوں کو لوٹنے والوں اور حملہ آوروں کا گروہ یا مدرسہ اور کالج کے لڑکوں کی جماعت ان سب میں اور کیسی ہی برائیاں ہوں مگر ایک دوسرے کا راز فاش کرنے کو ناقابل عفو گناہ سمجھتے ہیں کوئی کر بیٹھے تو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔

عیدو کو یقین تھا کہ میں نے جان بوجھ کر اس کو دق کیا ہے۔ دل میں کینہ لئے تھا۔ بظاہر وہ مجھ سے من گیا۔ ایک چھوٹی سی ہوائی بندوق جیب سے نکالی اور ہم نئی دلچسپیوں کی تلاش میں نکلے جھاڑیوں میں گلیوں میں، بیل گاڑیوں کے پیچھے چھپ چھپ کر کسی راہگیر کے چھرا مار دیا۔ اور وہ شانہ ملتا اِدھر اُدھر تکتا بڑبڑاتا نکل گیا، کسی بانکے کی زری کی ٹوپی کھٹکی اور نشانہ کی مشق کی، ٹوپی گرا دی وہ کچھ سمجھ نہ سکا اور ہم منہ میں رومال ٹھونس ٹھونس کر ہنسی کو گھونٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی عورت کے بھرے گھڑے میں ٹن سے مار دیا پانی کی ٹونٹی بہہ نکلی، عورت شرابور ہو گئی، تماشائی ہنسنے لگے اور اس کے کوسنے کے مخاطب و مورد سب ہو گئے با کوئی بھی نہیں کسی دو من کی ٹنگی اٹھائے ہوئے مزدور کی ننگی پیٹھ پر چھرے کا لگنا جھلا کر اس کا ٹنگی گرا دینا، شور مچانا، گالیاں بکنا۔ ان دلچسپیوں میں اندھیرا ہو گیا۔ ہم گھر چلے۔ راہ میں عیدو نے دور سے میونسپلٹی کا ایک روشنی کا کھمبا دکھا کر کہا "بھلا تم اس کھمبے پر چڑھ سکتے ہو؟"

میں نے کہا "یہ کونسی بڑی بات ہے میں لوہے کے پتلے گول کھمبوں پر چڑھ چکا ہوں، یہ تو موٹا چوکور لکڑی کا ہے"

میں دوڑ گیا یا تمہاری زبان میں بھاگا اور چشم زدن میں چڑھ گیا....... ہونہہ! آخ! یہ کیا! آدھا کھمبا طے کرنے پر ہاتھ پاؤں میں کوئی چیز چبھتی اور ناک میں رال کی ناگوار تیز بو

محسوس ہوئی۔ وہیں سے میں کود پڑا۔ یہ تازہ رنگا گیا تھا اور عیدو اس سے واقف تھا۔ اس نے کل کی کسر نکالی ہے۔ اس کے پیچھے دوڑا اور جالیا۔ پہلی گرفت میں ہاتھوں کا رنگ اس کے سر پر ملا پھر اس سے چمٹ گیا۔ اس آویزش میں عیدو کے شور غل پر سامنے کے گھر سے ایک عورت نکل پڑی اور بیچ بچاؤ کرکے ہمیں جدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی لیسدار دھبہ سا پڑ رہا ہے تو اوئی کرکے پیچھے ہٹی۔ میں عیدو سے گتھا رہا اور جہاں تک بنا اپنے بدن اور کپڑوں کا رنگ اس کے منہ اور کپڑوں میں رگڑا۔ آخر جان چھڑا کر بھاگا اور میں متفکر گھر کو چلا۔

معمول سے بہت زیادہ دیر سے گھر پہونچا تھا۔ اماں منتظر تھیں۔ خیریت گذری صرف دیر سے پہونچنے کیلئے ہی صلواتیں سنیں۔ میں نے بہانہ کر دیا کہ مدرسہ کے کواڑوں میں رنگ پھر رہا ہے، بے خبری میں ہاتھ سن گئے۔ فوراً دھلائے گئے۔ میں فرا دور دور رہا۔ نئے کپڑے اتار کر صبح والے دھلے ہوئے کپڑے پہن لینے کا حکم ہوا۔ میں نے کہا کل کے مدرسے کے کام بہت سارے ہیں مشقیں ختم کرلوں تو بدل لونگا۔ اماں شاید میرے اس احساسِ فرض پر دل میں بہت خوش ہوئیں۔

میں حسبِ معمول ابا کی میز پر جا بیٹھا، روشنی سے دور ایک سرے پر، اور لگا مشق بنانے۔ ابا نے کہا "روشنی کے قریب آجاؤ"۔ میں نے کہا "پتنگے ستاتے ہیں۔ ادھر کافی روشنی ہے"۔ وہ اپنی کتاب میں غرق ہو گئے۔ پھر انہوں نے جو سر اٹھایا تو مجھے دیکھا کہ پاؤں پر پاؤں چڑھائے جس نشست سے بیٹھا تھا اسی طرح بُت بنا بیٹھا ہوں۔ سلیٹ سامنے ہے، پنسل ہاتھ میں اور نظر نیچے زانوؤں پر۔ وہ کچھ دیر سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جب آنکھیں چار ہوئیں تو میں معاً جھجک گیا۔ یہ دیکھکر کہ وہ کچھ تاڑ گئے۔ مجھے یقین ہے وہ بھی اپنے بچپن میں اس قسم کی شرارتیں ضرور کر چکے تھے۔"

"آپ اپنے ساتھ مونے مٹے بزرگوں کو بھی سانے لیتے ہیں اچھے لائق فرزند ہیں!"

"اس میں نالائقی کیا ہے؟ وہ بھی لائق تھے میں بھی لائق ہوں اور الحمدللہ کہ اکرم بھی لائق معلوم ہوتا ہے"۔

خیر مجھے کھڑا کرکے روشنی میں سر سے پاؤں تک میرا رنگین حلیہ دیکھکر ہنس پڑے۔ نرمی سے کہا اپنی پوری داستان سچ سچ سنا دے تو ماں سے نہیں کہونگا۔ میں نے رُوداد بے کم و کاست سنا دی۔

اسی سے قیاس کرلو کہ ابا اور اماں سے میرے تعلقات میں کیا فرق تھا۔ اماں کی ماتا کی لہر یقیناً ابا سے تیز تھی۔ مگر ساتھ ہی وہ اپنے عقائد اور اصول اخلاق و تربیت میں بہت سخت تھیں۔ ابا میرے بچپن تک، جب تک میں اماں کی زیرِ نگرانی تھا میرے باپ ہی نہیں، راز دار دوست تھے جن پر مجھے بہت بھروسا تھا دل کو ایک ڈھارس اور عجب تقویت تھی جس کی میں شرح نہیں کرسکتا۔ آگے چلکر جب میں نے صباوت یعنی لڑکپن کے دوسرے درجہ میں قدم رکھا تو معاملہ الٹ گیا۔ وہ کچھ سخت اور کم آمیز ہوگئے یا بن گئے اور ان کی اگلی رازداری، دوستی، اعتماد، دل کی تقویت اور خاطر جمعی اماں میں منتقل ہوگئی۔ یہی ہوتا ہے۔ بچے براہِ راست جس کی نگرانی میں ہوتے ہیں اس سے ڈرتے ہیں اور ڈرنا چاہیے اور جن سے دور رہتے ہیں ان سے تسلی پاتے ہیں۔ اس طرح والدین میں سے ایک نشتر لگاتا ہے یا لگاتی ہے تو دوسرا مرہم رکھتا ہے یا رکھتی ہے۔

اب سمجھیں تم میرا برتاؤ؟ میں اکرم کو بگاڑ نہیں رہا ہوں۔ یہ قدرتی بات ہے کہ بچہ ایک طرف سے دبے تو دوسری طرف بڑھے۔ آج تم سے بھاگتا ہے تو میرے پاس پناہ لیتا ہے کل مجھ سے بھاگیگا تو تمہارے پاس پناہ ڈھونڈیگا۔ سمجھیں؟"

"جی ہاں مردوں کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

بدمزاج، ناقص العقل تو عورتیں ہوتی ہیں۔ خیر لکچر پھر سنونگی۔ کہیئے پھر کیا ہوا؟"

"میری کوئی بات تمہارا دل مان بھی لے تو زبان نہیں مانتی۔"

(مسکرا کر) بس اکھڑ چلے ہتھے سے۔ اچھا لیجئے۔ بہت معقول، مناسب، موزوں، اُچت، اب کیا فرماتے ہیں بدمیان جی؟"

"شریمتی جی میری پرارتھنا صرف یہ ہے کہ اکرم کو سزا تو تم قرار واقعی دے چکیں اب خدا را اُسے بھوکا تو نہ سلا دو۔ کچھ کھلا دو۔"

"آپ ماں کیوں نہیں ہوئے تھے! یہ بھی کوئی بات ہو کہ بچّہ کو ماں سزا دے باپ منہ چومے۔ اور وہ تو کب کا سوگیا۔"

"جانتی ہو بچہ جب تک بھوکا رہتا ہے اُس کا خالی معدہ اپنی دیوار کو اور آنتیں ایک دوسرے کو یوں پیستی ہیں جیسے خالی چکیاں اپنے پتھر کو۔ اس طرح خون کھنچکر خشک ہوجاتا ہے اور تلافی میں تین مہینہ کامل لگ جاتے ہیں۔

یہ نشانہ ٹھیک بیٹھ گیا۔ صحت کا خطرہ (اپنی نہیں۔ جہانتک میرا اور بچوں کا تعلق ہے) بیگم برداشت نہیں کرسکتیں۔ اُٹھیں کہ اکرم کو جگا کر کھلا دیں۔ مگر میں نے یہ کہکر روک دیا کہ نیم بیداری میں اور اتنی رات گئے کھانا ہضم نہ ہوگا۔ آئندہ احتیاط رکھی جائے۔ اُنہوں نے وعدہ کیا کہ اب بھوک کی سزا نہ دیجائیگی۔

"کیا کروں مجھے ہر وقت یہی سوچ رہتا ہے کہ یہ کبھی سدھرے گا بھی۔"

"وہ بگڑا ہی کیا ہے! دیکھو میں سدھرا ہوں یا بگڑا؟"

"بالکل بگڑے۔ اپنے منہ میاں مٹھو۔ یا ماتحتوں اور مریضوں کے منہ۔ خیر آپ بہت اچھے سہی رسالہ لمعات کی خوشامد کا لفظ لفظ صحیح۔ مہاتما جی پہلے اپنی کتھا تو ختم کیجئے۔ پھر کیا ہوا، میں تو یہ سننے کی منتظر ہوں کہ اماں کے ہاتھ آپ پٹے یا نہیں؟"

"میں تو خود یہی سنانے بیٹھا ہوں۔ گو تمہاری دلی مراد پوری نہ ہوگی۔

"ہاں تو ابا ہنسنے لگے۔"

"جیسے آپ ابھی شام کو اکرم کو دیکھکر ہنسے تھے! یا مولا، سب مرد ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں؟"

"سب عورتیں بھی شاید ایک ہی پسلی، نا توبہ (بات بڑھ جاتی)[1] ایک ہی طرح کی ہوتی ہیں۔ خیر۔ ابا میرے ہمدرد یا جیسے شریک جرم ہوگئے۔ اُنہوں نے بدھو (نوکر) کو نہیں پکارا کہ کمبخت ذرا ذرا سی بات اندر پہونچا دیتا ہے اور شہر تنی کا مبالغہ اُسے رائی کا پربت بنا دیتا ہے۔ خود غسلخانہ میں لے جاکر کپڑے اُتروائے۔ نہلایا اپنا تولیا لپیٹ دیا اور وہ خود اندر سے میرے کپڑے الگنی پر سے اُٹھا لائے۔ اب بیٹھے میرے کپڑے صابن سے دھونے۔ پینٹ صابن سے کیا چھٹتا۔ خیال آیا کہ تارپین لگایا جائے۔ پھر اندر سے ایک بوتل لے آئے اور کپڑوں پر انڈیلی تو سیاہ عرق کپڑے پر گرتے ہی سفید ہوگیا اور تیز بو اُڑی۔ فوراً کھل گیا کہ یہ فنائل ہے۔ توبہ توبہ۔ اب کیا ہو؟ بہت سا پانی گرا کر کپڑوں کو کنارے ڈال دیا کہ اب یہ چندی کس مصرف کی رہی۔

ابا کے بے وقت دوبار اندر جانے اور توشہ خانہ میں گھسنے پر اماں کھٹکیں ضرور ہے کچھ دال میں کالا۔ دسترخوان پر

---

[1] بیگم اُن بیویوں میں سے ایک ہیں جن کو بیوی حوّا اور اُن کی تمام اولادِ اناث کی طرف سے وکالت نامہ حاصل ہے۔ کوئی تنقید اگر اُن کی ذات سے بڑھکر جنس اناث تک پہونچی پھر امن کی خیر نہیں۔ اب کئے ہو تو جاتے کہاں ہو۔ اس لئے جنسی خصائص کے موضوع پر بہت سوچ سمجھکر گفتگو ہوتی ہے پھر بھی اکثر دو دو چونچ چل ہی جاتی ہے۔

اُن کپڑوں کے بارے میں سوال کیا تو ابا نے کہدیا باہر الگنی پر ڈال دئے ہیں ذرا ہوا کھالیں تو صبح کو تہ کرکے رکھدینا۔ اماں نے کہا خیر، غنیمت ہے بیٹے کے کپڑوں کا اتنا خیال تو ہو گیا ہے۔ نئی بات ہے۔"

اس طرح یہ آئی بلا رات بھر کے لئے تو ٹل گئی۔ صبح ہونے سے پہلے ابا نے اماں سے وکالت کرکے کپڑوں کی ستیاناسی اور فنائل سے تباہی کا حال بتا کر تیار کر لیا تھا۔ وہ سارا بُخار شاید ابا ہی پر نکال چکی تھیں۔ مختصر یہ کہ میں پٹنے سے بچ گیا مگر شادی کی شرکت سے روکنے کی دھمکی کچھ کم سزا نہ تھی۔ خوش قسمتی سے رات کے بھیگنے سے مجھے زکام ہو گیا اور تپ آگئی۔ محلہ میں ایک بچے کو انفلوئنزا سے نمونیا ہو گیا اور وہ مر گیا تھا۔ اماں کا رہا سہا غصہ فرو ہو گیا اور بخار کی حالت میں اُن سے وعدہ لے لیا کہ میں اچھا ہو جاؤں تو حسین پور جانے سے نہ روکیں گی۔ ہائے رے ماں کا دل۔ سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں "میرے لال تو اچھا بھی ہو جا ویسے سو جوڑے تیری جان جی پر سے صدقے کئے تھے۔ دوسرا سی دونگی۔ پھر ایسے کھیل نہ کھیلنا۔"

"سو گئیں؟"

"نہیں۔"

"چپ کیوں ہو گئیں؟"

"ننھے کی ناک چل رہی تھی اور سانس کی آواز بھاری تھی۔ ذرا نبض نہ دیکھ لی جائے۔"

"آخر ماں ہو نہ؟ کہاں تک سخت ہو گی؟ میرے زکام کی کہانی سن کر تم ڈر گئیں اور وہم کرنے لگیں 'اے یہ لونڈا انجرا ہے۔ ایسے کیا ہو گا؟ مجھ سا تیرے زادہ تھوڑا ہی ہے۔ یہ مردانہ کھیل ہی کھیلتے ہیں جن میں زندگی ہے، جان ہے، یہ نہیں تو روگی بچوں کا پلنا اور جینا بے سود ہے۔ جانتی ہو وہی باجی عیدو آج مسٹر ابو نصر انصاری اکزیکیٹیو انجنیر ہے اور میں بھلا آدمی ڈاکٹر، پروفیسر، مصنف، مخترع اور شہر کا معزز لیڈر ہوں اور میری بیوی تربیت اطفال کی ماہرہ حقوقِ نسواں کی وکیلہ لیڈرنی۔"

"پھر لگے آپ بہکنے۔"

"مدرسہ میں ہمارے سلیم الطبع اوّل دوم رہنے والے ساتھیوں میں سے اکثر نے اس دُنیا کو اپنے لئے موزوں جگہ نہ پاکر مُلکِ عدم کی راہ لی اور باقی کسی نہ کسی عُذر سے کالج کی تعلیم نہ پا سکے۔ یا تمام نہ کر سکے۔ پراگندہ روزی، پراگندہ دل زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ میرے جیسے کھلاڑیوں میں سے جو یونیورسٹی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب نہ بھی ہوسکے تو دُنیا میں کامیاب ہیں۔ کوئی پولیس سپرنٹنڈنٹ ہے، کوئی چلتا ہوا وکیل اور مختار اور کوئی خوشحال تاجر۔

اگر تم میاں چھبّن (بھائی کے لڑکے) کا سر جھکائے مدرسہ جانا اور ٹھیک سوا چار بجے گھر پہونچنا، کپڑے ایک ایک ہفتہ صاف رکھنا اور ہمیشہ زکام میں مبتلا رہنا نیکی سلامت روی اور سعادت سمجھتی ہو تو سمجھو، مَیں ایسے بچّوں کے مستقبل سے مایوس ہوں۔ اور میلے کپڑے، نرم و سخت بچھونے، پھیکے اور نمکین کھانے کی ابھی سے پروا ہوئی تو سمجھ لو تمہارا بچہ ناکارہ رہا۔

سمجھیں تم؟ اب اسے اتنا تو نہ ڈرایا کرو کہ مرد کے عوض شرمیلی بچّی بن جائے اور نفیس کپڑوں کے پیچھے مرزا پھویا الگ اور بانکے مرزا الگ۔ یہ ریشمی جوڑے ہی اس عُمر میں قطعاً ناموزوں و ناجائز ہیں۔ مَیں نہیں چاہتا کہ اسے اختر کی طرح بڑے بڑے بال سنوار رہے، بانکی دو پلی ٹوپی، نفیس سلی ہوئی چست شیروانی، پہنا ہوا بڑھیا نیکلاٹ کا گھٹنا، چوڑی دار پاجامہ، پیٹنٹ رشین کڈ کے شو پہنے، عینک لگائے پتلی سی چھڑی لئے نستعلیق چال چلتے نازنین لڑکی دیکھوں جس کی ورزش گھر میں تاش شطرنج اور باہر ٹینس تک محدود ہو۔ سو گئیں؟ سو گئیں؟ سو گئیں۔

محمد مسلم۔ ایم۔ اے

میاںؔ کی مرضی

باورچی خانہ

کمرے کے دائیں طرف آدھے حصے میں چٹائی بچھی ہے۔ بائیں طرف چولھا ہے اور کھانا پکانے کے متعلقہ چیزیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی ہیں۔ چولھے میں آگ جل رہی ہے۔ اُوپر ہنڈیا رکھی ہے۔ الماری میں تن سجے ہوئے ہیں۔ چولھے کے سامنے سعیدہ بیٹھی ہے۔ میلے کچیلے سے کپڑے ہیں۔ عمر بائیس تیئیس سال۔ ہاتھ میں چمچہ ہے۔ ہنڈیا بھون رہی ہے۔ دائیں طرف فرش کے قریب خادمہ (حشمت) بیٹھی آٹا گوندھ رہی ہے۔

سعیدہ۔ (اپنے آپ ہی) توبہ!! گھر میں کہرام مچا رکھا تھا۔ گئی ہو تو اطمینان کا سانس لیا ہے۔ دن بھر کبھی نیچے کبھی اُوپر۔ گھر کی دیواریں بھی کانپ اُٹھی تھیں ——— اب ایک مہینہ تو آرام سے کٹے گا۔ ... (خادمہ سے مخاطب ہوکر) حشمت۔ وہ پانی کا گلاس تو پکڑانا۔ (پانی کا گلاس لیکر ہنڈیا میں چھینٹے دیتی ہے)۔ ... لو حشمت ایمان سے کہنا، ایسے لچھن تم نے بھی دیکھے ہیں۔ آخر ہمارے زمانے میں بھی تو لڑکیاں پڑھا کرتی تھیں۔ میں نے بھی آٹھ جماعتیں پاس کی ہیں۔ مگر ہم کو تو ایسی باتیں نہ آئیں۔ کہیں آئینہ دیکھا جا رہا ہے۔ کہیں بال بن رہے ہیں۔ دوپٹہ سر پہ ٹکتا نہیں۔ کبھی اُوپر کبھی نیچے۔ اِدھر جھانک اُدھر جھانک ——— توبہ ———!!!

حشمت۔ توبہ بی بی!! آجکل کی لڑکیاں ...

سعیدہ۔ (بات کاٹ کر) آج کل کی لڑکیاں کیوں ... اور لڑکیاں بھی تو پڑھتی ہیں۔ میری اپنی بہن ہے۔ خدا کے فضل سے نویں جماعت میں ہوئی ہے۔ مجال ہے کبھی آنکھ بھی اُٹھائے۔ سکول سے آئی۔ بیٹھ کر دو گھنٹے پڑھ پڑھا لیا پھر گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئی۔ گھر کا سارا کام کرتی ہے۔ اماں کو تو بیٹھے بٹھائے کھانے کو ملتا ہے۔ میں نے تو آجتک خالدہ کی طرح کسی لڑکی کو نہیں دیکھا۔ توبہ اِس لڑکی کو کتنی باتیں آتی ہیں ——— باپ کی لاڈلی جو ہوئی۔

حشمت۔ اب تو بی بی اُس کی عادتیں پھر بھی بدل گئی ہیں۔ جب اُس کی ماں زندہ تھی ... بی بی اُن دِنوں تم کبھی دیکھتیں ... یہ تو تمہاری نصیحتیں ہیں کہ اُسے اتنا سلیقہ بھی آگیا ہے۔

سعیدہ۔ مَیں بھلا اُسے کیوں نصیحت کرنے لگی۔ میں تو ہوئی سوتیلی میں تو اُس پر چاہے کتنی ہی جان دوں، میری تو وہی بات ہے، نیکی برباد گناہ لازم۔ ماں نے تو بیٹی کی عادتیں بگاڑیں۔ مگر لوگ تو یہی کہیں گے کہ سوتیلی تھی لڑکی کو سلیقہ بھی نہ سکھایا۔ اور دیکھو نا، اگر منع بھی کروں تو لوگ کہیں گے کہ لڑکی بڑی تنگ ہے۔ کہوں تو بُری نہ کہوں تو بُری۔

(ہنڈیا میں سبزی ٹھونستی ہے)

حشمت۔ بی بی بُرا نہ ماننا۔ لڑکی تو دو دن میں سُدھر جائے مگر ابا کی لاڈلی ہے۔

سعیدہ۔ بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ میں تو صاف صاف کہدینے والی ہوں۔ اور حشمت تمہیں کیا معلوم (رازدارانہ انداز میں) باپ پر تو اس لڑکی نے جادو کر رکھا ہے۔ وہ تو اس پر جان دیتے ہیں۔ (حشمت کے قریب تر ہوکر) اس لڑکی کو چُپ چُپ نہ سمجھو۔ چھوٹی سے چھوٹی بات اپنے ابا سے جاکر لگاتی ہے۔

حشمت:۔ مگر بی بی وہ لے ایسی باتوں سے منع نہیں کرتے؟

سعیدہ:۔ وہ کیوں اپنی لاڈلی بیٹی کو منع کرنے لگے۔ اور مَیں۔ مَیں کچھ کہہ کر کیوں بُری بنوں۔

حشمت:۔ پھر بھی بی بی آخر گھر ہے۔ گھر میں بات ہو ہی جاتی ہے۔

سعیدہ:۔ ہاں کچھ کہوں بھی تو وہ سُنتے ہی نہیں۔ کہہ دیتے ہیں بچی ہے، سکول کی بچیاں یونہی کیا کرتی ہیں۔ کوئی بات نہیں۔

حشمت:۔ لو بی بی۔ اب بھی بھلا بچی ہے۔ اب تو ماشاء اللہ جوان ہے۔ تم کیا ساری عمر اُسے گھر میں بٹھا رکھو گے۔

سعیدہ:۔ (ہنڈیا کو چھوڑ کر اور حشمت کے قریب تر ہو کر) یہی تو میں چاہتی ہوں حشمت۔ اُس کے ابا ان باتوں کو کیا سمجھیں۔ جوان لڑکی ہے۔ یہ کوٹھے پر پردوں سے جھانکنا۔ دوپٹہ کندھوں پر لٹکا رکھنا۔ میں تو ڈرتی ہوں کہ کوئی بات نہ نکل آئے۔ بس لوگ تو یہی کہیں گے کہ سوتیلی ماں سے تنگ آ کر نکل گئی۔ مَیں تو چاہتی ہوں کہ ان چھٹیوں میں نکاح ہو جائے اور اپنا گھر جا بسائے۔ لڑکی کی پھوپی کا لڑکا اسلم ہے نا۔ مدت سے اُن کا ارادہ ہے۔ وہ تو باتوں ہی باتوں میں کئی دفعہ ظاہر بھی کر چکے ہیں۔ اللہ رکھے لڑکا خاصہ ہے۔ دس جماعتیں پاس ہے۔ کوئی عیب نہیں۔ اس سے اچھا رشتہ اور کیا ملیگا۔

حشمت:۔ (آٹے کی پرات ڈھانکتے ہوئے) لو بی بی۔ ابھی تو کل کی ہی بات ہے، جب تم خالدہ کو لیکر اُس کی سہیلی کے ہاں گئی تھیں اُس وقت لڑکی کی پھوپی آئی تھی۔ اندر بھائی بہن گھنٹہ بھر باتیں کرتے رہے۔

سعیدہ:۔ (گھبرا کر) کب؟

حشمت:۔ مَیں کہتی ہوں بی بی، کل ہی کی تو بات ہے۔ دوپہر کے وقت۔

سعیدہ:۔ کیا باتیں ہوئیں۔

حشمت:۔ اسلم کے متعلق ہی کہہ رہی تھی۔ بھائی سے پوچھ رہی تھی، لڑکی اللہ رکھے جوان ہو چکی ہے اُس کے متعلق آپ کا کیا ارادہ ہے ---؟

سعیدہ:۔ پھر اُنہوں نے کیا جواب دیا۔

حشمت:۔ لو بی بی۔ اُنہوں نے تو حیلے حوالے کر کے ٹال دیا۔

سعیدہ:۔ (پریشانی سے) آخر کیا کہا تھا۔

حشمت:۔ کہنے لگے خالدہ ابھی بچی ہے۔ اس سال دسویں پاس کرلے تو میرا ارادہ ہے کہ لے۔ خدا جانے کیا کہا تھا بی بی۔ بیا کہ بیتے۔ وہ پاس کرانے کا ارادہ ہے۔

سعیدہ:۔ بی۔ اے! اچھا تو پھر۔

حشمت:۔ کہنے لگے پڑھائی سے فارغ ہولے تو شادی کی فکر بھی کرلیں گے۔ ابھی تو بالکل بچی ہے۔ گھربار کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔

سعیدہ:۔ بچی!!! اس پر تو کبھی بچپن آیا ہی نہیں۔ بڑی پکی لڑکی ہے۔ خدا جانے کس سے اسلم کی بات سُن لی تھی۔ توبہ! لڑکی نے ہفتہ بھر منہ سُجا رکھا تھا۔ پھر میرے سامنے تو صاف صاف کہہ دیا.. "مَیں دیکھوں گی۔ کون میرے متعلق ایسی باتیں کرتا ہے!" خدا جانے باپ سے بھی جا کہا ہو۔ آج کل لڑکیاں شرم و حیا کیا جانیں۔ توبہ!!!۔ (کانوں کو ہاتھ لگاتی ہے)

حشمت:۔ اچھا بی بی یہ نہیں تو کوئی اور رشتہ تلاش کیوں نہیں کر لیتے۔

سعیدہ:۔ کیوں اس کو کیا ہے۔ ایسا رشتہ اور کہاں ملے گا۔ کوئی لُولا لنگڑا نہیں۔ پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ پھر اپنا قریبی عزیز بھی ہے۔ اس سے بہتر کون لڑکا ملے گا.... (آگ تیز کر کے) مجھے کہتے تھے منور سے رشتہ کروا دو۔ میری ہمشیرہ کا بڑا لڑکا منور۔ تم نے تو کئی بار دیکھا ہے۔ اللہ رکھے ایم۔ اے میں پڑھتا ہے۔ وہ تو امیر کبیر لوگ ہیں۔ اس لڑکی کا تو وہاں ایک دن بھی گزارہ نہ ہو گا۔ مَیں یہ کام کروا دوں تو میرے سر پہ ساری عمر عذاب رہے۔

حشمت:۔ نہ بی بی تم کیوں ساری عمر کا جھگڑا مول لو۔ تم کو اس بات میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔ تم چاہے بُرا ہی مانو۔ مگر میں تو تمہارے بھلے کی بات کرونگی۔

سعیدہ:۔ بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ میں کوئی بچی نہیں۔ میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔

حشمت:۔ مگر بی بی خالدہ ــــــ

سعیدہ:۔ (بات کاٹ کر) خالدہ کا کیا ہے۔ اُسے تو کوئی پسند ہی نہیں۔ مگر۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ان کول کی لڑکیوں کا کیا اعتبار۔ دن میں سات گھنٹے گھر سے باہر رہتی ہیں۔ خُدا جانے کیا کرتی ہیں کیا نہیں کرتیں۔ خُدا جانے کس کس کو پسند کرتی پھرتی ہیں۔ آجکل کے زمانے میں تو توبہ ہی بھلی۔ (میں سب جانتی ہوں کے انداز میں) بس حشمت چُپ ہی بھلی۔ اِن آنکھوں سے سب کچھ دیکھتی ہوں مگر خُدا جانے کیوں چُپ ہوں۔

(اُٹھ کر ہنڈیا کے پاس جاتی ہے۔ چولھے میں آگ تیز کرکے پھر کسی خیال سو واپس آکر حشمت کے قریب بیٹھ جاتی ہے۔)

(رازدارانہ انداز میں) مَیں پوچھتی ہوں حشمت، اسلم کی ماں ناراض تو نہیں گئیں۔

حشمت:۔ اس کے متعلق میں کیا کہہ سکتی ہوں بی بی۔ آخر رنج تو ضرور ہوا ہوگا۔

سعیدہ:۔ پھر آنے کے متعلق بھی کچھ کہتی تھیں؟

حشمت:۔ کہتی تھیں آجکل بہت کام ہے۔ لڑکیوں کے کپڑے سی رہی ہوں۔ فرصت نہیں ملتی۔

سعیدہ:۔ خیر ــــ مگر حشمت شاید وہ پھر کہنا پسند کریں یا نہ کریں کہیں ضد میں نہ آجائیں۔

حشمت:۔ نہ بی بی۔ میرے خیال میں تو وہ لوگ ایسے نہیں۔ اور پھر سچی بات تو یہ ہے کہ لڑکی چاہے اچھی ہے یا بُری۔ اس گھر کی لڑکی مل جائے تو وہ اپنی خوش قسمتی سمجھیں گے۔ آخر لڑکی دسویں جماعت میں ہے۔ وہ تو ہزار دفعہ ماتھا رگڑنے کو تیار ہونگے۔ پھر بی بی۔ خود بہن نے ہی بھائی سے کہا ہے، وہ اپنے خاوند سے کب کہنے لگیں کہ بھائی نے جواب دیدیا ہے۔ اسلم کے ابا کو تو اس بات کا علم بھی نہیں ہوگا۔

سعیدہ:۔ کیوں نہ ہو۔ آخر برادری میں سب سے بڑا گھر ہے۔ اور حشمت تم ہی بتاؤ کہ برادری سے باہر کیا اِس لڑکی کا ایک دن بھی گزارہ ہوگا؟

حشمت:۔ یہ تو ٹھیک ہے بی بی۔ میں کیا سمجھتی نہیں۔ میں نے بھی آخر اپنی عمر گزاری ہے ــــ (کچھ سوچکر) مگر بی بی۔ بابو صاحب ایک بار انکار کرچکے ہیں۔ وہ اب اپنی بات سے کیسے بدلیں گے۔ مجھے تو یہ بات بنتی نظر نہیں آتی۔

سعیدہ:۔ (مسکرا کر) اچھا دیکھ تو سہی۔ اس مہینے کے اندر اندر نکاح نہ ہوجائے تو میرا نام بھی سعیدہ نہیں ــــ (موضوع بدلتے ہوئے) اچھا حشمت۔ اب تم توا رکھ دو، شام ہو رہی ہے۔ وہ آتے ہی ہونگے۔ توبہ کتنی گرمی ہے۔ میں تو پسینے میں تر ہو رہی ہوں ــــ میں ذرا مُنہ پر دو چھینٹے دے لوں ــــ (باہر چلی جاتی ہے)

(باہر سے آواز) حشمت۔ بالاخانے سے ذرا آئینہ اور سرمے دانی تو لے آنا۔

حشمت:۔ (ایک پرائیویٹ مُسکراہٹ بھینچکر) اچھا بی بی۔

ــــــ (پردہ) ــــــ

باورچی خانہ ــــ دوسرا سین

(آدھ گھنٹہ بعد۔ اُسی شام کو)

دائیں طرف چٹائی پر سعیدہ کا خاوند بیٹھا ہے۔ بائیں طرف چوکی پر سعیدہ بیٹھی ہے۔ سعیدہ نئے کپڑے پہنے ہوُ اُس کی آنکھیں ہر چند منٹ کے بعد خاوند کی

طرف اُٹھتی ہیں۔ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ہے۔ اور وہ
شوخ آنکھیں خُوب جانتی ہیں کہ اُن میں سُرمے کی
دھار ہے۔ خاوند کھانا کھانے میں مصروف ہے۔ چہرے
پر متانت وقار اور دُنیاداری برستی ہے۔

سعیدہ:۔ کچنار تو آج کل ملتی ہی نہیں۔ آج حشمت کو سبزی منڈی بھیجکر منگوائی ہے بس اب ختم ہونے کو ہے۔ میں نے کہا آپ کو پسند ہے دو ایک دفعہ پکالوں (میاں کو کھانے میں مصروف دیکھکر) کچھ اچھی بھی پکی ہے!۔

میاں:۔ ہوں ـــــ پانی۔

سعیدہ:۔ (پانی کا گلاس دیتے ہوئے) آپنے لڑکی کو خواہ مخواہ نانی کے پاس بھیجدیا۔ دو دن سے گھر سنسان ہو رہا ہے۔

میاں:۔ (چونک کر) ہیں؟

سعیدہ:۔ خالدہ کی بات کر رہی ہوں۔ اُس کے بغیر بڑی بے رونقی ہے۔

میاں:۔ ہاں چھٹیوں کے بعد آجائیگی۔ اُس کی نانی بہت تقاضہ کر رہی تھیں۔

سعیدہ:۔ لڑکی اب اللہ رکھے جوان ہوگئی ہے اس سال دسویں پاس کریگی۔ آپکو اس کا بھی فکر ہے۔

میاں:۔ ابھی بچی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اُسے بی۔ اے کرا دوں۔

سعیدہ:۔ میرا یہ تو مطلب نہیں کہ آج ہی شادی ہوجائے۔ آجکل ذرا زمانہ نازک ہے۔ کسی شریف پڑھے لکھے لڑکے سے نسبت ٹھہرا دیں پھر جب جی چاہے شادی کر دینگے۔ ابھی کیا جلدی ہے۔

میاں:۔ ہوں۔

سعیدہ:۔ دیکھئے نا۔ آج لوگ کسی نیک لڑکے کو ڈھونڈھ کر لڑکی اُسکے ساتھ نامزد کر دیتے ہیں۔ آجکل لڑکے تو ملتے ہی نہیں اور پھر انکو بدلتے کچھ دیر نہیں لگتی۔

میاں:۔ ہاں۔ (پانی پیتا ہے) پھر تمہاری نگاہ میں کوئی لڑکا ہے۔

سعیدہ:۔ (سوچکر) مجھے تو کوئی ایسا لڑکا نظر نہیں آتا۔ وہ صدیق تھا۔ اُس کا تو نکاح ہی ہوچکا اور انور ہے اُس کے والدین نے اُسے بچپن سے ہی منسوب کر دیا تھا۔ اور تو کوئی لڑکا نہیں۔

میاں:۔ تمہارا بھانجہ منوّر جو ہے۔ مجھے وہ لڑکا بہت ہی پسند ہے۔ اب تو ایم۔ اے میں ہوگا۔

سعیدہ:۔ ہاں لڑکا تو ہے۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ چاہے بہن ہی ہے ــــ اُن کے گھر کے طریقے ـــــ بس یہ بات یہیں رہنے دیجئے۔ میرا تو وہاں ایک دن بھی گزارہ نہیں ہو سکتا۔ اسکے علاوہ خالہ کی مدت سے منوّر پر نظر ہے۔ بلکہ حمیدہ کے متعلق تو وہ اندر ہی اندر فیصلہ بھی کر چکے ہیں۔

میاں:۔ (چونک کر) تم ہی نے تو کہا تھا کہ لڑکے کی منگنی نہیں ہوئی۔

سعیدہ:۔ منگنی تو نہیں ہوئی۔ ویسے اندر ہی اندر بات طے ہوچکی ہے۔ میں نے تو کئی دفعہ ذکر کیا ہے۔

میاں:۔ اچھا۔

سعیدہ:۔ آپ سے تو کیا چھپانا۔ اُن کے گھر میں تو ایک سال سے جھگڑا شروع ہے۔ ماں باپ تو اندر ہی اندر گھُل گھُل کر مر رہے ہیں۔ مگر اس لڑکے کے چلن میں فرق نہیں آیا۔ اُس نے کالج کی کسی عیسائی لڑکی کے پیچھے سب عزیزوں کو چھوڑ رکھا ہے۔ بس دن بھر وہیں رہتا ہے رات کے دو دو بجے گھر آتا ہے۔ (آنچل سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں پونچھکر) ہمیں تو خدا نے ہر طرف سے دُکھی کر رکھا ہے۔ بہن کا یہی ایک لڑکا ہے۔ نہ جانے عیسائی ہوجائے یا کہیں چلا جائے۔ (آنکھوں سے آنسو گر پڑتے ہیں۔)

میاں:۔ تم کیوں مُفت میں اپنا دل دُکھاتی ہو۔ جوانی میں لڑکے یوں ہی کیا کرتے ہیں۔ بعد میں خود بخود سدھر جاتے ہیں۔ (پیار سے) تمہارا دل بھی بہت نرم ہے۔

سعیدہ:۔ کچھ نہیں کل اسلم کی ماں آئی تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ کیسا فرمانبردار لڑکا ہے پھر منوّر کا خیال آیا بس اُسی وقت سے دل بھرا ہوا ہے۔

بہن بیچاری اِسی روگ میں سُوکھ کر کانٹا ہو رہی ہے۔ بیچاری نے زیور بیچ بیچ کر کس اُمیدوں پر اُسے پڑھایا تھا۔ اب بیچارے قرض کے بوجھ تلے پھنسے ہوئے ہیں اور بیٹے کے لچھن ہی اور ہیں۔

میاں۔ (تسلی دیتے ہوئے) گھبرانا نہیں چاہیے۔ آج کل لڑکے کالج کی ہوا میں بگڑ جاتے ہیں۔ تم کیوں اپنی جان ہلکان کرتی ہو (کھانا ختم کرتے ہوئے) یہ برتن اُٹھالو اور مجھے حقہ بھر دو۔

سعیدہ۔ (میاں کا ارادہ بھانپ کر) میں یہیں حقہ بھر دیتی ہوں۔ اندر ابھی چیزیں بکھری پڑی ہیں۔ میں اُنہیں ٹھیک کر دوں تو آپ وہاں چلے جائیے گا۔ کمبخت حشمت کو ہزار بار کہا ہے کہ شام سے پہلے ہی کمرہ ٹھیک کر دیا کرے۔

میاں۔ اچھا۔ مجھے آج کچھ کام تھا۔

سعیدہ۔ حشمت۔ یہاں آنا۔

حشمت۔ (باہر سے) آئی بی بی۔

(حشمت داخل ہوتی ہے)

سعیدہ۔ انگیٹھی میں کوئلے رکھکر اندر لے جا۔ اور کمرے کو ٹھیک کر دے۔ تمام چیزیں بکھری پڑی ہیں۔

حشمت۔ بی بی میں نے تو (سعیدہ کے چہرے پر معنی خیز شکنیں دیکھکر رُک جاتی ہے۔)

سعیدہ۔ (بات کاٹ کر) یہ لے چمٹہ۔ وہاں برآمدے میں انگیٹھی رکھی ہے۔ (چل جا اشارے سے کہتی ہے)

(حشمت چلی جاتی ہے۔ اور پھر واپس نہیں لوٹتی۔)

(سعیدہ حقہ بھرتی ہے)

سعیدہ۔ اسلم کی ماں آئی تھی۔

میاں۔ کچھ کہتی تھی!

سعیدہ۔ خالدہ کے متعلق کہہ رہی تھی۔

میاں۔ وہ تو پاگل ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو اُسے صاف کہہ چکا ہوں کہ اس بات کا خیال چھوڑ دے۔ اگر ایسا ہی خیال تھا تو لڑکے کو پڑھایا کیوں نہیں۔ کم از کم بی۔ اے تو کرا دیتے۔ اور۔۔۔

سعیدہ۔ میں نے تو اُسے صاف بتا دیا تھا۔

(حقے پر چلم رکھتی ہے)

میاں۔ (حقے کا کش لیکر) کیا!

سعیدہ۔ کہہ رہی تھی ہم جو غریب ہیں ۔۔۔ میں نے کہا بہن یہ نہ کہو۔ ویسے اس بات کے متعلق تم جانو اور وہ جانیں۔ وہ سمجھدار ہیں۔ خود بہتر سمجھتے ہیں۔

میاں۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے کہ اِس معاملے میں تمہارا دخل دینا ٹھیک نہیں۔

سعیدہ۔ میں نے تو اُسے کہہ دیا تھا۔ میں نے کہا بہن ہم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ تو اُنہیں کا کام ہے۔

میاں۔ پھر۔

سعیدہ۔ میں نے صاف کہدیا۔ میں نے کہا بہن اتنا ضرور کہونگی کہ اُن کے دل میں ایسی اُونچ نیچ نہیں۔ اللہ کا دیا کچھ کم نہیں۔ ساری برادری میں بڑا گھر ہے۔ اللہ رکھے صرف یہی ایک لڑکی ہے۔ وہ اس بات کی پروا نہیں کرتے۔

میاں۔ ہاں بالکل۔ تم جانتی ہو پڑوس میں محمود کی ماں ہے۔ بیچارے کتنے غریب ہیں مگر مجھے آج تک ایسا خیال نہیں آیا۔ اُن کے ہاں آنا جانا ہے۔ وہ سارا سارا دن آکر بیٹھی رہتی ہے مگر میں نے کبھی بُرا نہیں مانا۔

سعیدہ۔ اور پھر اسلم۔ میں نے کہا بہن اسلم کو تو وہ اپنا بیٹا ہی سمجھتے ہیں۔ اور مردوں کے دل میں شاید ایسی باتیں ہوں۔ مگر اُن پر یہ نہیں۔ سچی بات تو یہ ہے۔

میاں۔ (حقے کی نے ایک طرف کرتے ہوئے) پھر کیا بولی۔

سعیدہ۔ میں نے کہا بہن اسلم کی نوکری کا فکر نہ کرو۔ اگر وہ چاہیں تو آج ہی اسلم کو نوکر کرا دیں۔ پھر میں نے کہا بہن تم خود ہی بتاؤ بھلا اُن کا رسوخ کچھ کم ہے۔ ابھی مہینہ ہی ہوا ہے کہ محمود کو نوکر

کروایا تھا۔ فی الحال بیس روپے پر لگا دیا ہے۔ پھر بائیس ہونگے پھر تیئیس! اسی طرح کسی مرتبے پر پہونچ جائیگا۔ وہ تو خیر آٹھ جماعتیں پاس تھا۔ اسلم تو اللہ رکھے دس جماعتیں پاس ہے۔ میں نے کہا بہن تم خود ہی انصاف کرو۔ ان کی سفارش کوئی رد کر سکتا ہے۔ اُن کی بات کوئی توڑتا نہیں۔ بڑے بڑے افسر گھر پہ ملنے آتے ہیں ــــ،

میاں :۔ ہاں بیچارے اچھے ہی ہیں۔ جو کہوں کر دیتے ہیں۔ ابھی کل ہی مسٹر صدیقی کہہ رہے تھے کہ کبھی کوئی کام بتایا کرو۔ وہ ریلوے میں ملے۔ ڈی۔ او ہیں۔ یعنی تمام ریل گاڑیاں جو چلتی ہیں اُن کے افسر ہیں۔ ریلوں کے مالک ہوتے ہیں۔ انہوں نے تو کئی مرتبہ کہا ہے۔ میرا اپنا جی ہی نہیں چاہتا کہ اُن کو کوئی کام بتاؤں۔ محمود کا کام بھی تو انہوں نے زبردستی کر دیا تھا۔ صرف ایک دفعہ سرسری طور پر بات کی تھی کہ ہمارے پڑوس میں ایک غریب لڑکا ہے۔ تم کو تو یاد ہی ہوگا۔ (حقہ پیتا ہے)

سعیدہ :۔ اچھی طرح جانتی ہوں۔ ہر روز تو دیکھتی ہوں۔ اتنے اتنے بڑے افسر ملنے آتے ہیں۔ اکھٹا کھانا پینا ہنسی مذاق۔

میاں :۔ ہاں۔ بیچارے بہت اچھے ہیں۔ اسلم کو نوکر کروانا کونسی بات ہے۔

(سعیدہ الماری میں سے پاندان اُٹھانے کے لئے اس انداز سے جھکتی ہے کہ جسم کا کچھ حصہ خاوند کے جسم سے مس ہوتا ہے۔)

سعیدہ :۔ (پاندان کھولتے ہوئے۔ مسکرا کر) میں نے کہا بہن، ـــــ تم جو چاہے سمجھو مگر میں تو کہونگی کہ میں نے اُن جیسا بھائی کبھی نہیں دیکھا۔ میرے اپنے بھائی ہیں مگر کبھی بھول کر بھی یاد نہیں کرتے۔ پروا ہی نہیں کرتے۔ میں نے کہا بہن تمہارے بھائی کو تو اللہ رکھے ہر گھڑی تمہارا خیال رہتا ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے بس تمہارا ہی دھیان رہتا ہے۔

میاں :۔ ہاں۔ آخر بہن ہے نا۔ (کھانس کر) مگر وہ بیوقوف ضرور ہے۔ پھر کیا کہنے لگی۔

سعیدہ :۔ کہنے لگیں بھائی تو چاہتا ہے مگر اُس بیچارے کا بس نہیں چلتا۔

میاں :۔ (حقہ کا کش لیکر) کیا؟

سعیدہ :۔ یہی۔ میرے متعلق کہتی تھیں۔ اُن کا تو خیال ہے کہ میری وجہ سے آپ خالدہ کا رشتہ اسلم سے کرنا نہیں چاہتے۔ وہ تو کئی دفعہ منہ پر جتا چکی ہیں کہ سعیدہ، خالدہ کی سگائی اپنے رشتے داروں میں کریگی۔ یہ بات تو قدرتی ہے۔ ایمان سے مجھے کوئی شکوہ یا گلہ نہیں۔ خیر

میاں :۔ لاحول ولا۔ کیسا بیہودہ خیال ہے۔

سعیدہ :۔ میں نے تو اُن سے صاف کہہ دیا تھا۔ میں نے کہا بہن۔ مجھے جو چاہے کہو مگر اُن کے متعلق میں کوئی جھوٹا الزام نہیں سُنونگی۔

میاں :۔ کیا!

سعیدہ :۔ میں نے کہا بہن وہ کوئی زن مُرید نہیں ہیں۔ ایسی باتوں میں وہ مجھ سے صلاح نہیں پوچھتے۔ اُن کی ایسی عادت ہی نہیں ہے ــــ،

میاں :۔ ہاں۔ میری یہ عادت نہیں۔ خُدا جانے لوگ کس طرح عورتوں کی باتوں میں آکر اپنے آپکو بیوقوف بناتے ہیں۔

سعیدہ :۔ (مُسکرا کر) میرا کیا جاتی نہیں۔ بہن سمجھتی ہیں کہ جیسے ان کا خاوند ہے ویسے ہی دُنیا بھر کے مرد ہیں۔ مگر ایمانداری کی بات ہے کہ آپ میں ایسی بات قطعی نہیں۔

میاں :۔ تمہارے متعلق انکے وہم بالکل غلط ہیں۔ بلکہ تم تو مجھے ہمیشہ اُن سے میل جول کی ترغیب دیتی ہو۔

سعیدہ :۔ اُن سے نہ ملیں تو کس سے ملیں۔ آپ خود ہی بتایئے اُن سے زیادہ عزیز ہمارا کون ہے۔ ویسے میں ایسی بڑی باتوں

میں دخل نہیں دیتی۔ آپ خود مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں میں آپ کو کس طرح مشورہ دوں۔

میاں:۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ وہ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتی۔ تم اس سے زیادہ سمجھدار ہو۔

سعیدہ:۔ میری بات رہنے دیجئے۔ میں نے بھی انہیں لاجواب کر دیا تھا۔ میں نے کہا بہن بھلا خالدہ کے لئے تم سے بہتر ساس کون ہوگی۔ ویسے تو انہیں ہزاروں رشتے ملتے ہیں۔ انکے دوست بھلا کوئی چھوٹے موٹے آدمی ہیں۔ ڈپٹی صاحب تو عرصے تک اُن سی باتوں ہی باتوں میں رشتے کیلئے کہتے رہے۔ لڑکا ولایت پاس ہے۔ آخر اُن کو اپنے عزیزوں کا خیال تھا جو آج تک خالدہ کو منسوب ——

میاں:۔ (بات کاٹ کر) ہاں وہ تو اب بھی تیار ہیں۔

سعیدہ:۔ (فاتحانہ انداز میں۔ اپیل بھری مسکراہٹ سے) میں نے تو انہیں اچھی طرح بتا دیا تھا۔ میں نے کہا خالہ سچ کہنا۔ آجتک تم نے اُن سے ذکر بھی کیا ہے۔ مجھے ہی کہتی ہو نہ۔ میں بھلا ایسی باتیں اُن سے کس طرح کہہ سکتی ہوں۔ میری تو اتنی جرأت نہیں۔ (شرما کر آنکھیں نیچے کرتے ہوئے) تم ہو بہن۔ تم خود اُن سے کہو۔ تمہاری بات وہ کیوں رد کرنے لگے۔

میاں:۔ ہاں۔ ویسے سرسری طور پر اس نے ذکر کیا تھا۔

سعیدہ:۔ آپنے کوئی جواب دے دیا ہے۔ یہی کہا ہوگا نہ کہ لڑکی تعلیم سے فارغ ہو لے۔

میاں:۔ ہاں ہاں۔ بالکل۔ اچھا پھر وہ کیا کہنے لگی۔

سعیدہ:۔ انہوں نے کیا کہا تھا۔ میں نے ہی کہا۔ میں نے کہا بہن تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا وہ لڑکی کو اس لئے پڑھا رہے ہیں کہ اُس سے نوکری کروائیں۔ توبہ کرو بہن۔ وہ تو پڑھی لکھی اُستانی لڑکی کے لئے نوکر رکھ سکتے ہیں۔ وہ بھلا خالدہ سے نوکری کیوں کروانے لگے۔

میاں:۔ ہمارا تو ایسا ۔۔۔۔ ارادہ نہیں۔ اللہ نے کھانے پینے کو دیا ہے۔ اور ——

سعیدہ:۔ (بات کاٹ کر) یہی تو میں نے کہا تھا۔ میں نے کہا۔ اُن کا مطلب تو یہ ہے کہ لڑکی پڑھ جائے تو اچھی بیوی بنیگی۔ آپ کی بہتری ہی تو ہے۔ پڑھی لکھی بہو ہوگی۔ اور ماشاء اللہ وہ تو پہلے ہی ایسی اچھی لڑکی ہے۔ کیوں نہو، وہ خود اسکی پڑھائی اور تربیت کا خیال رکھتے ہیں۔

میاں:۔ (سوچ کر) ہاں یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ پھر کیا کہنے لگی۔

سعیدہ:۔ بس چُپ ہوگئیں۔ کہتی تھیں آخر مجھے بھی تو اپنے بھائی سے اُمیدیں ہیں۔ مجھے بھی تو بھائی پر ناز ہے۔ انہی کے بھروسے تو زندہ ہوں۔ پھر وہ رونے لگیں۔

میاں:۔ (متاثر ہوکر) پاگل ہے۔

سعیدہ:۔ آپ بُرا نہ مانیں تو میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔

میاں:۔ کیا۔

سعیدہ:۔ آپکی اجازت تو نہیں لی تھی۔

میاں:۔ آخر بات کیا ہے۔

سعیدہ:۔ میں ابھی لاتی ہوں۔

(باہر چلی جاتی ہے)

(میاں اس دوران میں خاموشی سے بیٹھے رہتے ہیں۔ ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہے۔ چند منٹ کے بعد سعیدہ ہاتھ میں ریشم کا تھان لئے لوٹتی ہے۔)

میاں:۔ (تھان دیکھکر۔ ہلکا سا غصہ محسوس کرتے ہوئے) کب خریدا ہے۔ یہ تو بہت قیمتی ہے۔

(سعیدہ میاں کے پاس بیٹھ جاتی ہے اور اس انداز سے بیٹھتی ہے کہ میاں اُس کے بالوں کی خوشبو کو محسوس کرتے۔ سامنے تھان پھیلا دیتی ہے)

سعیدہ:۔ (پیار سے) جانتے ہو یہ کس کا ہے۔

میاں:۔ کس کا؟

سعیدہ:۔ یہ میں نے خالدہ کے کپڑوں کیلئے خریدا ہے۔ آخر آج سے ہی شروع کرونگی تو اُس کا سامان پورا ہوگا۔

میاں:۔ (خوش ہوکر) اتنی بھی کیا جلدی تھی۔ خیر جیسے تمہاری مرضی ۔۔

سعیدہ:۔ میرا ارادہ ہے کہ اس مہینے اُس کا جہیز تیار کر رکھوں پھر جب شادی ہوگی کام آئے گا۔ لڑکی یہاں نہیں ہے تو میں سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی ہوں۔ میں نے کہا، چلو کسی کام میں مصروف رہوں گی تو دن کٹ جائیگا۔

میاں:۔ اچھا۔ جیسے تمہاری خوشی ۔۔۔۔۔ (سوچ کر) میں کہتا ہوں سعیدہ۔ تم پھر اسلم کی ماں کو بلا لینا۔ اور اُس سے کہہ دینا۔

سعیدہ:۔ (خوشی دباتے ہوئے۔ بناوٹی انداز سے) کیا۔

میاں:۔ میرا مطلب ہے۔ تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ لڑکی کو فی الحال منسوب کردو۔ پھر جب جی چاہے شادی کر دینگے۔ اگر اسلم اس قابل نہوا تو پھر منگنی چھڑوانے میں کیا دیر لگتی ہے۔

سعیدہ:۔ اگر آپ کا ایسا ارادہ ہے تو آپ خود ہی انہیں بلاکر کہدیں۔ میرے خیال میں تو ابھی کیا جلدی ہے۔ ویسے آپ بہتر جانتے ہیں۔

میاں:۔ بس تم سے جو کہا ہے، تم بلاکر کہدینا۔

سعیدہ:۔ مَیں بھلا انکار کر سکتی ہوں۔ مگر بہتر تھا کہ آپ خود کہہ دیتے ۔۔۔ ہاں اور اگر آپنے اسلم کو نوکر کروا دیا تو پھر شاید وہ فوراً نکاح کیلئے زور دیں۔

میاں:۔ اُس کی نوکری کیلئے تو میں آج ہی خاں صاحب سے کہہ دونگا نوکری مل گئی تو ہمیں کیا عذر ہوسکتا ہے۔ آخر لڑکی کو عمر بھر بٹھا تو رکھنا نہیں۔ بی۔ اے بھی کوئی ضروری نہیں۔ ہمیں کوئی اُس سے نوکری تو کروانی نہیں۔

سعیدہ:۔ آپ کی مرضی۔ مَیں ایسی خوشی میں بھلا کیوں عذر کرونگی۔ مگر آپ خود ہی انہیں بلاکر بات کر دیتے تو ۔۔۔۔ ویسے آپ مالک ہیں۔

میاں:۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بات تمہارے ہی ذریعے ہو۔ انکو تمہارے متعلق غلط فہمی نہ رہے۔

سعیدہ:۔ مگر ۔۔۔

میاں:۔ (بات کاٹ کر) تم ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔ تم سے کہہ جو رہا ہوں ۔۔۔

سعیدہ:۔ بہت اچھا۔ مگر آپ ۔۔۔

میاں:۔ بس سعیدہ تم ہی کہو گی۔

سعیدہ:۔ مَیں کہتی ہوں ۔۔۔

میاں:۔ (بات کاٹ کر) میری مرضی۔ بس۔

سعیدہ:۔ اچھا جیسے آپکی مرضی۔

(پردہ)

"ممتاز مفتی"

محبّت ۔۔۔ اور ۔۔۔ نفرت

تہدیہ محبت — نفرت کے نام

اُردو کے سب سے جدت طراز ادیب اختر حسین رائے پوری کے سولہ رومانوں اور افسانوں کا مجموعہ جس میں دکھایا گیا ہے کہ محبت، ایک کانٹا ہی چبھنے کے لئے اور نفرت، ایک پھول ہے سونگھنے کیلئے۔ قیمت عہ؍ ملنے کا پتہ:۔ ساقی بکڈپو۔ دہلی۔

عورت کا انتقام

کل رات ایک دوست مجھے لے گیا وہاں
لیتا ہے ہچکیاں جہاں تہذیب کا دیا
اِک صاحبِ جمال و شبابِ منظر فریب
ہونٹوں کو سُرخ، سینے کو عُریاں کئے ہوئے
میں نے جگر کو تھام کر اُس سے کیا سوال
اس زندگی کو دیکھ اور اپنا شباب دیکھ
عصمت وہ جس پہ فطرتِ مشرق کو ہے غرور
صد حیف تیرے ہاتھ سے بے آبرو ہوئی
سُن کر وہ آئی جوش میں پھر سوچکر کہا
بازار میں نہیں ہے یہ کہنے کی داستاں
ہم دیکھکر اِدھر اُدھر اندر چلے گئے
کہنے لگی وہ آنکھ میں آنسو لئے ہوئے
میں بھی کبھی کسی کی شرافت کا راز تھی
تھا مجھکو اپنے گھر میں میسّر کبھی وقار
لیکن مرے شباب نے دھوکا دیا مجھے
وہ نوجواں کہ یوسفِ ثانی کہیں جسے
مُدّت سے میرے گھر کے مقابل تھا وہ مقیم
چلمن اُٹھا کے میں جو ہوئی ایک دن کھڑی
میرے جگر میں درد کا احساس سا ہوا
اِتنی بڑھی کہ راکھ ہوئی سارے گھر کی آن
اِک دوپہر کو صحن میں مَیں خانماں خراب
چھوٹا سا ایک بچہ جو سہما ہوا سا تھا
دیکھا جو میں نے کھول کے دل تھر تھرا اُٹھا
لکھا تھا آج رات نہ آؤگی تم اگر
عصمت سی چیز بیچتی ہیں عورتیں جہاں
غیرت کا جس جگہ سے گذر تک نہیں ہوا
آنکھیں تھیں جس کی ہوش رُبا رہزنِ شکیب
بیٹھی تھی سارے گھر کو فروزاں کئے ہوئے
اے رشکِ حور، غیرتِ زہرہ، پری جمال
ظلمت کا تجھ پہ سایہ فگن ہے سحاب دیکھ
عصمت وہ جس کی ضَو سے ہے روشن چراغِ طُور
سیتا کو جس سے شُہرتِ جاوید ہے ملی
اے ہوشمند مرد! مرے گھر میں آ ذرا
اِس داستاں میں آنسوؤں کی نہر ہے رواں
کوئی حریف تاک نہ لے ہمیں دیکھ لے
چہرے کو وقفِ حسرت و ارماں کئے ہوئے
میری نظر بھی عفّت و عصمت نواز تھی
مجھ سے بھی میرے باپ کی عزّت تھی برقرار
اِک بیوفا جوان پہ مائل کیا مجھے
آنکھوں کی مستیوں کی جوانی کہیں جسے
خالق اُسے نصیب کرے شُعلۂ جحیم
اُس بیوفا سے آنکھ مری یک بیک لڑی
سینے میں میرے آگ سی ہوتی گئی سوا
اب میرا سر ہے اور ہے بے غیرتی کی ران
بیٹھی ہوئی تھی رُخ سے اُٹھاتے ہوئے نقاب
چُپکے سے میرے ہاتھ میں خط لا کے دے گیا
آنکھوں میں میری کروٹیں لینے لگی حیا
تا عُمر میں تمہیں نہ کہیں آ ؤں گا نظر

اب جنگ شرم اور محبت میں چھڑ گئی
اس کشمکش کو دیکھ کے شب بھی اُدھر بڑھی

آخر کو محوِ خواب ہوئیں گھر کی شورشیں
میں نے چھپایا خود کو ردائے سیاہ میں

چپکے سے اُس کے گھر کی طرف ہوگئی رواں
اس کا مآل تھا مرے دل پر بہت گراں

اُس شب کے بعد پھر نہ وہ لیکن نظر پڑا
ٹیکا کلنک کا مجھے ظالم لگا گیا

وہ رات جس پہ صبح کا دھوکا ہوا مجھے
وہ رات جس نے دہر میں رسوا کیا مجھے

وہ رات کرگئی جو مری زندگی تباہ
وہ رات جس میں چادرِ عصمت ہوئی سیاہ

لغزش مرے شباب کی ہونے لگی عیاں
رسوائیوں کو مل گئی میرے لئے زباں

ہر اک نظر میں ہوگئی جب میں ذلیل و خوار
چپکے سے میں نے زیورِ عصمت دیا اُتار

اک رات گھر سے بھاگ کے اس جا کیا قیام
اُس بیوفا سے لے سکوں میں تاکہ انتقام

شہرت مرے شباب کی سن سن کے نوجوان
دیوانہ وار آنے لگے روز و شب یہاں

اک نوجوان مجھ پہ ہوا اس طرح فدا
تن من کو اور دھن کو لُٹانے پہ تل گیا

میں نے کہا کہ ہے جو تجھے میری آرزو
اک شرط پیش کرتی ہوں میں تیرے رُوبرو

یہ شرط پوری کرکے تو آئے گا جس گھڑی
پائے گا مجھ کو راہ میں تو منتظر کھڑی

اک نوجوان خوشاب[1] میں ہے اِن دنوں مقیم
نام اُس کا ہے فہیم مگر ہے بڑا لئیم

جس طرح ہو سکے اُسے اک بار کھینچ لا
پھر شوق سے تو گوہرِ مقصود اپنا پا

آخر کو کھینچ لایا وہ اک دن مرے یہاں
دیکھا مجھے تو عشق کا دل سے اٹھا دھواں

وہ پھر شرابِ حسن سے مدہوش ہوگیا
بے غیرتی کی گود میں سر رکھ کے سوگیا

اب میں نے اس طرح اُسے پایا جو پھر فدا
ٹھکرایا اس کو پائے حقارت سے برملا

ہر اک نظر سے اسکو گرا کر میں خوش ہوئی
خاکِ سیہ میں اُس کو ملا کر میں خوش ہوئی

لیکن اب اُس کی آتشِ الفت بڑھی کچھ اور
تھوڑے دنوں میں ہوگئے کچھ اور اُسکے طور

جو کچھ تھا پاس راہ میں میری لُٹا دیا
پھر ایک دن وہ ایک طوائف کے ہاں گیا

رو کر سنائی اُس کو محبت کی داستاں
اور اُس کے آگے حالِ دل اپنا کیا بیاں

کھا کر ترس گلاب نے نوکر تو رکھ لیا
لیکن وہ اُس کا کام کچھ اچھا نہ کر سکا

آخر وہ بھیک مانگتا کل مر گیا ہے یاں
تشہیر میرے حسن کی یوں کر گیا ہے یاں

اَب تک ہے میرے دل میں مگر سوزِ انتقام
ہوجائے کاش دہر کا زیر و زبر نظام

الطاف مشہدی

---

[1] ضلع سرگودھا میں ایک قصبہ ہے۔

ناگن

مہینے میں ایک آدھ مبارک دن، ایسا ہوتا ہے جب بلا ارادہ صبح سویرے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اور جب کبھی بھی ایسا سانحہ درپیش آتا ہے تو بندہ سیر کو ضرور جاتا ہے۔ ٹانگوں کو زیادہ تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔ رانی کا باغ مکان کے برابر ہی ہے۔ سیدھا وہاں پہونچ جاتا ہوں۔ باغ پر بہار ہوتی ہے۔ مالی پھولوں کو پانی دیتے ہوتے ہیں۔ تالاب میں مرغابیاں کنول کے پھولوں کے درمیان تیرتی ہوتی ہیں۔ کوئل کی کوک کے ساتھ شیر کے دھاڑنے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ بندروں کے پنجرے کے سامنے بعض لوگ کھڑے ہوئے اپنے آباؤ اجداد کو یاد کرتے ہوتے ہیں۔ رانی کے باغ میں بھانت بھانت کے جانور اور انسان ملتے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتی ہیں۔ لیکن وہاں میں نے آج تک کسی کو اقبال مرحوم کے اشعار گاتے ہوئے کبھی نہ سنا تھا اس صبح کو جب میرے کان میں آواز آئی۔

میں جو روئے قبلہ ہوا کھڑا تو حرم سے آنے لگی صدا

تو مجھکو پہلے تو تعجب ہوا اور پھر غصہ آیا کہ یہ شخص آخر کیوں شعر کو غلط پڑھکر مرحوم شاعر کی روح کو تکلیف دے رہا ہے۔ آواز کی سمت گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ باغ کے ایک کونے میں ایک شخص تنہا بنچ پر بیٹھا مزے لے لے کر یہی مصرع دہرا رہا ہے۔

میں جو روئے قبلہ ہوا کھڑا تو حرم سے آنے لگی صدا

گانے والے کی وضع قطع کافی دلچسپ تھی۔ حسین تو نہیں مگر بدصورت بھی نہ تھا۔ عمر کوئی تیس برس کی ہوگی۔ ڈاڑھی مونچھ منڈی ہوئی۔ دوہرا بدن، صحت بہت اچھی اور چہرے پر خون کی سرخی جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ابھی بمبئی میں ایرانی ہوٹلوں کا کھانا کھانے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا۔ میں نے ایک افسانہ نگار کی متجسس نگاہ اس پر ڈالی اور دماغ میں اس کا پورا حلیہ محفوظ کر لیا۔ شکل صورت کے مطالعہ کے بعد اس کے لباس پر نظر کی تو دیکھا کہ ایک قیمتی کپڑے کے سوٹ میں ملبوس ہے۔ مگر کوٹ اور پتلون کی ساخت صاف بتا رہی تھی کہ گاؤں نہیں تو کسی قصبے کے درزی کے ہاتھ کی سلائی ہے۔ باوجود سخت گرمی ہونیکے واسکٹ بھی زیب تن تھی جس کی جیب میں سے ایک چاندی کی موٹی گھڑی کی زنجیر نمودار تھی۔ سر پر ذرا پرانی وضع کا ہیٹ تھا اور قریب ہی چھڑی، چھتری اور برساتی رکھی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ حفظ ماتقدم کے خیال سے یہ سب سامان ساتھ لیا گیا تھا۔ ابھی میں دل میں یہ فیصلہ کر ہی رہا تھا کہ یہ شخص یو۔ پی یا پنجاب کے کسی چھوٹے سے قصبے کا رئیس ہے جو بمبئی کی سیر کو آیا ہے کہ ان حضرت نے پھر۔

میں جو روئے قبلہ ہوا کھڑا تو حرم سے آنے لگی صدا

کا نعرہ لگانا شروع کر دیا۔ اب تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بنچ پر جا کر بیٹھ گیا اور جیسے ہی وہ سانس لینے کیلئے رکا کہ میں نے "معاف کیجئے" کہکر دخل در معقولات شروع کر دیا۔

"معاف کیجئے۔ مگر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ آپ یہ مصرع غلط پڑھ رہے ہیں۔ اصل میں اقبال مرحوم نے لکھا تھا کہ کبھی قبلہ رو جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا"

میں سمجھتا تھا کہ یہ شخص مجھکو ڈانٹ دیگا کہ تم کون ہو اعتراض کرنے والے۔ مگر اس نے ملائمت سے جواب دیا "شکریہ۔ مگر مجھے تو اسی طرح یاد ہے"۔ اور پھر مسکرا کر "آپکے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں غلط مصرع پڑھ رہا ہوں"

"میرا مکان قریب ہی ہے۔ آپ وہاں چلئے تو میں آپ کو

"بانگِ درا" میں دکھا سکتا ہوں۔"

اُمید کے خلاف وہ فوراً میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔

راستے میں باتیں کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ اُردو اور انگریزی ادب سے بخوبی واقف تھا۔ میں نے پوچھا "آپ نے کہاں تعلیم پائی ہے؟" تو اس نے بلاتکلف جواب دیا "واقعہ یہ ہے کہ میں نے کسی کالج یا یونیورسٹی میں نہیں پڑھا۔ میری والدہ مجھے دور بھیجتے ہوئے گھبراتی تھیں۔ انہوں نے گھر پر اُستاد رکھکر مجھے ملیح آباد ہی میں تعلیم دلوائی۔" اور پھر طفلانہ سادگی کے ساتھ "آپ نے ملیح آباد کا نام تو سنا ہوگا؟ وہاں کے سفیدہ آم مشہور ہیں۔"

میں نے کہا "بدقسمت ہے وہ شخص جس نے ملیح آباد کے سفیدہ آم نہیں کھائے۔ اور میں تو خود کو خوش قسمت لوگوں میں شمار کرتا ہوں۔"

"اے حضرت آپ میرے باغ کے سفیدی آم کھائیں تو سفیدے کو بھول جائیں۔ تمام ہندوستان میں صرف میں نے سفیدے میں فجری کی قلم لگا کر سفیدی آم نکالے ہیں۔ اگر ممکن ہوا تو میں آپ کو اگلی فصل میں دو چار ٹوکرے بھیجوں گا۔ پھر آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ سفیدی میں آپ کو فجری کی خوشبو اور نزاکت اور سفیدے کا مزا ملیگا۔"

اسکی باتوں میں عجیب بے تکلفی اور بھولا پن تھا۔ بمبئی جیسے تجارتی شہر میں جہاں ہر شخص چاپلوسی سے دوسروں کا روپیہ اینٹھنا جانتا ہو ایسے آدمی کم ملتے ہیں۔"

"تو آپ آموں کی کاشت کرتے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"جی ہاں۔ جب سے زرعی پیداوار کی قیمتیں اتنی گھٹ گئی ہیں۔ کھیتی میں کوئی منافع نہیں رہا۔ ہاں دو چار آموں کے باغ ہیں جن سے کچھ گزارے کی صورت ہو جاتی ہے۔"

یہی باتیں کرتے ہوئے ہم مکان پہونچ گئے۔ میں نے اپنے مُلازم سے چائے بنانے کو کہا اور کتابوں کی الماری میں سے "بانگِ درا" نکال کر اپنے دعوے کی تصدیق کر دی کہ اصل مصرعہ "کبھی قبلہ رُو جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا" ہے۔ یہ دیکھکر وہ کھسیانا سا ہو گیا اور کہنے لگا "معاف کیجئے گا۔ میری جہالت کی وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف ہوئی۔"

میں نے موضوع بدلنے کے لئے دوسری باتیں شروع کر دیں۔ چائے آنے پر ہم دونوں آرام سے بیٹھکر گفتگو کرنے لگے۔

وہ اس قدر صاف گو واقع ہوا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں مجھے اس کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں۔ اس کا نام شکور تھا۔ والد کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ گھر کی جائداد کافی تھی اس لئے معاش کی فکر نہ تھی۔ خاندان میں دو ہی فرد تھے۔ وہ اور اُسکی والدہ جن کو بیٹے سے اس قدر محبت تھی کہ آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھیں۔ اس لئے سکول یا کالج میں بھی پڑھنے نہ بھیجا بلکہ گاؤں ہی میں گھر پر اُستاد رکھکر بیٹے کو مکمل تعلیم دلائی۔ یہی وجہ تھی کہ گو شکور کا مطالعہ وسیع تھا اور عام واقفیت بھی کافی تھی مگر اس پر وہ ظاہری رنگ و روغن نہ تھا جو کالج میں چڑھتا ہے۔ پہلی دفعہ اُس کی والدہ نے اتنے لمبے سفر کی اجازت دی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ بمبئی جیسے مصروف اور تیز رو شہر میں آ کر کچھ گھبرا سا گیا تھا۔

"آپ کی کتابیں دیکھ سکتا ہوں؟" اُس نے پوچھا اور الماریوں کے قریب جاکر غور سے کتابوں کے نام پڑھنے شروع کر دئے۔ ایک الماری کے اُوپر کے خانے میں میرا نیا ناول "ناگن" بھی رکھا تھا۔ اس نے جلد وہاں سے نکالکر کہا "خوب ناول ہے۔ کیا آپ کو بھی پسند ہے؟"

"کوئی خاص خوبی تو مجھے نہیں نظر آئی" میں نے تکلفاً کہا۔

"تو میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپکو کیوں نہیں پسند آیا؟"

"اسلئے کہ یہ خود میرا لکھا ہوا ہے"

یہ سُنکر اُس نے از حد مسرت کا اظہار کیا" اخاہ تو تسلیم صحافی کے نام سے آپ ہی ناول اور کہانیاں لکھتے ہیں۔ آپ سے ملنے کا تو بڑا اشتیاق تھا"

سوال کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ہر ماہ مختلف کتب فروشوں سے تمام نئی مطبوعات رسائل وغیرہ منگوا کر پڑھتا رہتا تھا۔ ادبی رسائل وغیرہ میں "ناگن" کا کافی چرچا رہا تھا اور پہلے ہی سال ہاتھوں ہاتھ دو ایڈیشن فروخت ہو چکے تھے۔ اسلئے کوئی تعجب نہ تھا کہ اسکے پاس بھی یہ ناول پہونچ گیا تھا۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا گویا کوئی سوال کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ پھر بولا "آپ سے اس ناول کے متعلق ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟"

"شوق سے" میں نے یقین دلایا۔

"کیا یہ واقعہ نہیں کہ اس میں آپنے ناگن یا اوشارانی کا کیریکٹر جو پیش کیا وہ ہندوستان ٹاکیز کی سٹار زرینہ کو پیشِ نظر رکھکر لکھا ہے"

مجھے اقرار کرنا پڑا۔ دراصل "ناگن" چربہ تھا زرینہ کی زندگی کا۔ جس میں مَیں نے ایک کامیاب اور چالاک فلم ایکٹرس کے کردار کو پیش کیا تھا۔ زرینہ اُن عورتوں میں سے تھی جن کی زندگی کا مقصد ایک ناگن کی طرح اپنے حسن سے لوگوں کو فریفتہ کرکے ان کو ڈسنا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں وہ سچی محبت کرنے کی صلاحیت ہی نہ رکھتی تھی۔ مگر وہ حسین تھی۔ از حد حسین۔ وہ دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا گُر جانتی تھی۔ پروانوں کی طرح لوگ اس کے گرد رہتے تھے لیکن اُس نے کبھی کسی سے محبت نہ کی تھی۔ مگر پھر بھی اُس کے عشاق کی بھیڑ کبھی کم نہ ہوتی تھی۔ جو اس کے جال میں ایک دفعہ پھنس گیا وہ کبھی نہ نکل سکا۔ اِس ناگن کے کاٹے کا کوئی منتر ہی نہ تھا۔ یہی سب میں نے اپنے ناول میں لکھا اور میرے دوستوں کی رائے تھی کہ وہ ایک کامیاب قلمی تصویر تھی جس میں زرینہ کے تمام خد و خال نمایاں تھے۔ کمال تو یہ تھا کہ خود زرینہ کو اس کا اقرار تھا۔ جس دن "ناگن" شائع ہوکر پہلی بار بازار میں آئی اُس سے اگلے ہی دن اُس نے مجھے ٹیلیفون کیا تھا "آپ کے ناول پر مبارکباد دیتی ہوں۔ مگر ایک چھوٹی سی غلطی آپنے کی ہے۔ میرا پسندیدہ رنگ فیروزی نہیں بلکہ آسمانی ہے" میرا خیال تھا کہ میرا ناول پڑھکر وہ از حد خفا ہوگی۔ ہر شخص سے میری شکایت کریگی۔ ممکن ہے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ لیکن مذاقِ سلیم کے اس اظہار سے مجھے سخت تعجب ہوا۔

"تو آپ مس زرینہ کو ذاتی طور پر جانتے بھی ہونگے؟" ٹشکور نے پوچھا۔

"جی ہاں" میں نے کہا" اخبار نویس اور فلمی ناقد کی حیثیت سے اکثر فلمی ستاروں سے ملنا ہوتا ہے۔ زرینہ میں ورحقیقت بُرائیاں ہوں ملنے جلنے میں وہ بہت با اخلاق اور ملنسار واقع ہوئی ہے"

"آپ دل میں سوچیں گے کہ یہ شخص میرے اخلاق سے فائدہ اُٹھا رہا ہے لیکن کیا آپ مس زرینہ سے میرا تعارف کرا سکتے ہیں؟"

میں نے جواب دینے سے پہلے کچھ توقف کیا۔

فلمی حسینوں کا عشق شمالی ہند کے بہت سے نوجوانوں کو بمبئی کھینچ لاتا ہے اور ان میں سے اکثر حضرات مجھ سے فرمائش کرتے رہتے تھے کہ اُن کی ملاقات کسی فلم سٹار سے کرا دوں۔ مگر میں نے اس قسم کی ذمہ داری سے ہمیشہ پہلوتہی اختیار کی تھی ٹشکور اتنا سیدھا اور شریف آدمی معلوم ہوتا تھا کہ اسکو بیوقوف بنانا زرینہ کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ میں نے سوچا کہ اس خطرے سے اس کو آگاہ کر دوں۔

"دیکھئے۔ آپ شاید ان فلم سٹار عورتوں سے واقف نہیں ہیں۔ ان سے دُور رہنا ہی بہتر ہے۔ خصوصاً آپ جیسے شریف آدمی کے لئے۔۔۔"

میں نے جملہ ختم نہ کیا تھا کہ وہ ہنسنے لگا۔ بچوں کی طرح کھلکھلا کر۔ "آپ ڈریئے مت۔ میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں جتنا شاید آپ مجھے سمجھتے ہیں۔"

اب تو میرے لئے کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے وعدہ کر لیا کہ آئندہ اتوار کو جب زرینہ کے نئے فلم "پریم پجارن" کا افتتاح ہوگا تو میں شکور کو ساتھ لے جاؤنگا اور موقع ملنے پر اس کا تعارف کرادونگا۔

(۳)

بمبئی کی فلمی اور صحافی زندگی میں کسی اچھے فلم کا افتتاح ایک دلچسپ موقع پر ہوتا ہے۔ سٹوڈیو کے مالک سیٹھ صاحب پھولے نہیں سماتے۔ گھڑی گھڑی ٹکٹ گھر کی طرف جاتے ہیں یہ دیکھنے کے لئے کہ "ٹکٹ ختم ہو گئے" کا بورڈ ابھی لگا ہے یا نہیں۔ فلم کے ہیرو صاحب سر میں معمول سے زیادہ تیل ڈالکر، ایک نیا شوخ رنگ کا سوٹ اور "چیختے" ہوئے رنگ کی ٹائی زیب تن کئے ہوئے اور ہالی وڈ کے کسی فلم سٹار کی وضع کی مونچھیں بنائے ہوئے بڑی شان سے ٹہل رہے ہیں کہ تماشائیوں کو ایک دوسرے سے یہ کہنے کا موقع ملے کہ "وہ دیکھو ماسٹر ـــــ کو۔ اس فلم کا ہیرو یہی ہے۔ یار کتنا خوش قسمت انسان ہے زرینہ کے ساتھ ایکٹ کرتا ہے۔"

فلمی خواتین بھی آج بہترین لباس میں موجود ہیں۔ لطف یہ ہے کہ جن ایکٹرسوں نے فلم میں نہایت معمولی کردار کیا ہے وہ سب سے بھڑکدار ساڑھی پہنے ہیں۔ چہرے پر پاؤڈر اور سُرخی لگائے ہیں تاکہ شاید کسی کو یہ دھوکا ہو جائے کہ ہیروئن یہی ہیں۔ ان بھڑکدار رنگین تتلیوں کے ردِ عمل کے لئے اخبار نویس اور تنقید نگار بھی موجود ہیں۔ لباس کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ بیچارے شکل سے فاقہ زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر چھوٹے موٹے رسالوں کے اڈیٹر سٹوڈیو کے مالک صاحب کی دربار داری کر رہے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ خوشامد سے اشتہار حاصل کر لیں گے۔

زرینہ حسب معمول ہلکے فیروزی رنگ کی معمولی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ یہ اُس کی چالاکی تھی کہ ہمیشہ سادہ لباس پہنتی تاکہ لوگوں پر اپنی معصومیت کا سکہ جما سکے۔ اس کے گرد ہمیشہ کی طرح پروانوں کا جمگھٹ تھا۔ ایکٹر، اخبار نویس، نوجوان تاجر، رئیسوں کے لڑکے سب اُس کے دربار میں موجود تھے۔ میں اور شکور ایک کونے میں کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ زرینہ نے دُور سے دیکھا اور ہماری طرف خود بڑھی۔ میں نے اس کو "پریم پجارن" کی تکمیل پر مبارکباد دی اور یہ موقع مناسب دیکھکر فوراً شکور کا تعارف کرادیا۔ "یہ میرے دوست عبداشکور ہیں۔ آپ ملیح آباد کے رہنے والے ہیں اور ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔"

"اچھا آپ ملیح آباد کے رہنے والے ہیں جہاں کے آم مشہور ہیں۔ بڑے خوش قسمت ہیں آپ۔ مگر یہ تو بتایئے کہ۔۔۔۔۔"

اتنے عرصے میں کسی دوست نے مجھے اشارہ کیا تو میں اُدھر چلا گیا۔ اُس سے باتیں کر کے لوٹا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے شکور اور زرینہ کو بدستور آموں کے متعلق گفتگو میں مصروف پایا۔ وہ کہہ رہی تھی "سچ پوچھئے تو جو شخص آم کی قدر نہیں کر سکتا وہ ہندوستانی کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ ہمارا قومی پھل ہی تو آم ہی ہے۔"

اتنے میں تماشہ شروع ہونے کی گھنٹی بجی اور سب لوگ سنیما ہال کی طرف بڑھے۔ زرینہ نے شکور کو اپنے ہمراہ بیٹھنے کی دعوت دی جس پر بہت سی حاسدانہ نظروں نے اسکو گھور کر دیکھا۔ مجھکو تعجب تو ضرور ہوا مگر میں سمجھ گیا کہ یہ معلوم کر کے کہ

شکور گھر کا رئیس ہی زرینہ اسکو بیوقوف بنا رہی ہے۔ میں اُن سے اگلی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔

روشنیاں گُل ہوگئیں۔ پردہ پر زرینہ کا نام جب آیا تو ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ فلم شروع ہوگیا۔ معمولی قسم کا فلم تھا۔ وہی پُرانی کہانی جو "دیوداس" کے بعد سے نوّے فیصدی ہندوستانی فلموں میں ہوتی ہے۔ ایک تھا لڑکا۔ ایک تھی لڑکی دونوں میں پریم تھا۔ والدین دوسری جگہ شادی کرنا چاہتے تھے۔ یہ دونوں گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مختلف مُصیبتیں پڑیں۔ درجن بھر گانے گائے گئے۔ عین اس موقع پر جب لڑکے کے والدین اپنی رضامندی دینے پر تیار ہوئے تھے وہ ایک گانا گاتا ہوا رُخصت بہ ملک عدم ہوا۔ لڑکی اُس کی یاد میں سنیاسی ہوگئی۔ کہانی جیسی بھی ہو زرینہ کی اداکاری معمول سے بھی زیادہ کامیاب تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے آرٹ کا تمام نچوڑ اس فلم میں پیش کر دیا ہے۔ "پریم پجارن" بلاشک اُس کا بہترین فلم تھا۔ مگر میں تماشہ سے محظوظ نہ ہوسکا کیونکہ تمام عرصہ شکور اور زرینہ باتیں کرتے رہے۔ وہ دلچسپ باتیں کرنے میں کمال رکھتی تھی۔ لیکن اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے میں نے اُس کو کبھی نہ سُنا تھا۔ شکور اس کو اپنے باغ، اپنے کھیت، اپنے گاؤں کے حالات سُناتا رہا۔ لکھنؤ کے قابل دید مقامات گنائے۔ زرینہ نے اپنے بچپن کے واقعات دُہرائے۔ فلم ستاروں کی طرح نہیں کہ "بچپن سے میں محسوس کرتی تھی کہ میری رُوح اداکاری ہی کے ذریعے ظاہر ہوسکتی ہے" بلکہ بچوں کی طرح "اپنے میں بھی لڑکپن میں بڑی شریر تھی۔ ہمسائے میں آم کا درخت تھا جب سب سو جاتے، میں چپکے سے اُٹھکر کچّی کچّی کیریاں چُرا لاتی جس کی کبھی چٹنی بنتی کبھی اچار۔"

تماشہ ختم ہوا تو میں اس مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ کیا نفسیات کا کامل ترین ماہر بھی عورت اور اُس کی نسوانی گہرائیوں کو سمجھ سکتا ہے۔ رُخصت ہوتے وقت زرینہ نے شکور کو دوبارہ ملنے کی دعوت دی اور مجھ سے کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے شکور صاحب سے ملاقات کرائی۔"

(۳)

عجیب اتفاق ایسا ہوا کہ اُس کے بعد شکور یا زرینہ سے کئی مہینے تک ملاقات نہ ہوسکی۔ شکور میرے مکان پر ایک بار آیا مگر میں باہر تھا۔ پھر میں چند ماہ کے لئے دُنیا کی سیاحت کیلئے نکل گیا۔ جب میں واپس بمبئی پہونچا تو مکان پر ڈاک کا ایک انبار تھا۔ میں نے پہلے چند فلمی رسالے کھولکر دیکھنے شروع کئے کہ تازہ ترین فلمی خبریں پڑھوں۔ "فلم نامہ" کے پہلے ہی صفحے پر کیا دیکھتا ہوں کہ زرینہ اور شکور کی اکٹھی تصویر جس کے نیچے لکھا تھا: "ہندوستان کی مایۂ ناز اداکارہ زرینہ اور اُن کے شوہر عبدالشکور"۔ یہ دیکھکر مجھکو ایسا محسوس ہوا جیسے میرے ساتھ سخت دغا کی گئی ہو۔ اور واقعہ بھی یہ تھا۔ شکور کے ساتھ شادی کرکے زرینہ نے پوری اُس تصویر کو غلط ثابت کر دیا تھا جو میں نے "ناگن" میں پیش کی تھی۔ میرے دماغ میں دُور دُور بھی یہ گمان نہ گزرا تھا کہ وہ شکور جیسے سیدھے اور غیر دلچسپ شخص کے ساتھ شادی کرے گی۔۔۔ اُس نے بڑے بڑے رئیسوں، تاجروں، ادیبوں اور شاعروں کو ٹھکرا دیا تھا۔ اگر وہ کسی کلرک، کسی نائب تحصیلدار، کسی فاقہ زدہ اخبار نویس سے بھی شادی کر لیتی تب بھی مجھے اتنا تعجب نہ ہوتا۔ زرینہ۔۔۔ حسین، فسوں کار، چالاک زرینہ۔۔۔ اور شکور۔ بیچارہ سیدھا سادا دیہاتی شکور! دونوں تصویریں گویا میری پریشانی اور استعجاب پر مسکرا رہی تھیں۔

خط کھول کر پڑھنے شروع کئے۔ کتب فروشوں کے بل، درزی کا بل۔ مالک مکان کا بل۔ بجلی کا بل۔ پانی کا بل۔ رسالوں کے اڈیٹروں کے تقاضے کہ مضمون یا افسانہ بھیجو۔ اُن شادیوں کے

رُقعے جو کئی مہینے ہوتے ہو چکی تھیں۔ پرانے دعوت نامے۔ اور ان میں ہی ایک خط۔ شکور اور زرینہ دونوں کی طرف سے۔ صرف چند سطریں تھیں: "ہم دونوں بہت مشکور ہونگے اگر آپ چند روز کے لئے ملیح آباد آکر ہمارے ساتھ ٹھہریں۔ سفیدی آم آپکے منتظر ہیں۔ مخلص شکور اور زرینہ"

میں نے طے کر لیا کہ میں اس راز کی تہ تک پہونچنے کے لئے ملیح آباد ضرور جاؤں گا۔ دوسرے اخبار پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ زرینہ نے سٹوڈیو کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ "پریم پجارن" اس کا آخری فلم تھا۔

اگلے مہینے کسی کام سے لکھنؤ جانا ہوا تو میں تار سے اطلاع دیکر ملیح آباد پہونچ گیا۔ شکور اور زرینہ دونوں سٹیشن پر لینے آئے۔ زرینہ اب ایک سادے غرارے اور دوپٹہ قمیص میں ملبوس تھی۔ اس کے چہرے پر سُرخی تھی۔ غازہ کی نہیں بلکہ صحت کی علامت وہ دونوں مجھے دیکھکر از حد خوش ہوئے۔ گھر لیجا کر اتنی خاطر کی اور اتنے آم کھلائے کہ میں دو چار ہی دن میں پریشان سا ہو گیا۔ ان دونوں کی زندگی قابل رشک تھی۔ شکور ہر صبح کو اپنے باغ اور کھیتوں کی نگرانی کرنے کے لئے جاتا۔ زرینہ گھر کا کاروبار دیکھتی۔ کبھی کبھی وہ بھی باغ میں پہونچ جاتی۔ اور پھر دونوں ساتھ ساتھ واپس آتے۔ باغ اور کھیتوں سے ملا کر کوئی بہت آمدنی معلوم نہ ہوتی تھی مگر اُن کو اس کی کوئی فکر نہ تھی۔ ایک سابق فلم سٹار کو اس دیہاتی ماحول میں دیکھکر تعجب ضرور ہوتا تھا مگر زرینہ کے طرزِ عمل سے یہ بالکل نہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہاں نووارد ہے بلکہ ایسا ظاہر ہوتا تھا گویا اُس کی تمام عمر یہیں کٹی ہے۔

جب مجھے یہاں رہتے ایک ہفتہ ہو گیا تو میں نے باصرار ان دونوں سے واپسی کی اجازت حاصل کی۔ جس شام کو میں روانہ ہونے والا تھا، دوپہر کے کھانے سے فراغت پاکر میں نے ہمت کرکے وہ سوال کر ہی ڈالا جو مجھے اتنے عرصے سے پریشان کئے ہوئے تھا۔

"ایسا سوال کرنا بدتہذیبی تو ضرور ہے" میں نے جھجکتے ہوئے کہنا شروع کیا "امید ہے معاف کیا جاؤں گا، مگر پھر بھی پوچھنا پڑتا ہے کہ......" کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح یہ فقرہ پورا کروں۔

شکور نے مسکرا کر زرینہ کی طرف دیکھا۔ اور وہ ہنسکر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں نہ کہ ایک ناگن گھریلو بلی کیسے بن گئی"

میں نے گردن کے اشارے سے ہاں کہا۔

"اگر آپ ایک سابق فلم سٹار کا یقین کر سکتے ہیں تو میں کہونگی کہ وہ ناگن دراصل ہمیشہ گھریلو بلی ہی تھی۔ ناگن کا روپ اس لئے لیا تھا کہ فلمی دُنیا میں معصوم خُرخُر کرتی ہوئی بلیوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس زود پہلی نظر فریب ماحول میں دھوکا ہی اصلیت ہے اور سوانگ روزمرہ کا دستور۔ اگر میں ظاہرا بھی ایک سیدھی سادی دیہاتن رہتی تو کامیابی کا دروازہ میرے لئے ہمیشہ بند رہتا۔ اس کے علاوہ معاف کیجئے گا آپکے ہم پیشہ حضرات نے فلم ایکٹرسوں کو اس قدر بدنام کیا ہے کہ اگر میں تصنع سے کام نہ لیتی اور سادہ برتاؤ رکھتی تب مجھے اور بھی زیادہ عیار اور چالباز سمجھا جاتا۔"

"تو میں نے جو کچھ اپنے ناول "ناگن" میں لکھا تھا وُہ......"

"وُہ بالکل غلط تھا" شکور بیچ میں بول پڑا۔ اور پھر مُسکراتے ہوئے "وہ تو میں ناول پڑھکر ہی سمجھ گیا تھا"

"تو آپ کا مطلب ہے کہ آپ بغیر ملے اپنی بیگم صاحبہ کے

کردار کو اتنا پہچانتے تھے؟"

"میں زرینہ کو تو نہ جانتا تھا مگر ہندوستانی افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کی کمزوریوں سے بخوبی واقف تھا۔ آپنے ناگن کا کیریکٹر جو پیش کیا تھا وہ ناممکن الوجود تھا۔ انسان خواہ وہ فلم سٹار ہو یا مولوی اُس میں انسانیت کا جوہر مفقود نہیں ہوتا۔ ناگن کے ظاہری رُوپ کو تو آپنے ضرور دکھایا مگر آپ یہ نہ معلوم کر سکے کہ اس کا دل آخر عورت کا دل تھا۔ آپ کا ناول غلط نہیں تھا، مگر وہ ایک ایسی تصویر کی طرح تھا جو بذاتِ خود صحیح ہو مگر اُلٹی لٹکا دی گئی ہو۔"

میں چند لمحے کے لئے خاموش بیٹھا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میری نظر سے ایک پردہ ہٹ گیا ہے۔ اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ناگن کے کردار پیش کرنے میں میں کتنی غلطی پر تھا۔ موضوع بدلنے کیلئے میں نے زرینہ سے سوال کیا۔ "تو کیا آپنے فلمی دُنیا کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ دیا؟"

"جی ہاں" اُس نے جواب دیا "مگر اس لئے نہیں کہ یہ کام بُرا ہے یا مخربِ الاخلاق ہے۔ ہر پیشہ بُرا ہو سکتا ہے اگر اس میں بُرے لوگ لئے جائیں گے۔ مگر ہر اداکار کو اپنی کامیابی کے معیار پر پہونچکر اپنی زندگی کو ختم کر دینا چاہیئے۔ ورنہ ایک دن خود سٹوڈیو والے اس سے استعفیٰ طلب کریں گے۔"

اتنے میں زنانخانے سے ایک نحیف آواز آئی "زرینہ بیٹی یہ پان لے جاؤ۔"

"میری والدہ!" شکور نے کہا جب زرینہ اٹھکر گئی "آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ زرینہ نے چند روز ہی میں اتنی قدامت پسند خاتون کو بھی خدمت سے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔"

اس شام کو میں رخصت ہو کر لکھنؤ واپس آیا اور وہاں سے بمبئی کے لئے ٹرین بدلی۔ سٹیشن پر ایک کتب فروش لڑکا اور ناولوں کے ساتھ "ناگن" بھی بیچ رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا "صاحب یہ ناول لیجئے۔ بہترین ہے۔ بس دو جلدیں رہ گئی ہیں۔"

میں نے دونوں جلدیں خرید لیں اور جب ٹرین روانہ ہو گئی تو اُن کو دریچے سے باہر پھینکدیا۔

یہی وجہ ہے کہ باوجود پہلے ایڈیشنوں کی اتنی مقبولیت کے "ناگن" کا تیسرا ایڈیشن شائع نہ ہوا۔ اور نہ ہوگا۔

خواجہ احمد عباس

فاؤسٹ

مترجمہ: شاہد احمد۔ بی۔ اے۔ (آنرز) دہلوی

فاؤسٹ اُردو میں پہلی مرتبہ عام فہم و سحر کن طویل کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ "فاؤسٹ" وہ آئینہ ہے جس میں ہر زمانہ کے انسان کو اپنی صورت نظر آتی ہے۔ شہرۂ آفاق شاعرِ المانیہ "گوئٹے" نے دُنیا کی اس بلند ترین فلسفیانہ نظم میں اپنی عمر کے ساٹھ سال صرف کئے تھے۔ اس کہانی میں فلسفۂ حیات کے مسائل کو شاعرانہ آرٹ کا لباس پہنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں آپ زندگی کا وہ خواب دیکھیں گے جو بیک وقت سہانا بھی ہے اور بھیانک بھی۔ "فاؤسٹ" فلسفی کی عقل اور شاعر کے تخیل کی آخری حد ہے۔ نیکی، بدی، حسن، عشق، گناہ، خون، قتل اور موت کی یہ داستانِ رنگیں کتابی صورت میں شائع ہو گئی ہے۔ قیمت عمر ملنے کا پتہ:۔ ساقی بک ڈپو۔ دہلی ۔

تو اور میں

گلشنِ ہستی کا سارا جوش ہے تیرے لئے
وا گلِ نوخیز کا آغوش ہے تیرے لئے
ذرہ ذرہ میکدہ بردوش ہو تیرے لئے
اور فطرت کی تغافل کوشیاں میرے لئے

کیف آگیں ہر سنہری شام ہو تیرے لئے
مہ بدامن چرخِ نیلی فام ہے تیرے لئے
روح پرور زندگی کا جام ہے تیرے لئے
اور شبنم سی سرشک افشانیاں میرے لئے

چشمِ حیراں ثریا باز ہے تیرے لئے
رنگ میں ڈوبا ہوا ہر ساز ہے تیرے لئے
تارِ ہستی زمزمہ پرواز ہے تیرے لئے
اور سازِ غم کی نوحہ زائیاں میرے لئے

کہکشاں ظلمت میں جلوہ بار ہے تیرے لئے
آبشارِ نغمہ. نغمہ بار ہے تیرے لئے
فرقِ دل ہر لحظہ سجدہ بار ہے تیرے لئے
اور چشمِ تر کی دریا باریاں میرے لئے

بزمِ تاروں کی مسرت ریز ہے تیرے لئے
خامشی راتوں کی کیف انگیز ہے تیرے لئے
جامِ فطرت حسن سے لبریز ہے تیرے لئے
اور قدرت کی کرشمہ سازیاں میرے لئے

جامِ ہستی کی شرابِ ناب ہے تیرے لئے
ساز ہے تیرے لئے مضراب ہو تیرے لئے
زندگانی ایک رنگیں خواب ہے تیرے لئے
اور گرمِ جستجو بربادیاں میرے لئے

نواب گلدم

نواب عظیم الشان کے پوتے نواب ظل السلطان کو نواب ظل السلطان کہو تو دلی کے لوگ منہ دیکھنے لگیں، ہاں نواب گلدم کہو تو جھٹ پہچان جائیں۔ نام لیتے ہی تصویر سامنے آجائے۔ پنج گوشیہ مخمل کی کرن لگی ہوئی ٹوپی سر پر۔ ململ کا ٹخنوں تک کا انگرکھا۔ اس پر جامہ وار کی نیم آستین۔ آڑا پاجامہ۔ مغلئی ڈاڑھی۔ مدراقد۔ چھوٹی سی توند۔ گورا رنگ۔ چھریائے ہوئے بال۔ شانوں تک پٹھے۔ انگلیوں میں کئی کئی انگوٹھیاں۔ ٹھمک چال۔ شہر بھر میں اپنی وضع کے اکیلے۔ عاشق مزاج۔ حسن پرستی کا ایسا لپکا کہ عورت و مرد کی تمیز نہیں۔ قوالی کی محفلوں کا تماشہ۔ ناچ گانے کا چسکا ایسا کہ جہاں طبلہ کی کھڑک سنی بوٹی بوٹی پھڑکنے لگی۔ چاوڑی بازار کے ہر کوٹھے پر ان کی ہائے کے نعرے سُن لیجئے۔ شاعری کے نشہ میں اتنے چُور کہ جہاں دیکھو کھڑے گنگنا رہے ہیں۔ جس مشاعرہ میں نواب گلدم نہیں بے رونق۔

نواب گلدم کیا تھے۔ رنگ محل کا ایک طاق یا آثار قدیمہ کی ایک رنگین یادگار تھے۔ نوابوں کی اولاد، کمانے سے بے فکر عشق کی گود میں پلے ہوئے حسن کی پُتلیوں کا تماشہ دیکھنے والے بچپن سے مزاج میں وارفتگی۔ شادی کر کے عشق کے جذبات کی توہین کرتے۔ بال بچوں کا جنجال پالتے تو حسینوں کی قدر کون کرتا حسن کی منڈی سُونی نہ ہو جاتی۔ وہ تو اتفاق سے طبیعت کے کسی قدر مُٹھے تھے۔ حسن و عشق کی ساری لذّتیں صرف آنکھوں تک محدود تھیں "ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا۔ خوش وقت ہوئے اور چل نکلے" ورنہ سو روپے مہینے کی آمدنی کیا ہوتی ہے۔ رئیسوں کی بازیوں کے سامنے سلطنتیں ہیچ ہوتی ہیں۔ ایک ہی ریلے میں کھنڈر ہو کر رہ جاتے۔ میاں تانگہ چلاتے دکھائی دیتے یا کسی کا پاندان اٹھائے دکھائی دیتے۔

کالج کی زندگی بڑی آزاد ہوتی ہے۔ ہماری ٹولی کی بھی نواب گلدم سے یاد اللہ ہو گئی تھی۔ انھیں بننے کا شوق اور ہمیں بنانے کا۔ برسوں صحبت رہی۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ آدمی مرنجان و مرنج اور بے ضرر تھے۔ دردِ عشق کے سوا جھوٹا کہو یا سچا ان میں کوئی عیب نہیں تھا۔ کالج چھوٹا۔ معاش کی فکر ہوئی۔ تو ان سے ملنا جلنا بھی کم ہو گیا۔ ایامِ جاہلیت کی یاد میں جب کہیں سر راہے گاہے ملاقات ہو جاتی دس پندرہ منٹ تک ایسا معلوم ہوتا کہ دنیا میں حسن و عشق کی ساری رونق ہے۔ وہی ٹھنڈے ٹھنڈے سانسوں کے ساتھ ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی

نہ چھیڑ راکھ کو ہم دل جلوں کی بادِ صبا :: ذرا ہوئی نہ ہوا لا دُھواں نکل آیا

کہہ کر ابتدائے کلام اور وہی کسی برقعہ پوش یا ساڑھی بند کے پیچھے آنسوؤں سے بھیگی نظریں دوڑا کر ؎

بے مروّت، ناوک افگن آفریں صد آفریں :: دل کا دل زخمی کیا پیکاں کا پیکاں لے چلا

پڑھتے ہوئے بے کہے سُنے روانہ ہو جاتا۔ یہاں تک کہ اسی اثنا میں بسلسلہ ملازمت دلی کیا ہندوستان بھی مجھے چھوڑنا پڑا۔ پورے بیس برس بعد غلامی کی قید سے چھوٹ کر جو وطن آیا تو نہ اگلی سی زمین تھی نہ آسمان۔ صورتیں بدل گئیں۔ معاشرت کچھ کی کچھ ہو گئی۔ آدمی تو آدمی بازاروں، سڑکوں، مکانوں، اینٹوں اور پتھروں تک نے نیا رنگ روپ اختیار کر لیا۔ بدقسمتی سے پردیس بھی گیا تو یورپ نہیں۔ غلام بھی رہا تو گوروں کی معرفت کالوں کا۔ اس لئے یہاں کا انقلاب کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ مغربی تہذیب مشرقی گھروں میں اوپری اوپری دکھائی دی۔

جوان گیا تھا اور بوڑھا ہو کر آیا تھا۔ وطن کی حالت میں بڑا انقلاب دیکھا۔ نہ پرانے طریق تھے نہ قدیم لباس۔ نہ مردوں کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں نہ چڑھی ہوئی ڈاڑھیاں۔ نہ عورتوں کو سُرمہ مِسّی مہندی کا شوق رہا تھا نہ زیورات سے گوندنی کی طرح لدنے کا۔ اِدھر ڈاڑھی اور مونچھ غائب ہو گئی تھی تو ادھر چوٹی اور شرم۔ شہر کے باہر اس تمدّنی انقلاب کے تماشے زیادہ دیکھنے میں آتے تھے۔ اس لئے میں صبح شام کی ہوا خوری کا اکثر وقت۔ روشن آرا، قدسیہ باغ، نکلسن پارک میں یا دوسری طرف نئی دہلی کی سڑکوں پر گذارا کرتا تھا۔ ایک دن شاید روشن آرا کلب میں کوئی دعوت تھی۔ طرح طرح کے نوجوان مرد اور وضع وضع کی عورتیں جنھیں فوجی لوگ خواتین اور دیویاں کہتے ہیں۔ گاڑیوں موٹروں میں اور کچھ زمین کو ٹھکراتی چلی آرہی تھیں۔ میں راستے سے ہٹ کر ایک بنچ پر جا بیٹھا۔ اور ان پریوں کے تخت اترنے کی سیر دیکھنے لگا۔

کچھ فاصلہ پر ایک بنچ اور بچھا ہوا تھا جس پر ایک صاحب کوٹ پتلون میں ملفوف۔ ننگے سر۔ آڑی مانگ نکلی ہوئی۔ ہیبت قد مبوس، ڈاڑھی مونچھ صاف، عینک لگائے، نگاہوں میں بینائی۔ چہرہ بے چین نظر آیا۔ آجکل کے فیشن کی اور خوبیاں تو جو ہونگی وہ ہونگی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ مذہب اور عمر کی تمیز نہیں ہوتی بلکہ دیکھنے والا لباس کی تفریق نہ کرے تو تذکیر و تانیث کا امتیاز بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ میں جب انھیں دیکھتا تھا دل میں ایک خاص قسم کی غیر معلوم کشش محسوس ہوتی تھی۔ ادھر بار بار ان کا عینک کی اوٹ میں میری طرف دیکھنا بتا رہا تھا کہ وہ بھی مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اتنے میں دو تین گیسو بُریدہ خوش رنگ ساڑھیوں میں تیتریوں کی طرح اڑتی ہمارے قریب سے گذریں۔ میری نظریں تو قدرتی طور پر نیچی ہو گئیں میرا مذاق ایسا اپ ٹو ڈیٹ کہاں تھا کہ اس شباب کی آزادیوں اور حسن کی عریانیوں کی داد دیتا۔ لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ وہ صاحب بائیں فیشن بنچ کے تختے پر تھاپ لگا لگا کر نہایت سُریلی آواز میں گا رہے ہیں ؂

نہ وہ حسن ہی میں ہیں شوخیاں نہ وہ عشق ہی میں ہیں گرمیاں ٭ نہ وہ غزنوی کا مذاق ہے نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

باوجود ڈھلتی عمر کی افسردگیوں کے مجھے اپنے کالج کے زمانہ کی شوخیاں یاد آ گئیں۔ بے اختیار جی چاہا کہ ان حضرت کو ذرا بنانا چاہیے۔ یا تو یہ انتہا کے زندہ دل ہیں یا انھیں کوئی مہذب بیماری ہے۔ کچھ بھی ہو وقت گذاری کا مشغلہ خاصہ ہے۔ یہ سوچ کر میں ان کی طرف بڑھا۔ انھوں نے مجھے بغور دیکھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور نکالے۔ دو چار مرتبہ سر پر ہاتھ پھیرا جیسے بھولی ہوئی بات کو یاد کرنیکی کوشش کرتے ہیں۔ ملازمت کی کھکھیڑیں خدا کی پناہ۔ لیکن روزگار کی طرف سے میں خوش قسمت رہا۔ اس پردیس کا سوال اور چیز ہے ورنہ ہر طرح کی بیفکری میں گذری۔ اس لئے میری صورت میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ اس کے سوا کہ پہلے بیس سال کا نوجوان تھا۔ اب پچاس برس کا بوڑھا۔ یا کبھی ڈاڑھی نہ تھی اب مدبّر تھا۔ اور ڈاڑھی بھی تل چاولی۔ میرے قریب جاتے ہی ان کا حافظہ تیز ہو گیا۔ فوراً کھڑے ہو گئے اور ایک عجیب لَے سے ؂

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے ٭ اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

گاتے ہوئے لپٹ گئے اور کہنے لگے۔ میاں محسن ہے ہے آنکھیں ترس گئیں۔ ایسے گئے کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا۔ آج یہ چاند کدھر سے نکل آیا۔ کہو بھائی کب آئے؟ کیسے ہو؟ اتنی دیر میں میں نے پہچانا کہ اخاہ! اس بہروپ میں ہمارے نواب گلدم ہیں۔ خوب بھینچ بھینچ کے گلے ملا۔ مگر حیران تھا کہ اس ٹھیٹ دلی کے آدمی پر انگریزیت کہاں سے سوار ہو گئی۔ یہ برزخ کیا بنائی ہے۔ کہیں بڑھاپے میں دماغ تو نہیں چل گیا۔ آخر نہ رہا گیا۔ مزاج پرسی کیسی مجھے سوال کرنا پڑا کہ "حضرت یہ آپ اچھے خاصے انسان سے منو کیسے بن گئے؟"

نواب۔ منو یعنی؟

میں ۔ (ہنس کر) آپ تو پُرانی قسم کے عاشق مزاج ہیں ۔ میں تو سمجھا تھا کہ عشق کی آگ نے آپ کو جُھلس کر کے رکھ دیا ہوگا ۔ اور ہمارے نواب گلدم کی رُوح یونان کی سرزمین ۔ کنعاں کے کاشانوں ۔ مصر کے ایوانوں ۔ کوہ بیستون ۔ نجد کے بیابانوں یا پنجاب میں راوی کے کنارے کہیں بھٹکتی پھرتی ہوگی ۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ آپ ابھی زندہ ہیں اور زندہ بھی نئے چولے میں ۔

نواب ۔ (مسکرا کر) ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ؛ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما ۔

کہیں دوسروں پر مرنے والے خود مرا کرتے ہیں ۔ عشق کی جوانی کے دن تو اب آئیں ہیں ۔

میں ۔ واقعی چشم بد دور آپ کا حُلیہ دیکھکر کون آپ کو ستر ابہترا کہہ سکتا ہے ۔ البتہ تعجب یہ ہوتا ہے کہ آپ تو پیدائشی قدامت پسند تھے ۔ جوانی میں کبھی اپنی وضع نہ بدلی ۔ ہمیشہ انگریزی لباس پر پھبتیاں اُڑائیں ۔ اب فیشن کے دریا میں غوطہ کیسا ؟

نواب ۔ (قہقہہ لگا کر) عشق ازیں بسیار کرد است وکند ؛ سبحہ را زنار کرد است وکند

یہی تو میری زندہ دلی کا راز اور زندگی کے آثار ہیں ۔ اگر میں اس نئے دَور میں اپنے عشق کی وضع نہ چھوڑتا ۔ اور زمانے کی چال کا ساتھ نہ دیتا تو واقعی کب کا ختم ہوگیا تھا ۔

میں ۔ کیا عشق بھی رنگ بدلتا رہتا ہے ؟

نواب ۔ عشق کوئی فرشتوں کی نورسم نہیں کہ ازل سے ابد تک ایک ہی ڈھنگ پر رہے ۔ یہ تو ہم دُنیا والوں کا کھیل ہے جس طرح کبڈی، گلی ڈنڈا گچی پالا وغیرہ ۔ جدید تہذیب میں آکر ہاکی ۔ فٹ بال ۔ بلیرڈ ۔ گلف ہوگئے ۔ اسی طرح عشق نے بھی اپنا سانگ تھیٹر سینما میں تبدیل کر لیا ۔ پھر عاشق تو اس اسٹیج کے ایکٹر ٹھیرے وہ کیوں اپنا مذاق نہ بدل لیتے ۔

میں ۔ عاشق نہ ہوئے گرگٹ ٹھیرے ۔ واہ بھئی تو آپ کے نزدیک عشق بھی ایک کھیل ہے جذبہ نہیں ۔

نواب ۔ ارے میاں کیسی باتیں کرتے ہو ۔ آجکل صحیح جذبہ وہ کہلاتا ہے جو وقت کے تابع ہو ۔ آپ نے غور نہیں کیا ۔ اب تیس پینتیس برس سے عشاق کی وضع اور صفت میں بہت فرق ہوگیا ہے ۔ آجکل عاشق کیلئے بہت ضروری ہے کہ وہ کم از کم گریجویٹ ہو ۔ فیشن ایبل ہو ۔ انگریزی کے سوا کسی زبان میں بات نہ کرے ۔ وہ دن گذر گئے کہ عاشق الوانی کھٹوانی لیکر پڑ جاتے تھے ۔ حُب کے عمل پڑھتے تھے ۔ گریبان چاک ۔ سر پہ خاک ۔ ہائے واویلا مچاتے ۔ گلیوں کی ٹھوکریں یا لڑکوں کے پتھر کھاتے پھرتے تھے ۔ اب کوئی فطرت نگار ۔ افسانہ نویس یا مصور کردار ڈراماٹسٹ کسی ایسے حداثی خوار دیوانے کو اپنے پلاٹ کا ہیرو بنا سکتا ہے ۔ ان کے شاہکار کا عاشق ہو یا معشوق اپ ٹو ڈیٹ نظر آئیگا ۔

میں ۔ اجی یہ تو سوشل باتیں ہیں ۔ عشق کو اُن سے کیا واسطہ ؟ میں تو جانتا ہوں کہ بیروزگاری اور سرمایہ داری اور مزدور کی کشمکش نے عاشقی کا بازار ہی سرد کر دیا ہے ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق ؛ کہ یاراں فراموش کردند عشق

نواب ۔ یہ آپ کی لاعلمی ہے ۔ بھلا کوئی دلیل ؟

میں ۔ اچھا آپ ہی فرمایئے مدتوں سے کسی نے فرہاد کی طرح تیشہ مار کر جان دی ہے ۔ انا لیلیٰ انا لیلیٰ کہتا ہوا ہرنوں کی آنکھیں چومتا ہوا کوئی دکھائی دیا ہے ۔ کتنوں نے تیغِ ابرو کی یاد میں اپنے گلوں پر چھریاں پھیری ہیں ۔ آخر کہیں ہیر رانجھا کا قصہ دُہرایا جاتا ۔ کبھی تو عاشق کا جنازہ نکلتا ۔

نواب ۔ آپ میری آنکھوں سے دیکھیں۔ تھوڑی دیر کیلئے اپنا زاویہ نگاہ بدل ڈالئے۔ بندہ نواز اس دور میں پہلے سے بہت زیادہ عشق و عاشقی کا چرچا ہے۔ البتہ یہ مرض مہذب ضرور ہوگیا ہے۔ اگلے وقتوں میں اس بیماری کے ڈھکیا صدیوں میں دو چار ہی پیدا ہوتے تھے۔ آج جس نے سوٹ پہن لیا۔ ہیٹ لگا لی۔ ڈاڑھی مونچھ پر اُسترا پھیر دیا۔ چہرے پر کریم کو چپڑ لیا وہی عاشق ہے۔ کوئی ماں کے پیٹ ہی سے معصوم نکلا ہو یا فطرت ہی ناقص ہو تو اور بات ہے ورنہ جس کی پتلون کو ٹٹولیے گا عشق کے شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آئیں گے۔

میں ۔ لاحول ولا قوۃ! آپ کی باتیں بھی عجیب ہیں۔ آپ نے تو سرے سے عشق کا مفہوم ہی بدل دیا۔ موجودہ معاشرت سے مستفیض ہونیوالا ہر شخص آپ کے نزدیک عاشق ہے!

نواب ۔ بھیا ناراض کیوں ہوتے ہو ؎

عشق نے بدلا ہی جو رنگ وہ ہم سے پوچھو ∴ آپ کیا جانیں غریب اگلے زمانہ والے

ہمہ وقت عشق میں مبتلا رہنے کا پرانا طرز بدل گیا ہے۔ رات دن ایک معشوق کے تصور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جانا آجکل کا فیشن نہیں۔ اب لوگ دوسرے مشاغل کی طرح عشق بھی پورے ضابطے اور وقت کی قدر کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ جو آپ نے سُنا ہوگا کہ "دل بہ یار و دست بکار"، اس کو اسی زمانہ والوں نے تو سمجھا ہے۔ پُرانے وقتوں کے عاشق تو احمق تھے جن کا قول تھا کہ ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن ∴ دل بدستِ دگرے دادن و حیراں بودن

سبحان اللہ! یہ بھی انسانیت ہے معشوق نہ ہوا بھوت ہوگیا۔ کہ سر سے اترتا ہی نہیں۔ ہم بھی مدتوں اسی حماقت میں مبتلا رہے اور نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ آخر سمجھ گئے۔ زندگی نکل آئی؟ ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک نکل جائیے۔ جہاں انگریزی تعلیم۔ انگریزی تمدن، انگریزی زندگی رونق پر ہے اس قسم کے ہزاروں عاشق ملیں گے۔ دفاتر کے ملازم اپنا کام بھی کرتے ہیں اور عشق بھی۔ اسکولوں اور کالجوں کے طلبار طالب علم بھی ہیں اور عاشق بھی۔ ملازمت اور پڑھنا لکھنا اپنی جگہ ہے اور یہ جذبہ اپنی جگہ۔ ادھر قلم گھسیں کرم اُٹھے۔ مدرسہ بند ہوا اور عشقبازی کا نمبر آیا۔ تفریح گاہیں بارونق۔ سینما ہال آباد۔ بازاروں میں نگاہوں سے نگاہیں لڑ رہی ہیں۔ دوکانوں پر شٹیک ہینڈ ہو رہا ہے۔ کلبوں کے کمرے۔ چمن۔ موٹریں عشق کی دوکانیں ہیں۔ یہ کاروبار عموماً رات کے گیارہ بارہ بجے تک ہوتا ہے۔ اس کے بعد حسن کا راستہ وہ اور عشق کا یہ۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آزادی لباس وضع زمانہ کے مطابق ہو۔ ذرا غدر پہلے کی بو آئی اور پارہ پتھر باہر۔ رقابت، پاکبازی اور مفلسی سے مزہ کرکرا ہوتا ہے بلکہ ایسے عیب دار کو کوئی گھسنے تک نہیں دیتا۔

میں ۔ غضب الٰہی آپ انھیں عاشق کہتے ہیں۔

نواب ۔ اور کیا کہوں؟

میں ۔ فاسق۔ بدنظرے۔ رذیل۔ کمینے۔

نواب ۔ ماشاء اللہ (زور سے ہنس کر) بھائی کیا کہہ رہے ہو عشق و فسق دو چیزیں ہیں۔

میں ۔ اور تم عشق و فسق کو ایک سمجھتے ہو۔ توبہ توبہ۔

نواب ۔ ناراض نہ ہو۔ جن ڈکشنریوں میں عشق کے معنی اور تھے اور فسق کے کچھ اور وہ مشرق اور مغرب کو ملانیوالے سمندر میں

ڈبو دی گئیں۔ اب تو ان دونوں لفظوں میں تفریق کرنیوالا بیوقوف۔ جاہل اور اپنے عیش کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔

میں ۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ شیطان سمجھا جاتا ہے۔ آپ ہی عشق کی مٹی خراب کی ہے۔ اگر یہی عشق ہے تو اس کے کرنیوالے سارے فاسق ہیں۔ لیکن نہیں ایسا نہیں ہوگا ہندوستان ابھی ایک حد تک خاصہ مذہبی ملک ہے۔

نواب ۔ نوجوانوں کو مذہب سے کیا کام ان کا مذہب تو فیشن ہے۔ رہے ملک کے بڑے بوڑھے۔ ریٹائیل ہوں یا تلک دھاری ان میں سے پچاس فیصدی کا خمیر تو اس ترشی سے اٹھا ہی نہیں۔ باقی سو میں سے پچاس پورے بگلا بھگت ہیں۔ انھوں نے تو مجازی کے ساتھ حقیقی کو بھی ملا لیا ہے۔ وہ فیشن کے بدلے اپنی وجاہت اپنے اثرات اپنی قومی نمود اور اپنے دینی یا دنیوی وقار سے کام لیتے ہیں۔

میں ۔ بہرحال میں اور میں کیا کوئی بھی سمجھدار آدمی اس عشق کو فسق کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

نواب ۔ اس خاص معاملہ میں ایسے کسی شخص کو میں سمجھدار کہنے کو تیار نہیں جو وقت کو نہ پہچانے اور فضا کے مطابق اپنا مذاق نہ پیدا کر سکے۔ میں بحث کرنا تو نہیں چاہتا لیکن یہ سمجھ لو کہ عشق اور فسق میں تمیز کرنیوالے تو سینکڑوں برس سے زندہ درگور یادرکتاب ہیں۔ آخری دور کی فارسی شاعری اور اردو میں معاملہ بندیوں نے یہ بھید آشکار کر دیا۔ ہمارے ادب کا سارا سرمایہ بوالہوسی کے جذبات سے بھرا ہوا ہے۔ آج اگر آپ فسق اور عشق کا ڈانڈا الگ کرنا چاہیں گے تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو آپ کو خانقاہوں میں بھی اسی قسم کا عشق نظر آنے لگے۔

میں ۔ مینڈکی کو بھی زکام ہوا اب آپ مجازی کی ہنسی اڑاتے اڑاتے حقیقی پر بھی منہ آنے لگے ۔ع نہ چھیڑ ان دلق پوشوں کو کہ یہ اللہ والے ہیں۔

نواب ۔ "اندھے کے آگے روئے اور اپنے نین کھوئے" عشق و محبت کا فلسفہ آپنے پڑھا ہی نہیں۔ آپ کی سمجھ میں کیونکر آئے۔ بندہ پرور جب مجازی اپنے درجہ سے گر کر فسق کی سطح پر آجاتا ہے تو حقیقت کی ساری راہیں بند ہوجاتی ہیں صرف یہی دیکھا گیا ہے کہ ع "نگاہیں در پہ کان آہٹ پہ دل خلوت کا دیوانہ" اور اسی لئے ہمہ اوست کا مسئلہ گھڑ لیا گیا ہے۔

میں ۔ نعوذ باللہ! کیا خرافات بکتے ہو۔ "ایاز قدر خود بشناس"

نواب ۔ میں نے اپنی تو کیا اپنے سارے ملکی و قومی بھائیوں کی گٹ پٹ اور ہوحق کا اندازہ کر لیا ہے۔ سب آمانت کی واسوخت کے مصرعے ہیں۔ ہارمونیم پر الاپے جائیں یا ڈھولک اور ستار پر۔ کلب کے کسی کمرے میں بیٹھ کر سنئے یا مقبرہ کے گنبد میں کھڑے ہوکر۔

میں ۔ اپنے ملک اور اپنی قوم پر اتہام رکھتے تمھیں شرم تو نہیں آتی۔

نواب ۔ عشق میں اور شرم

میں ۔ اچھا مسلمانوں پر تو رحم فرمائیے۔

نواب ۔ مجھے آپ نے کیا خدائی فوجدار سمجھا ہے۔ میں نے اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے۔ رحم و ستم کا اس میں کیا دخل۔

میں ۔ آپ کا مشاہدہ ہی یا تجربہ۔ میری رائے میں آپکی آنکھوں اور آپ کے شوریدہ خیالات نے آپ کو بہکا دیا ہے۔ مسلمان بیچاروں کو اپنے پیٹ سے ہی فرصت نہیں معاشقہ کیا کریں گے۔

نواب ۔ پیر و مرشد! ایک یہی قوم تو ہے جو لنگوٹی میں پھاگ کھیلتی ہے۔ انہی فاقہ مستوں کے دم سے عشق آجتک زندہ ہے۔ ساری دنیا نون تیل لکڑی کا بھاؤ پوچھتی پھرتی ہے اور یہ زلفوں کے سودے میں۔ کوئی تجارت میں ترقی کر رہا ہے۔ ملازمت کے میدان سر ہو رہے ہیں سیاسی گتھیاں سلجھائی جارہی ہیں۔ حکومت سے مقابلہ کی تیاری ہے مگر ان کی وضعداری میں کیا مقدور ہے کہ فرق آیا ہو۔ وہی "بس اک

نگاہ پہ ٹھیرا ہے معاملہ دل کا تو دیکھتے سنگ دریتاں سے تقدیر پھوڑتے ہیں یہ عاشقی ان کا پیشہ تو نہیں ہے۔ اسے ترک کر کے بد مذاق کہلائیں۔ استاد ذوق نے کیا خوب کہا ہے ؎

پھرتے ہیں لکھے پڑھے سودے میں ملک جاہ کے ؛ طفلِ مکتب رہتے ہیں گنبد میں بسم اللہ کے

کھانے کو کچھ ہو یا نہ ہو۔ ٹوٹی جوتی۔ میلا پاجامہ۔ صورت پر پھٹکار سہی معشوق کے بغیر زندگی نہیں۔ البتہ مصیبت یہ آپڑی ہے کہ آجکل کے نوجوان جیبل کی اولاد ہیں۔ سونے کی جب تک جوت نہ آئے آنکھیں نہیں کھلتیں۔ دل کو لیکر کوئی کیا کرے ایک گوشت کا لوتھڑا وہ بھی نیم بسمل زخم خوردہ پاؤں کے نیچے مسلا ہوا۔ یہاں کھنکتی ہوئی جیبیں چاہئیں۔ سرکے پیر تک عاشق انگریزی سنگار داں ہو۔

میں ۔ جب ہی آپ نے یہ کینچلی بدلی ہے۔

نواب ۔ آخر کیا کرتا۔ پرانے سکے کے معشوق ٹکسال باہر کر دیئے گئے۔ اُن کے بوڑھے عمر نے کسی گنتی میں نہ رہے۔ حسن کا معیار دوسرا ہوگیا۔ نمائش کی ترکیب بدل گئی اور میں اپنی عادت سے مجبور تھا۔ بیکاری میں عشق بازی سے زیادہ دلچسپ مشغلہ کونسا ہوسکتا ہے۔ پھر سفید داڑھی اور کھنڈریلوں کی سی پوشاک کوئی مجھ پر قہقہہ لگانا بھی گوارا نہ کرتا۔ ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد داڑھی مونچھ حجام کے حوالہ کی۔ پرانا لباس اتار یہ وضع اختیار کرلی تاکہ تہذیب جدید کے لحاظ سے سوسائٹی کے قابل بن جاؤں اور کسی خاتون یا بیوی کو مجھ سے شیک ہینڈ کرنے میں ناک بھوں نہ سکیڑنی پڑے۔ چنانچہ الحمد للہ جس طرف جاتا ہوں غیر جنس نہیں سمجھا جاتا۔ راستہ چلتے میرے ہاتھ میں اگر کسی کی ساڑھی الجھ جاتی ہے تو وہ بجائے غضب آلود نگاہوں سے دیکھنے کے Sorry کہنے لگتی ہے اور مسکراتی ہے۔ جوان سے جوان اور حسین سے حسین عورت کا سر بازار موٹر یا تانگے سے بچانے کیلئے ہاتھ پکڑ لیتا ہوں تو وہ ایک انداز کے ساتھ Thank You کہہ کر دیر تک میری طرف دیکھتی رہتی ہے۔

میں ۔ آہاہ! چشم بد دور۔ اب تو آپ انگریزی بھی بولنے لگے۔

نواب ۔ تہذیب یافتہ حسن کیلئے مہذب عشق بھی ہونا چاہیئے۔ حسن و عشق کی ہمرنگی و ہم آہنگی ہی تو دراصل اس دور کی زندگی ہے۔ ایران کے کجکلاہ خسرو اور ایک پتھر پھوڑا عاشق آجکل نہیں چل سکتا۔ حقیقت کچھ ہو یا نہ ہو۔ وضع قطع بول چال سے جنٹلمین ثابت کرنیکی ضرورت ہے۔ ظاہری شان تو بازار میں بکتی ہے۔ میں نے خریدلی۔ انگریزی پڑھنا مشکل تھا۔ نہ وقت نہ دل و دماغ۔ بس یہی سمجھ میں آیا کہ کچھ ایٹی کیٹ کے فقرے اور گنتی کے ضروری الفاظ یاد کر لئے جائیں۔ حافظ تو میرا آپ جانتے ہی ہیں۔ شاعر ہوں۔ دیوان کے دیوان ازبر ہیں۔ بیت بازی میں شہر بھر کو چیلنج کا دعویٰ ہے۔ چنانچہ سوسائٹی میں جتنے لفظ استعمال کئے جاتے ہیں سب میں نے سیکھ لئے۔

میں ۔ جیو نواب کلدم! تمہارا دم غنیمت ہے۔

نواب ۔ کوئی دعا دے یا کوسے۔ میری عمر پچاس سال بڑھ گئی۔ اور یہ سب جدید وضع کے عشق کا نتیجہ ہے۔ وہ ایک جگہ دل اٹکانا۔ دن بھر سر جھاڑ۔ منہ پھاڑ۔ پھٹے حال۔ بلکے دہاڑے جنگل سے شہر میں اور شہر سے جنگل میں وحشیوں کی طرح پھرنا۔ رات بھر ہائے کے نعرے لگا کر محلے والوں کی نیندیں خراب کرنا۔ رقیبوں کی کبھی خوشامد کبھی ان کی جان کا لاگو ہوجانا۔ دربدر کی ٹھوکریں کھانا۔ اوں ہوں۔ ایسی باتوں میں عمر کم ہوتی ہے۔ اب راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔

اشرف صبوحی دہلوی
(منشی فاضل)

زہری

ٹالی گنج کی سنسان سڑک پر رمزو اپنے خیالات میں کھویا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس کی زندگی بالکل بے کیف گذر رہی تھی۔ فیکٹری کی مشینوں کی طرح جہاں وہ کام کرتا تھا اس کی ہر صبح ایک طرح کی ہوتی جب وہ بستر سے اٹھتے ہی ہاتھ منہ دھو کر جمائی لے ہوٹل ۲ بسکٹ اور ایک پیالی چائے پی کر فیکٹری چلا جایا کرتا تھا اور ہر شام ویسی ہی بے رونق۔ جب وہ روزانہ اسی رستہ سے اسی وقت ویسے ہی خیالات میں گم اپنی بوسیدہ کوٹھڑی کو واپس ہوتا تھا۔ پچھلے دنوں کی یاد اس کی اس میکانکی زندگی میں کبھی کبھی مدھم کیفیتیں پیدا کر دیتی تھی۔ شاید وہ انھیں کے سہارے جی رہا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے گاؤں میں رہتا تھا کھیت پر اسے فیکٹری سے کم محنت نہ کرنی ہوتی تھی۔ جیٹھ کی دوپہر کی جھلستی ہوئی کرنیں اور جاڑے کی صبح کی برفانی ہوائیں اس کے ننگے جسم کو کام کی تھکاوٹ سے زیادہ مضمحل اور خستہ کر دیتی ہیں۔ لیکن اس وقت اسکی زندگی کا عمل کھیت کی کاوشوں تک محدود نہ تھا۔ ہر شام بیوی بچوں کے درمیان اس کی زندگی میں ایک نیا ابھار پیدا ہوتا تھا۔ ہر صبح وہ ایک نیا جنم لیکر بیدار ہوتا تھا۔ اس کی ننھی بچی، جو اب خود کئی بچوں کی ماں ہو کر اس سے الگ اپنی سسرال میں بس رہی تھی، اپنی بھولی بھالی صورت اور توتلی زبان سے اُسے ہر وقت سرمایۂ حیات بخشا کرتی تھی۔ وہ ہر شام فیکٹری سے لوٹتے ہوئے اس کی بھولی بسری صورت اور بچپن کی باتیں یاد کر کے کچھ دیر کو اپنے ماحول سے کھو جایا کرتا تھا۔ وہ اس وقت بھی تصور میں اس سے کھیل رہا تھا۔ ننھی بچی اس کی آنکھیں اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے ڈھانکے اس سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ کتنی پیاری اور کیسی سندر بچی تھی۔ یکایک ایک بچی کی جگر خراش چیخ نے اُسے پھر اپنے ماحول سے باخبر کر دیا۔ وہ سڑک کے کنارے لیمپ کے کھمبے سے لگی چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ رمزو اضطراری طور پر اس کے قریب پہونچ گیا۔ اور اس کے آنسو اپنے کُرتہ کے دامن سے پونچھنے لگا۔ "میرے باپ کو پولیس والے پکڑ کر لے گئے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ لوری پر چڑھنے لگی تو انھوں نے مجھے دھکے دیکر نکال دیا۔" زہری یہ کہکر پھر رونے لگی۔ رمزو کا دل درد محبت سے اُمڈ آ رہا تھا۔ برسوں کے بعد ایک بچی اسے اپنی فریاد سنا رہی تھی۔ اس نے اُسے تسلیاں دیں اور گود میں اٹھا کر اپنی کوٹھڑی میں لیگیا۔

زہری باپ کے جیل خانہ جانے کے بعد سے اس دُنیا میں اکیلی تھی۔ وہ دن بھر رمزو کا انتظار کرتی اور جب رمزو شام کو فیکٹری سے واپس آتا تو پہروں اپنے باپ سے قصے اس کے آگے دہرایا کرتی۔ رمزو کی تاریک زندگی کو چیرتی ہوئی روشنی کی ایک لہر دوڑنے لگی! رمزو کی ماضی میں کھوئی ہوئی بچی اُسے واپس مل گئی تھی۔ رمزو اب صرف مشین کے پُرزوں کی طرح حرکت نہیں کر رہا تھا بلکہ اس نے پھر جینا شروع کر دیا تھا۔ اب اس کی زندگی کا دائرہ فیکٹری کی حدوں سے زیادہ وسیع ہو گیا تھا۔ وہ زیادہ محنت سے کام کرتا تھا تاکہ اس کی تنخواہ میں کچھ اضافہ ہو جائے تو وہ زہری کی شادی کیلئے کچھ پس‌انداز کر سکے۔ وہ زہری کی شادی اپنے حوصلہ سے کرنا چاہتا تھا۔ اُسے دان جہیز بھی جی بھر کے دینے والا تھا۔

عام کساد بازاری نے سارے کاروبار ماند کر دیئے تھے۔ کتنی فیکٹریاں بند ہو گئیں۔ کتنے آدمی بیروزگار ہو گئے۔ انھیں میں رمزو بھی تھا۔ اس کی فیکٹری کافی نقصان اٹھانے کے بعد بند ہو گئی۔ وہ مہینوں تلاش روزگار میں کلکتہ کی گلیوں کی خاک چھانتا پھرا۔ لیکن اسے

کہیں کوئی کام نہ مل سکا۔ پس ماندہ جو کچھ تھا رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا۔ اور اس نے سوائے اپنے دیہات واپس ہوجانے کے اور کوئی چارہ کار نہ دیکھا۔

رمزو زہری کے ساتھ اپنے گاؤں واپس آگیا۔ اس کے مالک کھیت نے دوسرے کے ساتھ بندوبست کر رکھا تھا اس لئے وہ دوسرے کے کھیت پر مزدوری کر کے کسی طرح اتنا حاصل کر لیتا کہ اس کی اور زہری کی زندگی کٹ سکے۔ پھر دیہات میں کوئی ایسا خرچ بھی نہ تھا۔ زہری اب جوان ہو رہی تھی۔ اور رمزو کو اس کی شادی کی فکر تھی۔ یہ خیال اسے ہمیشہ افسردہ کر دیتا تھا کہ اس کی اپنی بیٹی کی طرح زہری بھی اس سے علیحدہ ہو جائیگی اور اس کی زندگی پھر بے کیف گذرنے لگے گی۔ لیکن زہری کی شادی اُسے کرانی ضرور تھی۔ زہری سے جب وہ اس کی شادی کے بارہ میں کہتا تو زہری رونے لگتی۔ اس کی سکھی جمن کو بیاہ کے بعد سے اس کا شوہر کبھی گھر نہ آنے دیتا تھا۔ وہ سمجھتی کہ اگر اس کا بھی بیاہ ہوگیا تو وہ پھر گھر واپس نہ آسکے گی۔ رمزو کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ زہری کے رونے پر اُسے کوئی تعجب نہ ہوتا تھا اس لئے کہ ہر کنواری لڑکی شادی کے نام سے رونے لگتی ہے۔ لیکن خود اس کا دل نہ چاہتا کہ زہری بیاہ کر کے اس سے چھن جائے۔ وہ بہت زیادہ متفکر رہنے لگا۔ زہری اس کی اُداسی کا سبب پوچھتی تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال دیتا۔ وہ ایک رات بہت دیر تک اسی اُدھیڑ بن میں پڑا جاگتا رہا۔ ایک طرف زہری کی علیحدگی کی تکلیف دوسری طرف ایک جوان کنواری لڑکی کو اپنے گھر میں بٹھائے رکھنے کی وجہ سے جگ ہنسائی کا خوف وہ انہیں خیالات میں غلطاں سو گیا۔ اس رات اس نے خواب میں ایک میلے کپڑے پہنے بوڑھے انسان کو اپنے سرہانے کھڑا دیکھا۔ بڈھا اس سے کہہ رہا تھا "تم زہری کی شادی کیلئے اتنے پریشان کیوں ہو۔ تمہارے گھر میں تو خود کوئی نہیں ہے۔ تمہیں اپنی خدمت کی ضرورت ہے زہری اگر بیاہ کر کے چلی جائیگی تو پھر تمہاری خدمت کون کریگا۔ زہری بھی تو تم سے الگ ہونا گوارا نہیں کرتی۔ تم خود زہری سے بیاہ کرلو۔ میری خوشی بھی اسی میں ہے۔"

رمزو کی آنکھیں کھلیں تو وہ بڈھے کی صورت پر غور کرنے لگا۔ اس کی شکل زہری کے باپ کے حلیہ سے ملتی جلتی تھی۔ زہری اپنے بچپن میں برابر رمزو سے اپنے باپ کی شکل و صورت کا خاکہ کھینچا کرتی تھی۔ "زہری کے باپ نے خواب میں مجھ سے زہری سے شادی کرنے کو کہا ہے۔" اسے بھی یہ بات مناسب معلوم ہوئی۔ وہ واقعی زہری سے شادی کر سکتا تھا۔ وہ بے چینی سے زہری کے اٹھنے کا منتظر تھا۔

"رات میں نے تمہارے بادا کو خواب میں دیکھا ہے۔" زہری اٹھی تو اس نے کہا۔

"میرے بادا کو!" زہری کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔

"ہاں وہ بہت دُبلے ہو رہے تھے۔ کمر سے کچھ جھکی ہوئی......"

"اور سر کے بال بھی اُڑے ہوئے ہونگے۔" زہری نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں ان کی سر پر بال نہ تھے۔" رمزو نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے، سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر اُن سے کچھ باتیں بھی ہوئیں؟ وہ مجھ کو پوچھتے تھے؟ میں بھی انھیں پہلے خواب میں بہت دیکھا کرتی تھی۔ لیکن اب میں صرف اُلٹی پلٹی باتیں دیکھا کرتی ہوں۔ بادا کو کبھی نہیں دیکھتی۔"

"ہاں باتیں ہوئیں تمہارے بیاہ کے بارے میں۔"

"لیکن میں تو بیاہ نہیں کروں گی۔ بادا بیاہ کو کہتے تھے؟" زہری نے آنکھیں نیچی کرتے ہوئے سوال کیا۔

"لیکن تمھارے باوا تو کہتے تھے کہ تمھیں بیاہ کرنا چاہیئے۔"

"مگر پھر میں یہاں کیسے آسکوں گی؟"

"وہ کہتے تھے کہ تم بیاہ کر کے یہیں رہو۔"

"لیکن جگنی بہن کا میاں تو اسے کبھی گھر آنے نہیں دیتا۔"

"تم ایسے سے بیاہ نہ کرو جو تمھیں یہاں سے کہیں لیجائے۔"

"تو پھر باوا کس سے کہتے تھے۔" اس نے لجاتے ہوئے سوال کیا۔

"ہم سے۔" رمزو نے رُک رُک کر کہا۔ اس کی آواز میں ارتعاش تھا۔ آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہو رہی تھی۔ اور چہرے پر جوانی کی سی شگفتگی۔ وہ کسی نامعلوم جذبہ سے مغلوب ہو رہا تھا۔ زہری شرما کر اس کے پاس سے چلی گئی۔ اُسے رمزو کی یہ بات بہت اچھی معلوم ہوئی۔ خاصکر جبکہ اس کے باوا نے کہا تھا۔ وہ خوش تھی کہ جگنی کی طرح اُسے گھر سے علیحدہ نہ ہونا پڑے گا۔

رمزو نے زہری سے بیاہ کرلیا۔ زہری کی طرف سے اب اس کے جذبات ایک دم مختلف تھے۔ ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا۔ زہری اب اس کی بیاہتا بیوی تھی لیکن زہری میں کوئی تبدیلی نہ پیدا ہوئی تھی۔ وہ اب بھی رمزو کی خدمت اور خاطرداری میں اسی طرح مستعد رہتی۔ جب تک رمزو کو کھلا نہ لیتی خود کبھی نہ کھاتی۔ رات گئے دیر تک رمزو کے بدن میں تیل مالش کرتی رہتی۔ رمزو کبھی بیمار پڑتا تو رات رات بھر اس کی دیکھ بھال میں اپنی نیند حرام کردیتی۔ اب بھی رمزو کے علاوہ دنیا میں اُسے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ بستی میں آمد و رفت اس کی بہت کم تھی۔ وہ بھی رمزو کے اصرار سے۔ ورنہ جب تک رمزو گھر میں رہتا وہ اس کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہتی۔ اور جب وہ کھیت چلا جاتا تو گھر کے کام دھندے میں لگ جاتی۔ رمزو کی جنسی طلب کی تسکین میں وہ کبھی کوئی تامل نہ پیش کرتی۔ لیکن بالکل اس طرح جیسے وہ اس کی کوئی خدمت انجام دے رہی ہو۔ یکسر بے اثری کے ساتھ۔ رمزو اکثر اس سے زوجین کے تعلق کے مناسب چھیڑیں کرتا تو زہری اس کے سمجھنے سے قاصر رہتی۔ جیسے وہ قطعاً جنسی تاثرات سے خالی تھی۔ رمزو کی جوانی کی یادگار بجھتی ہوئی چنگاریاں مشتعل ہو اُٹھتیں لیکن زہری کے شباب کا شعلہ کبھی نہ بھڑکتا۔ جیسے اس کا شباب جوانی کا ایک مُردہ بُت تھا۔ زندگی کی حرارت سے محروم۔

گاؤں کے سب سے بڑے گرہست پیرو میاں کا جوان لڑکا جوہر، جو شہر میں تعلیم حاصل کرتا تھا، تعطیل کے موقع پر گھر آیا ہوا تھا۔ زہری اس کے گھر کے کنوئیں سے پانی لانے جایا کرتی تھی۔ جوہر کی آنکھیں زہری سے چار ہوگئیں۔ زہری کا شباب اور اس کا سادہ اور بے بناوٹ حُسن اس کی نظروں میں گڑ گیا۔ اسے یقین کامل تھا کہ زہری کا حصول اس کیلئے معمولی بات تھی۔ زہری جوان تھی اور تندرست پھر کوئی وجہ نہ معلوم ہوتی تھی کہ اس کی توجہ کے بعد بھی زہری رمزو سے وابستہ رہ سکے۔ زہری روز اس کے یہاں پانی لانے جایا کرتی تھی۔ اُس نے رفتہ رفتہ زہری سے کچھ ملاقات پیدا کرلی۔ زہری اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں بغیر کسی جھجک کے کیا کرتی۔ لیکن جوہر نے کبھی اس کی گفتگو میں کوئی لگاوٹ کی بات نہ پائی۔ وہ سمجھتا تھا کہ بے تکلفی بڑھنے کے بعد زہری آپ ہی اس کے آگے اپنے شباب کی بربادی کا دُکھڑا روئیگی۔ اور وہ اس کی مدد کیلئے ہاتھ بڑھا کر آسانی سے اُسے اپنا بنا لیگا۔ جوہر کو اپنی بلند قامت جوانی کی دلفریبی پر بھی کامل بھروسہ تھا۔ "کیا اس کا مردانہ حُسن زہری کے دل میں ویسی ہی تڑپ نہ پیدا کرسکے گا جیسی تڑپ اس کے دل میں زہری کی اُٹھتی جوانی نے پیدا کردی تھی۔" جوہر زہری کی ادھر

اُدھر کی باتوں میں گھما پھرا کر رمزو کے متعلق اس کے خیالات کی ٹوہ لیتا۔ لیکن اُسے کبھی کوئی قابلِ اطمینان جواب نہ ملتا۔ بلکہ زہری کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا کہ زہری رمزو سے بہت زیادہ وابستہ تھی لیکن جوہر کا دل کبھی اس حقیقت کو تسلیم کرنیکو طیار نہ تھا۔ زہری کی ہر"ہاں" کو وہ "نہیں" سمجھنے پر مجبور تھا۔ عورت کی متضاد اور پُر اسرار فطرت کا دلائل سے زیادہ اس کے تاثرات اُسے یقین دلا رہے تھے۔ ہماری عقل کس درجہ ہماری خواہشوں کی غلام ہے۔ عموماً ہمارے دلائل ہمیں انھیں فیصلوں کی طرف لیجاتے ہیں جن کی حقیقت تسلیم کرنیکو ہمارا جی چاہتا ہے۔ بلکہ اتنا ہی نہیں، ہماری حسیات پر بھی ہماری خواہشوں کی حکومت ہے۔ ہماری نظر زیادہ انھیں چیزوں پر پڑتی ہے جن سے ہماری خواہشوں کی تسکین ہوتی ہے۔ دوسری چیزوں کیلئے بسا اوقات ہم آنکھ رکھتے اندھے ہو جاتے ہیں۔

جوہر کنویں کے نزدیک کھڑا تھا۔ اس دن زہری بہت دیر کرکے پانی لینے آئی تھی۔

"کیوں آج تم بہت دیر سے آئیں؟" اس نے کہا۔

"ہاں آج کھیت پر نہیں گئے ہیں۔ طبیعت کچھ سست ہے۔ بید جی کے ہاں دوا لانے چلی گئی تھی۔ وہاں بھیڑ بہت تھی۔ دیر تک ٹھیرنا پڑا۔"

"ارے رمزو میاں بیمار ہو گئے ہیں؟ کیا ہوا ہے؟ آخر بیچارے بوڑھے بھی تو ہو لئے۔ طبیعت کب تک ٹھیک رہے۔ مجھے تو تمھاری جوانی پر ترس آتا ہے۔" جوہر نے ہمدردانہ الفاظ میں کہا۔

زہری نے ناگن کی طرح اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت اور غصہ ٹپک رہا تھا۔ "بوڑھے ہیں تو کیا۔ میں اُن کے آگے جوانوں کو چولھے میں جھونک ڈالوں۔" اس نے برہمی سے کہا اور تیزی سے پانی کا گھڑا سر پر اٹھا کر چلی گئی۔

جوہر رفتہ رفتہ زہری کے انداز میں حقیقت کا عمل محسوس کرنے لگا۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک شکوک کے گھروندے میں بند رہنے کی تاب نہ رکھتا تھا۔ وہ زہری سے اپنے سوال کا فیصلہ کن جواب مانگنا چاہتا تھا۔

زہری کچھ رات گئے بستی میں ایک جگہ تقریب کی شرکت سے واپس آرہی تھی۔ وہ اتنی دیر تک گھر سے باہر رہنے کی عادی نہ تھی۔ لیکن رمزو نے اسے باصرار وہاں بھیجا تھا۔ اور رسومات کی تکمیل پر واپسی کی تاکید کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ زہری بستی والوں سے شیر و شکر ہو جائے تاکہ اس کے بعد وہ خود کو بالکل بے پناہ محسوس نہ کرے۔ جوہر موقع کا منتظر تھا۔ وہ زہری سے کچھ فاصلہ پر اس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ چاندنی رات تھی؛ ہوا تیز چل رہی تھی۔ زہری تیزی سے قدم بڑھائے آرہی تھی۔ اس کے سر کا آنچل گر کر ہوا میں اڑ رہا تھا۔ اس کا سینہ اپنے تناسب کا مقابلہ چاند سے کر رہے تھے۔ چاند کا پورا عکس اس کے چہرہ پر پڑ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاندنی کرنیں اس کے شباب کی تصویر پر آخری قلم پھیر رہی تھیں۔ فضا کی سحر آگینی نے جوہر کے آتش شوق کو بھڑکا دیا تھا۔ وہ کھلے لفظوں میں اپنے سراپا سی زہری کے سامنے اپنا سوال پیش کرنیوالا تھا۔ اس نے قدم تیزی سے بڑھایا۔ اور زہری کے آگے اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا بلند و بالا قد اور چوڑا چکلا سینہ چاندنی کی فیاض ضیا پاشی میں اور زیادہ دلکش ہو رہا تھا۔ اس نے بڑھکر زہری کا ہاتھ پکڑ لیا۔ زہری بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اس سے دست و گریبان ہو گئی۔ چاندنی کی بسیط لطافت بھی اس کی خشم آلود نگاہوں کو جذب نہ کر سکی۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ جوہر کی گرفت دفعتاً ڈھیلی ہو گئی۔ اس کے جذبات کے ہیجان میں سکون پیدا ہو گیا۔ زہری اپنا ہاتھ اس سے چھڑا کر آخری بار پیچ کر

نگاہوں کی آگ اس پر برساتی ہوئی تیزی سے آگے نکل گئی۔

جوہر غیرت سے عرق عرق ہو رہا تھا۔ زہرہ کی وفا شعاری اور پاکبازی اُسے مثالی معلوم ہونے لگی۔ اس کے دل میں زہرہ کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا۔ وہ اُسے ایک مقدس دیوی تصور کرنے لگا۔ جس نے پاکبازی اور عصمت مآبی کی مثال قائم کرنے کیلئے دنیا میں جنم لیا تھا۔ زہرہ کیلئے اس کے دل میں ایک پاک جذبہ بیدار ہو گیا۔

رمزو کئی ماہ بیمار رہکر سدھار گیا۔ زہرہ نے اس کی جان توڑ خدمت کی۔ رمزو کی موت اس کیلئے ایک حادثہ عظیم تھا۔ اس دُنیا میں اس کا کوئی سہارا نہ تھا۔ جوہر نے اپنی ماں سے کہہ کر اسے اپنے گھر بلوا لیا۔ زہرہ پیرو میاں کے گھر رہنے لگی۔ اور رفتہ رفتہ رمزو کو بھولنے لگی۔ اس کی کافر جوانی اب تک ویسی ہی باقی تھی۔ لیکن اس کے انداز میں ایک نمایاں تغیر پیدا ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اس کی بے پناہ جوانی سے اُسے باخبر کر دیا تھا۔ اس کے حسن میں احساس کے ساتھ شوخی پیدا ہو گئی تھی۔ جو دیکھنے والی نگاہوں کو گناہ کی ترغیب دینے لگی تھی۔ وہ اپنی طرف اُٹھتی ہوئی نگاہوں کا استقبال اپنی نیم وا آنکھوں کی سحر آفریں جنبش اور لبوں کی ایک معنی خیز مُسکراہٹ سے کیا کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے شباب کی پُرسکون دُنیا میں یکبارگی ہل چل سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنے دل میں جوہر کیلئے ایک تڑپ محسوس کرنے لگی تھی۔ ایسی منظر آگیں تڑپ جو پہروں اسے چھُپ چھُپ کر دیکھنے کیلئے مجبور رکھتی۔ لیکن جوہر کے دماغ پر زہرہ کی بابت ایسا حُسن ظن چھایا ہوا تھا کہ زہرہ کی انداز کا انقلاب اسے سوجھائی نہ دیتا تھا۔ زہرہ چاہتی تھی کہ اپنے دل کی ساری باتیں کہہ ڈالے۔ اس کی آرزو تھی کہ جوہر پھر للچائی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھے اور وہ خود کو اس کے تصرف میں وقف کر دے۔ لیکن اس کی امید بر نہ آئی تھی۔ اس کا اُمڈتا ہوا شباب اس کی اس مجبوری کے آگے کب تک تھم سکتا۔ اس نے ایک دن جوہر پر افشائے راز کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ صرف اسی قدر نہیں بلکہ جوہر کے سامنے اپنے سارے جذبات عُریاں کر دینے کا۔ جوہر کی جوانی کے آگے اپنی جوانی کا تحفہ پیش کرنے کا۔ اس نے اس ارادہ سے جوہر کے کمرے کی طرف قدم اٹھایا لیکن دروازہ پر پہنچتے ہی ٹھٹک گئی۔ اُسے جوہر پر اپنی خشمگیں نگاہیں یاد آگئیں۔ شاید جوہر کی آنکھیں اس پر ویسی ہی چنگاریاں برسانے لگیں۔ وہ اُلٹے پاؤں واپس ہو گئی۔

اس نے کئی بار اس قسم کی کوشش کی۔ لیکن ہر دفعہ اس کا قدم آگے بڑھنے سے قاصر ہو جاتا۔

اس کی اندرونی کیفیات کا سمندر رفتہ رفتہ پُرہیجان ہو گیا کہ اس کی روک تھام اس کے قابو سے قطعاً باہر ہو گئی اور وہ ایک رات اضطراری طور پر جوہر کے کمرے میں گھس آئی۔ اس کے سارے بدن میں رزش تھی۔ چہرہ سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور گالوں کا گلابی پن اور تیز ہو گیا تھا۔ جوہر روشنی سامنے رکھے ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھکر وہ یکبارگی اٹھکر کھڑا ہو گیا۔

"کیوں زہرہ خیر تو ہے؟ تم ایسی گھبرائی ہوئی کیوں نظر آرہی ہو؟" جوہر نے گھبراتے ہوئے یہ سوال کیا۔ زہرہ نے جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن الفاظ حلق میں پھنس کر رہ گئے۔

"آخر بولو تو کیا معاملہ ہے؟ تم اس وقت یہاں کس لئے آگئیں۔ کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟"

"ہاں" زہرہ نے مشکل سے ادا کیا۔

"کونسا؟ لیکن تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ چلو باہر چل کر باتیں کریں۔"

"نہیں۔"

"یعنی؟"

"یہیں ٹھیرو۔"

"یہاں ٹھیرنا بے موقع ہے۔"

"ہونے دو۔"

"زہری! تمھیں کیا ہوگیا ہے؟ میں کچھ سمجھ نہیں سکتا۔ مجھے یہاں سے چلا جانا چاہئے۔"

جوہر دروازہ کی طرف بڑھا۔ زہری نے اس کا راستہ روک لیا۔

"زہری! یہ کیا معاملہ ہے؟"

"تم نہ جاؤ۔" زہری نے ملتجیانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تم کہو نہ، کیا کہنا ہے؟"

"میں کچھ کہنے نہیں آئی ہوں۔" زہری نے نیچی نظریں کئے ہوئے جواب دیا۔

"مگر، مگر میں باہر جاتا ہوں۔" جوہر نے یہ کہتے ہوئے تیزی سے قدم دروازے کے باہر بڑھایا۔ اور چلا گیا۔

دوسرے دن زہری جوہر کے گھر سے اُٹھ آئی۔ اس کی جوانی کا سوداکرنے والے بستی میں کتنے ہی تھے۔ اسے ان سب کے یہاں پناہ مل سکتی تھی۔ ان سبھوں میں اس کی نظرِ انتخاب ارزانی پر پڑی۔ ارزانی عرصہ سے اسے اپنی طرف مائل کرنیکی کوشش کر رہا تھا۔ رستہ میں جب مڈبھیڑ ہوجاتی تو اس سے طرح طرح سے چھیڑ بس کرتا۔ زہری اس کی چھیڑوں میں گدگدی ضرور محسوس کرتی۔ لیکن وہ اُسے اس قابل نہ سمجھتی تھی کہ اس کی طرف التفات کرے۔ وہ تاڑی بہت پیتا تھا۔ اور اکثر نشہ کی حالت میں آپے سے گذر جایا کرتا تھا۔ لیکن جوہر کے آگے اپنی شکست محسوس کرنے کے بعد ارزانی کے سارے عیوب اس کی نظروں سے غائب ہوگئے۔ اور اس نے خود کو اس کے حوالہ کرنیکا فیصلہ کرلیا۔ زہری ارزانی سے نکاح کرکے اس کے ساتھ رہنے لگی۔ ارزانی کی تاڑی کی صحبتوں میں جوار بھر کے منچلے شریک ہوتے تھے۔ زہری کو ان کی چھیڑوں میں بہت زیادہ لذت محسوس ہونے لگی۔ اور رفتہ رفتہ اس نے اپنی جنسِ گراں بہا کا سودا ان سبھوں کے ساتھ کرنا شروع کر دیا۔ اس کا یہ بیوپار کسی مالی منفعت کے لئے نہ تھا۔ اس لئے اُسے خریداروں کی کمی نہ ہوئی۔ وہ ان سبھوں کو شادکام کرنا چاہتی تھی اس لئے کہ اسکی اپنی مسرت وتسکین کا راز اسی میں مضمر تھا۔

زہری کی اس روش کا نتیجہ ظاہر تھا۔ بہت جلد اس کے گاہکوں نے اس کے حُسن کا خزانہ خالی کر دیا۔ اور اس کے چہرے کی ساری مٹھاس چوس لی۔ وہ قبل از وقت بوڑھی معلوم ہونے لگی۔ اس کے قدردان ایک ایک کرکے اس سے علیحدہ ہوگئے۔ لیکن زہری اب تک تشنہ کام تھی۔ اس کے جنسی بہاؤ کا سیلاب اب تک اُمڈ آرہا تھا۔ اس نے اپنے گاہکوں کو جمع کرنے کے لئے ہر غیر فطری طریقہ اختیار

کیا۔ لیکن بے سُود۔ یہاں تک کہ اُسے اپنی تسکین کے لئے کسی دوسرے کی حاجت باقی نہ رہی۔

وہ اب پاگل خانہ میں بند ہے۔ اپنے جسم پر کوئی کپڑا نہیں رہنے دیتی۔ اور اپنے عُریاں اعضاء کی طرح طرح سے نمائش کر کے ہنسی کے لاانتہائی سلسلوں میں کھو جایا کرتی ہے۔

محسن عظیم آبادی

ایک طالب علم کی سرگذشت

زندگانی وقف کر کے زندگانی کے لئے
تشنۂ آبِ بقا نکلا ہے پانی کے لئے

تنگدستی ہم سفر ہے پاس سرمایہ نہیں
دوپہر کا وقت ہے کوسوں کہیں سایہ نہیں

راستہ دشوار، گرمی سخت، منزل دُور ہے
کہہ رہا ہے دیکھئے قدرت کو کیا منظور ہے

وائے ناکامی شکستہ دل کی ہمّت توڑ کر
دن بھی رخصت ہو گیا جنگل میں تنہا چھوڑ کر

اک بیک لیلیٰ شب زلفوں کو بکھرائے ہوئے
سمتِ مشرق سے چلی آغوش پھیلائے ہوئے

دیکھتے ہی دیکھتے ہر سو اندھیرا ہو گیا
پُر سکون آغوش میں آوارہ منزل سو گیا

پھر قریبِ صبح یہ کہتی ہوئی آئی صبا
اُٹھ مرے پیارے مُسافر اُٹھ سویرا ہو گیا

صبح کا پیغام پا کر پھر شکستہ دل چلا
بیخودی میں طالبِ منزل سوئے منزل چلا

راستہ طے کر رہا تھا اپنی دُھن میں بے خبر
سامنے اک علم کا دریا اُسے آیا نظر

تشنہ لب کو دیکھکر دریا میں طغیانی بڑھی
موج لیکر ساغرِ بلّوریں پانی بڑھی

دُور سے پیاسے مُسافر کو صدا دیتی ہوئی
سامنے اک لہر آئی کروٹیں لیتی ہوئی

بڑھ کے پیاسے سے ہوئی اس طرح محوِ گفتگو
چاہیئے لعل و گہر یا واقعی پیاسا ہے تُو

یوں دیا پیاسے نے اسکی بات کا ہنس کر جواب
لعل ہے ناچیز وزن، علم روشن آفتاب

جہل کے دھبّوں سے دل کا آئینہ بیکار ہے
اس لئے تھوڑا سا پانی علم کا درکار ہے

ہاں فقط مجھ پر تری چشمِ عنایت چاہیئے
راہ گم کردہ ہوں اک شمعِ ھدایت چاہیئے

کہہ کے یہ آگے بڑھا پھر تھم گیا یہ دیکھکر
دھیمی دھیمی روشنی پھیلی ہے سطحِ آب پر

دیکھکر یہ ماجرا حیرت زدہ تھرّا گیا
لڑکھڑائے پیر اور دریا کے اندر آ گیا

اُف تھپیڑوں پر تھپیڑے بے خطا کھاتا ہوا
بہہ چلا دریا میں سر موجوں سے ٹکراتا ہوا

اب نہ وہ لہریں تھیں باقی اور نہ وہ تصویر تھی
دُھندلی دُھندلی سامنے قسمت کی اک تحریر تھی

دیکھکر قسمت کا لکھا ناتواں رونے لگا
آبِ دریا میں اضافہ دم بدم ہونے لگا

لہر گیا اِک برق تھی محسن جو پنہاں ہو گئی
آرزو بنکر اٹھی تھی یاس بنکر کھو گئی

محسن اعظمگڈھی

ایک ایکٹ کا ڈرامہ:۔

پیامبر

افراد

پیرامس ـــــــــ اسکندریہ کا حکمراں

بیلروفان ـــــــــ پیرامس کا دوست

بنت وردہ ـــــــــ پیرامس کی محبوبہ

درباری سپاہی، نوکر چاکر وغیرہ

....

قصہ ـــــــــ فرضی

مقام ـــــــــ قدیم شہر اسکندریہ

زمانہ

جب کھیتوں اور چراگاہوں میں گڈریئے، کسان بانسریوں اور الغوزوں کی تانیں اڑایا کرتے، راتوں کو یونانی اُمرا، کوچوں پر دراز مصری کنواریوں کے رقص کا لطف اٹھایا کرتے، بربط اور دف کے ساتھ تروجہ کی لڑائی، یولی سز کے کارنامے، اجیلین کی بہادری کے قصے دہرائے اور گائے جاتے تھے۔ جب تماشے کے منڈپ میں بیشمار تماشائی اکٹھے ہوتے، محفلیں جمتیں، دعوتیں اڑتیں، بحث مباحثے ہوتے ـــ غرض یہ تھا وہ زمانہ!

منظر اوّل

وقت ـــــــــ صبح

کشادہ اور صاف ستھرے بازار میں خوب چہل پہل ہے۔ کنعانی، قرطاجنی اور یونانی تاجروں میں خرید و فروخت کا بازار گرم ہے کنجوس مکھی چوس یہودی لمبے لمبے چغے پہنے لوبان اور کئی اقسام کی خوشبوئیں بیچ رہے ہیں۔ بالوں کی کنڈلیاں چربی سے جمائے۔ اور انھیں شتر مرغ کے پروں سے سجائے حبشی لڑکیاں کھجور کے پتوں کے پنکھے بیچتی پھر رہی ہیں۔ ناچنے والیاں سُرمہ کا جل لگائے چند بھکیروں کے حلقہ میں تھرک تھرک کر ناچ رہی ہیں۔ یونانی نوجوان جنھیں فنونِ جنگ کی مشق، کسرت کشتی اور سیر و شکار کے سوا کچھ شغل نہیں مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اِدھر اُدھر گشت کر رہے ہیں۔ اور مصری دوشیزائیں جن کو افزائش حُسن کے سوا کوئی کام نہیں گھونگے کی راکھ اور بھیڑ کے سینگ کا سفوف جسم پر مل کر اور پھر زیتون کے تیل سے غسل کر کے دریچوں سے جھانک رہی ہیں۔ اس وقت ایک خوش رُو نوجوان گھوڑے پر سوار بازار میں داخل ہوتا ہے۔ اس کا سفید رنگ کا تیز و تند گھوڑا طاؤس کی طرح گردن اٹھا اٹھا کر رُکتا جھجکتا، اور اِتراتا ہوا چلتا ہے۔ ایک حسین رقاصہ لب سڑک پتھر کے کوچ کے سہارے کھڑی ہے۔ وہ نوجوان اس کے پاس آ کر ٹھہر جاتا ہے۔

نوجوان:۔ حسینہ! کیا آپ بتلاسکتی ہیں کہ اِس وقت عالیجاہ شاہ پیراستس سے ملاقات کس جگہ ہوسکتی ہے؟

رقاصہ:۔ (مسکراکر) معاف کیجیئے گا میں تو جناب کا ٹھاٹھ دیکھ کر سمجھے بیٹھی تھی کہ آپ ہمارے پاس تشریف لارہے ہیں۔ کیونکہ آپ جیسا کونسا خوبرو نوجوان ہوگا جو ہم سے ملاقات کرنے کا خواہش مند نہیں، اور جو ہمارا رقص دیکھنے کیلئے بیقرار نہیں، آپ تو اجنبی معلوم ہوتے ہیں، مگر میں دیوتاؤں کی قسم کھاکر کہتی ہوں کہ اسکندریہ میں کسی نے آپ سا حسن نہیں پایا۔ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

نوجوان (کچھ شرماکر) میں کافی دُور سے آرہا ہوں۔ عالی جاہ کے لئے ایک اہم پیام لایا ہوں۔

رقاصہ۔ اے حسین نوجوان! تم محبّت کے سوا اور کیا پیام دے سکتے ہو، تم عشق کو حسن کی بیقراری کا پیام دینے تو نہیں آئے ہو؟

نوجوان۔ نہیں اے حسینہ! میں صرف اس قدر بتاسکتا ہوں کہ میں ایک ایسا رنجدہ پیام لے جارہا ہوں جس سے ممکن ہے تمام شہر پر حُزن وملال کے بادل چھاجائیں۔

رقاصہ۔ تو یقیناً دشمن بہت نزدیک آچکے ہوں گے۔ مگر دیکھئے نا! یہاں تو بچاؤ کی کوئی تدبیر ہی نہیں کی جارہی (قریب آکر اور نوجوان کا ہاتھ تھام کر) اس میں ایک بھید ہے (اِدھر اُدھر دیکھکر رازدارانہ لہجہ میں) عالی جاہ جنگ میں جانے سے کتراتے ہیں، آپ ہی کہیئے کہ بھلا جب عالی جاہ سا سالارِ جنگ لومڑی کی طرح دبک کر بیٹھا ہو تو پھر سلطنت تباہی سے کیونکر بچ سکتی ہے؟

نوجوان۔ میں نے سُنا ہے کہ عالیجاہ ایک بیمثل ـــــ

رقاصہ۔ آپ نے ٹھیک سُنا ہے۔ عالیجاہ سا شیر نر بردۂ دُنیا پر نہیں لیکن (اور قریب ہوکر) افواہ ہے کہ ان کے دل پر ایک کافر جمال حسینہ ......

نوجوان:۔ (بات کاٹ کر) مجھے رستہ بتادیجئے۔

رقاصہ:۔ (دلفریب انداز سے) کچھ دیر غریب خانہ پر آرام فرمائیے

نوجوان:۔ (ہاتھ چھڑا کر) میں ان باتوں کے سننے کا بھی عادی نہیں ہوں۔

رقاصہ:۔ ایک قدم ہٹ کر) اتنی خفگی؟

نوجوان:۔ (بےچینی سے) اگر آپ ایک پردیسی کو رستہ نہ بتاسکتی ہوں تو اسے دق کرنے سے کیا حاصل؟

رقاصہ۔ (ادا سے) اچھا جی! تو ذرا ادھر دیکھئے۔

(نوجوان اس کی طرف دیکھتا ہے)

رقاصہ:۔ (جیسے شرم کے مارے زمین میں گڑی جارہی ہو) اجی ہماری طرف نہیں۔ (اشارہ کرکے) اُدھر دیکھئے۔

(نوجوان جھینپ جاتا ہے)

رقاصہ:۔ سیدھے چلے جائیے۔ وہاں آپ دیوتا مرکری کا مجسمہ دیکھیں گے۔ مجسّمہ کے جس ہاتھ میں نقرئی ڈنڈا ہو بس ادھر ہی گھوم جائیے۔ آگے پتھر کا ایک ابوالہول۔ اس ابوالہول کے داہنے پہلو پر کھڑے ہوکر دیکھیں گے تو دُور سنہری بُرجیاں دکھائی دیں گی بس وہیں پہنچ جائیے گا۔

نوجوان:۔ (سر کو قدرے خم دیکر) شکریہ!

رقاصہ:۔ (شوخی سے مسکراکر) شکریہ ادا کرنا ہو تو بعد فرصت ہمارے غریب خانہ پر تشریف لائیے گا۔ وہ سامنے جہاں شمعدانوں پر موم جما نظر آتا ہے۔

[نوجوان شاید دل میں اسکندریہ کی بیباک دوشیزاؤں کو کوستا ہوا، مگر بظاہر کھسیانا سا ہوکر گھوڑے کو ایڑ دیتا ہے اور ہوا ہو جاتا ہے۔]

منظر دوم

شاہی محل کا دالان

وقت ـــــ صبح سے کچھ بعد

جگہ بجگہ خوبصورت پھول کھلے ہوئے ہیں۔ انگور کی بیلیں بل کھاتی ہوئی تانبے کے ابوالہول پر چڑھ آئی ہیں اور انگوروں کے گچھے ابوالہول کی پیشانی پر لٹکے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کسی نے دولھا کے سہرا باندھ دیا ہو۔ ایک طرف ہرکلیز کا دیو قامت مجسمہ ہے جس کے پاؤں سبز کائی سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ پاس ہی چھوٹے سے تالاب میں مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ جب سطح آب پر ابھرتی ہیں تو تیز دھوپ میں چمک کر عجب منظر پیدا کرتی ہیں۔ دروازہ کے آگے پتھر کی میز پڑی ہے۔ جس پر انگور بکھرے ہوئے ہیں، سرکہ پھیلا ہوا اور شراب کی صراحی الٹی ہوئی ہے۔ پاس ہی کئی فوجی افسران خاموش بیٹھے ہیں۔ گویا سب کسی گہرے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اتنے میں بیلروفان داخل ہوتا ہے۔ پھر وہ مختصر سی سیڑھیاں طے کر کے سب کے پاس آ کھڑا ہوتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے پھر ایک شخص اٹھتا ہے۔

وہ شخص:۔ اے بیلروفان! عالی جاہ آمادہ نہیں ہوتے۔ ہزار سر پٹکا مگر سب بے سود۔

بیلروفان:۔ (ماتھے پر بل ڈال کر اور اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دیکر خاموش رہتا ہے)۔

وہ شخص:۔ ہم نے عرض کی کہ حضور کی قوم، حضور کی سلطنت، حضور کی آزادی سب خطرہ میں ہیں۔ جو غلام ہیں وہ حکمراں اور جو حکمراں ہیں وہ غلام ہو جائیں گے۔ ہماری عورتوں کی بیحرمتی ہوگی، ہماری عزت، ہماری دولت، ہماری شوکت، ہماری تہذیب و تمدن سب پر پانی پھر جائیگا۔ آنیوالی نسلیں ہم پر لعنت بھیجیں گی ——— مگر وہ خاموش رہے۔

بیلروفان:۔ تم نے سب کچھ کہا مگر جو بات کہی جانی چاہئے تھی وہ پھر بھی نہ کہی۔

[یہ کہہ کر بیلروفان دروازہ کی طرف لپکتا ہے اور جھپٹ کر دروازہ کھول دیتا ہے۔ حاضرین ہیچ کر اُسے روکنے کیلئے آگے بڑھتے ہیں مگر آگے نوجوان شاہ پیراس کھڑا نظر آتا ہے۔ بلند قامت وجیہہ اور غیر معمولی طور پر جوان ——— کچھ دیر کیلئے موت کی سی خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔]

ایک شخص:۔ (آگے بڑھکر) عالی جاہ! . . . .

(پیراس ہنٹر اس کے منہ پر مارتا ہے اور وہ اپنا منہ پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے)

پیراس:۔ (بیلروفان کی طرف بڑھتے ہوئے) کیوں؟ وہ کونسا بھید ہے جو تجھے معلوم ہے اور دوسروں کو معلوم نہیں، وہ کیا بات تھی جو کہی جانی چاہئے تھی اور نہیں کہی گئی۔

(بیلروفان دو قدم بڑھکر ایک سپاہی کی طرح سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے)

بیلروفان:۔ (مضبوط آواز میں) حضور ملک کی آزادی، اپنی عزت اور قوم کی ناموس کا پنڈورہ کی محبت کو ترجیح دے رہے ہیں۔

(معاً ایک سپاہی کا داخلہ)

سپاہی:۔ (آداب بجالا کر) جہاں پناہ! ایک پیامبر حاضر خدمت ہونیکی اجازت چاہتا ہے۔

پیراس۔ آنے دو۔

(وہی خوشرو جوان آکر آداب بجالاتا ہے)

پیراس:۔ (خندہ پیشانی سے) اے حسین نوجوان! تو کون ہے؟ ہم کو شک ہے کہ ہم نے تجھے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

نوجوان۔ میرے عالی جاہ! حضور نے بندہ کو ضرور دیکھا ہوگا۔ آپ کا یہ خادم . . . .

(کھانس کر خاموش ہو جاتا ہے)

پیرامس: (گردن اٹھا کر حاضرین سے) ہاں! ... ہم ...... تنہائی چاہتے ہیں۔

(سب کی روانگی)

نوجوان: (ادب سے مسکراتے ہوئے) عالی جاہ! یہ غلام پندورہ کا نزدیکی رشتہ دار ہے۔ حضور رات کو جب ہمارے گاؤں میں آیا کرتے تھے تو ممکن ہے اس وقت حضور کی نظر بندہ پر پڑ گئی ہو۔

پیرامس: (خوش ہو کر) تو تم پندورہ کے پاس سے آئے ہو۔ ہم سے اس نے کبھی تمھارا ذکر بھی نہیں کیا۔ آؤ، آگے آؤ ہمارے عزیز نوجوان، ہمارے پاس بیٹھو، یہاں بیٹھو، جس طرح جی چاہے بیٹھو۔ اب بولو، کہو ہماری پندورہ نے کیا کہا ہے۔ وہی بات کہو، وہی الفاظ کہو جو پندورہ کے منہ سے نکلے تھے۔

نوجوان: (افسردگی سے) اے جہاں پناہ! میں کچھ اچھی خبر نہیں لایا۔ یہ بہت ہی منحوس خبر ہے۔

پیرامس: (نوجوان کا ہاتھ تھام کر) ہمارے ہوش گم ہو رہے ہیں۔ ہم نہیں جانتے تم کیا کہنے والے ہو۔ مگر کہو ــ ہم سُنیں گے۔

نوجوان: (آنکھوں میں آنسو بھر کر) میرے آقا! اگر خادم کی جان بخشی ہو جائے تو ....

پیرامس: کہو اے نوجوان، تمھاری جان ہماری ہے۔ تم پندورہ کے بھیجے ہوئے ہو۔

نوجوان: (رو کر) رات پندورہ دریائے نیل میں ڈوب گئی اس نے خودکشی کر لی۔

پیرامس: (حیرت اور تاسف سے) خودکشی ......؟ (الفاظ گلے میں اٹک جاتے ہیں)

(پیرامس نوجوان کا دامن چھوڑ دیتا ہے اور کوچ پر دھڑام سے گر پڑتا ہے اور اپنا منہ بازوؤں میں چھپا لیتا ہے۔ بہت دیر بعد سر اٹھاتا ہے۔ اور سوچتی ہوئی آنکھوں سے چلچلاتی ہوئی دھوپ میں نظریں گاڑھ دیتا ہے۔)

پیرامس: تو تم ہماری موت کا پیغام لیکر آئے تھے۔

نوجوان: آقا! پندورہ کی موت کا۔

پیرامس: (لبوں پر خشک مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے) پندورہ کی موت!! اگر ہم یہ ماننے سے انکار کر دیں تو؟

نوجوان: (آگے بڑھ کر لپٹا ہوا کپڑا پیش کرتا ہے) یہ پندورہ کے ہاتھ کی تحریر ہے۔

پیرامس: اُف! یہ تو اسی کا خط ہے۔ ہم اس کی تحریر خوب اچھی طرح سے پہچانتے ہیں (پڑھ کر) آہ! یہ واقعی حقیقت ہے لیکن کس قدر تلخ۔ مگر پندورہ اگر ہم کو جنگ میں شامل ہونے سے کچھ تامل تھا تو اسکی وجہ بزدلی نہیں تھی بلکہ تیری محبت تھی۔ ہم محبت کی ایک ایسی بستی بسایا چاہتے تھے۔ لیکن اب سب کچھ فضول۔ (نوجوان سے) پیامبر!

نوجوان: میرے آقا!

پیرامس: ہم زیادہ عرصہ تک نہ جی سکیں گے۔ او پندورہ! اگر تجھے ہماری جنگ میں شمولیت جان سے بھی عزیز تھی تو ہم کو ویسے ہی کہہ دیا تھا۔ تو نے بیشک کہا تھا لیکن ہم نہ جانتے تھے کہ تو اس قدر بیقرار ہے ورنہ ہم اس وقت تجھے گول مول جواب نہ دیتے۔ لو پندورہ! ہم تیرے پاس جلد پہنچیں گے۔ مگر تیری آخری آرزو پورا کر کے بھی خاطر، اور تیری رُوح کو تسکین پہنچانے کیلئے تلوار اٹھائیں گے اور دشمن کے چھکے چھڑا دیں گے۔ (جوش میں آکر) پیامبر!

نوجوان: میرے آقا!

پیرامس: ہماری تلوار۔

نوجوان: (تلوار بڑھاتے ہوئے) یہ حاضر ہے۔

[پیرامس تلوار نکال کر میان توڑ ڈالتا ہے بھویں سکڑ جاتی ہیں جسم کانپنے لگتا ہے۔ یکایک وہ چوبی ہتوڑی لے کر سہ دھاتہ نقارے کی طرف بڑھتا ہے۔]

پیراس :- (نقارہ پر چوٹ لگا کر) پندورہ ! (پے در پے چوٹیں)
پندورہ ! پندورہ !! پندورہ !!!

(پیراس بیہوش ہو کر گرتا ہے ۔ لوگ داخل ہوتے ہیں)

سب ۔ کیا ہوا ؟ کیا ہوا ؟

نوبران :- (پُرسکون لہجہ میں بیہوش پیراس پر نظریں گاڑھتے ہوئے) صرف اعلانِ جنگ !

[پھر نوجوان بیاسر تیر و کمان اٹھاتا ہے اور نقارہ سے بندھی ہوئی ڈوری کا نشانہ باندھ کر تیر چھوڑ دیتا ہے ۔ نقارہ ڈوری کی گرفت سے آزاد ہو کر، سیڑھیوں پر لڑھکتا، جا بجا ٹھوکریں کھاتا ٹکراتا اور آواز پیدا کرتا ہوا نیچے جا گرتا ہے]

منظر سوم

دریائے نیل کا کنارہ

وقت ——— شام

(شاہی لشکر ڈیرے ڈالے ہوئے ہے ۔ سپاہی ٹولیوں میں بیٹھے رنگ رلیاں منا رہے ہیں ۔ جگہ جگہ ریت میں نیزے گڑے ہوئے ہیں اور ان کے اوپر ڈھالیں لٹک رہی ہیں ۔ کئی جگہ کلہاڑے اور تیر ریت میں دھنسے پڑے ہیں ۔ غروب ہونے والے سورج کی کرنیں دریائے نیل کے پانی پر رقص کر رہی ہیں ۔ دریا میں ہچکولے لینے والے بجروں کے بادبانوں میں سے ہو کر گذرنے والی ہوا کی سرسراہٹ تیزی سے پرواز کرنے والی ابابیلوں کی چیخیں اور ملاحوں کے گیتوں نے عجب سماں باندھ رکھا ہے ۔ شاہی خیمہ کے سامنے بھاری میز رکھی ہے ۔ اس پر انواع و اقسام کے کھانے چنے جا رہے ہیں ۔ ایک طرف پیراس بیٹھا ہے ۔ کبھی عصائے شاہی پر ٹیکے دُور افق میں نظریں باندھے دیکھ رہا ہے ۔ پُشت کی طرف بیلدوفان کھڑا ہے ۔)

پیراس :- (افسردگی سے) لڑائی کا بگل پھونک دیا گیا ۔ ہتھیاروں کی جھنکار پیدا ہوئی ۔ تیروں کی بارش ہوئی ۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں ۔ پھر طبلِ ظفر پر چوٹ پڑی ۔ واپسی کے فرمان جاری ہوئے اور اب اسکندریہ کے امرا پیشوائی کیلئے حاضر ہو رہے ہیں ۔ کیوں بیلدوفان ؟

بیلدوفان :- ہاں میرے عزیز دوست ۔

پیراس :- بیلدوفان ! کیا تم سمجھتے ہو کہ ہمیں فتح حاصل ہوئی ہے ؟

بیلدوفان :- میرے سرتاج دوست یہ ایک شاندار فتح ہے ۔

پیراس :- ہم نے ایسی شکست کبھی نہیں کھائی ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم جیت کر بھی ہار گئے ہیں ۔ اور جب تم اپنے عالی جاہ کا ماتم مناتے واپس اسکندریہ کو جاؤ گے تو تم بھی ہماری تائید کرو گے ۔

بیلدوفان :- ایسی بات منہ سے مت نکالئے ۔ آپ سے سب کی امیدیں وابستہ ہیں ۔

پیراس :- نہیں بیلدوفان تم کو ہماری ان امیدوں کا ذرا بھی خیال نہیں جو کہ پندورہ کے ساتھ دریائے نیل کے گہرے پانی میں غرق ہو چکی ہیں ۔ یہی دریا اب پندورہ کا مدفن بن چکا ہے ۔ جس کی لہروں کے سازوں، اور پندورہ کے نغموں کے درمیان ہم کشتی کھینے اور ان سحر کن پریم بھرے گیتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے ۔ (رک کر) کبھی انہی لہروں پر قلوپطرہ اور انتونی تاروں بھری راتوں میں رنگ رلیاں منایا کرتے تھے ——— ان کی داستانِ محبت تو ہر ماہی گیر کی نوکِ زبان ہے ۔ اب تک ملاح ان کی محبت کے گیت گایا کرتے ہیں ......

بیلدوفان :- حضور امرا دعوت میں شریک ہونے کیلئے آرہے ہیں ۔

(امرا کا خاموشی سے داخل ہونا اور آداب بجا لا کر بیٹھ جانا)

پیراس :- (کھڑا ہو کر) اس فتح کیلئے ہم دیوتاؤں کے مشکور ہیں ۔

(بیٹھ جاتا ہے)

ایک امیر:۔ (دوسرے کے کان میں) عالی جاہ نے تقریر تو خوب کی۔

دوسرا:۔ سب عالی جاہ کی اداسی کا سبب جانتے ہیں مگر کچھ نہیں کہہ سکتے۔

تیسرا:۔ اس لڑکے نے بھی ملک و قوم کی خاطر جان دیدی۔ آفریں!

دوسرا:۔ آج تو بہت ہی افسردہ ہیں۔

پہلا:۔ دیکھو عالی جاہ کس قدر کھوئے ہوئے ہیں، سر جھکا ہوا ہے نظر زمین پر، پیالہ ہاتھ میں۔ آنکھیں پھٹی پھٹی دکھائی دیتی ہیں۔

بیلڈوفان:۔ عالی جاہ! آپ پیتے نہیں! کیا حضور پندورہ کی یاد میں کھوئے ہوئے ہیں۔

پیراس:۔ (چونک کر) پندورہ! آہ!!

(ایک سپاہی کا داخلہ)

سپاہی:۔ جہاں پناہ! پیامبر حاضر خدمت ہونے کی اجازت چاہتا ہے

بیلڈوفان:۔ لیجئے عالی جاہ! ہم پیام بر کو تو بھول ہی چکے تھے۔ اسے بھی دعوت میں شامل کر لیتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کو کچھ تسکین ہو۔

(سپاہی سے) بلا لاؤ۔

(سپاہی کی روانگی)

(نوجوان اپنے گھوڑے کی لگامیں پکڑے ہوئے آتا ہے اور آداب بجا لاتا ہے)

پیراس:۔ آؤ پیامبر! ہم تمہیں بھول ہی چکے تھے، آؤ شامل ہو جاؤ۔

نوجوان:۔ (مؤدبانہ انداز سے) شکریہ میرے آقا! میں ..... میں اسوقت ..... (کھانستا ہے اور خاموش ہو جاتا ہے)

پیراس:۔ بیلڈوفان!

بیلڈوفان:۔ (امراء سے) آئیے صاحبان! عالی جاہ اسوقت تنہائی چاہتے ہیں۔

نوجوان:۔ (آگے بڑھ کر) یہ پیام حضور کے نام ہے۔

پیراس:۔ (بلند آواز سے) "عالی جاہ! رات کو دریائے نیل پر پندورہ اپنی ناؤ میں اپنے کھویا کا انتظار کرے گی ——"
آپکی پندورہ!

[نوجوان جلدی سے سر پر سے ٹوپی اتار لیتا ہے۔ اور اسکے لانبے بال اسکے گلابی رخساروں پر اپنا سایہ ڈال لیتے ہیں۔]

پیراس:۔ (نظر اٹھا کر) پیام بر! پیامبر! (چلا کر) نہیں پندو... پندورہ!!

[پیراس جھپٹ کر پندورہ کو پکڑ لینا چاہتا ہے مگر وہ شریر چھوکری اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر فرار ہو جاتی ہے۔]

بلونت سنگھ

بھوت

(۱)

میرے قیام یورپ کے زمانہ کا ایک واقعہ ہے۔

چھٹیاں گذارنے کی غرض سے میں لندن سے پیرس جارہا تھا۔ میرے "یار غار" مسٹر ضیائی ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی ہمراہ تھے۔ تعطیلات کے زمانہ میں ایک عالم پیرس پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ شومیٔ قسمت سے ہم قدرے تاخیر کے بعد پہنچ رہے تھے۔ اس وقت جبکہ پیرس کے تمام اعلیٰ ہوٹل بیرونجات کے سیاحوں سے بھر چکے تھے۔ مجبوراً ہم نے مضافاتِ شہر میں کسی معمولی ہوٹل میں قیام کرنیکا ارادہ کیا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے شہر سے دو تین میل کے فاصلہ پر ایک ہوٹل کے سامنے موٹر ٹھیرادی۔ یہاں کمرہ مل جانے کی قوی امید تھی اس لئے ہم نے اپنا اپنا سوٹ کیس اتار لیا۔ اور ٹیکسی لوٹادی۔ چلتے چلتے ازراہِ ہمدردی ہمارے ڈرائیور نے ہمیں صلاح دی کہ ہوٹل کا کمرہ نمبر ۵ چونکہ آسیب زدہ ہے اس لئے اس میں قیام نہ کریں۔

ہم نے ہوٹل کے مہتمم سے ملاقات کی تو معلوم ہوا کہ یہاں بھی تمام کمرے مسافروں نے لے رکھے ہیں۔ صرف نمبر ۵ باقی ہے۔ ساتھ ہی اس نے بھی ٹیکسی ڈرائیور کے الفاظ دوہرائے۔ لیکن اس قدر اضافہ اور کردیا کہ "اس میں کمزور دل والے قیام نہیں کرسکتے"۔ یہ ہم پر کوئی چوٹ تو نہ تھی۔ کیونکہ ہر وہ شخص جو یہاں قیام کیلئے آیا ہوگا اس سے بھی یقیناً اس نے یہی کہا ہوگا۔ ورنہ آپ اس کمرے کے بچے رہنے کی اور کیا وجہ ہوسکتی تھی۔ پھر بھی ضیائی برداشت نہ کرسکے اور تڑپ کر کہا: "ہم ہندوستانی بھوت ووت سے نہیں ڈرتے۔ ہمارے لئے اس سے زیادہ دلچسپی اور کیا ہوسکتی ہے۔ کہ آسیب زدہ کمرے میں ہمارے قیام کا انتظام کیا جائے"۔

میں کبھی بھوتوں کا کچھ ایسا قائل نہ تھا۔ کمرہ نمبر ۵ کھلوا لیا گیا۔ ملازموں نے ہمارے سوٹ کیس پہنچادیئے۔ کمرے میں باقاعدہ صفائی کی گئی۔ کمرہ ان تمام ضروری ساز و سامان سے آراستہ تھا جو ایک اوسط درجہ کے ہوٹل کے کمروں کا لازمہ ہیں۔ فرنیچر کی قسم سے ایک بھاری بھرکم سنگھار میز تھی جس پر پانی کا جگ، صابون دانی، کنگھی، برش وغیرہ رکھے تھے۔ دو آہنی پلنگ دیوار سے لگا کر آمنے سامنے بچھے تھے جن پر مچھر دانیاں پڑی تھیں۔ ان کے قریب تپائیوں پر برقی لیمپ رکھے تھے۔ اس کے علاوہ بادا آدم کے زمانہ کی دو کرسیاں اور تھیں جن کے پائے انیسویں صدی عیسوی کی گل کاری کا عمدہ نمونہ تھے۔ دیوار پر تصویر کا صرف ایک چوکھٹا آویزاں تھا۔ جس کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے وا ٹیکر کی قلمی تصویر جھانک رہی تھی۔ دروازہ کے ایک پٹ کی اندرونی جانب شہنشاہ جارج پنجم کی سہ رنگی تصویر کسی اخبار سے کاٹ کر چسپاں کردی گئی تھی۔ اور کسی سابقہ انگریز مسافر کی کارگذاری معلوم ہوتی تھی۔ کمرے میں بظاہر ایسی کوئی غیر معمولی بات نہ پائی جاتی تھی۔ جو موجودہ روایات کے پیش نظر بطورِ خاص توجہ طلب ہو۔ لیکن ایسا ضرور معلوم ہوتا تھا کہ ایک عرصہ سے اسے کسی "مضبوط دل" والے انسان کے قیام پذیر ہونے کا شرف حاصل نہیں ہوا ہے۔ بلکہ کھولا بھی نہیں گیا۔ یہ حقیقت اس وقت اور بھی پایۂ تکمیل کو پہونچ گئی جب اسے صاف کیا جانے لگا کیونکہ ہر چیز پر منوں گرد جمی ہوئی تھی۔ بہرحال ہم نے کمرے کو ہر طرح سے آرام دہ پایا اور اس میں رہنے لگے۔

ہمارے پہلو کے کمرہ میں لندن انجینیرنگ کالج کے ایک پروفیسر اترے تھے۔ بڑے خوش اخلاق اور ملنسار آدمی تھے۔ ہمارے قیام کے

تیسرے روز کا ذکر ہے۔ شام کے کھانے سے فارغ ہو کر دفع الوقتی کے لئے وہ ہمارے کمرے میں آبیٹھے۔ ہم ان سے گفتگو میں مصروف تھے کہ یکبارگی دروازہ کھلا اور ایک خوش پوش ہندوستانی جنٹلمین کمرے میں در آئے۔ لیکن ہمیں دیکھتے ہی کو کھلا کر یہ کہتے ہوئے الٹے پیر واپس لوٹے "معاف فرمائیگا۔ میں نے جانا یہ کمرہ نمبر ۱۲ ہے" اس سے پہلے کہ وہ کمرہ سے نکل جائیں ضیائی نے بڑھکر انھیں روکا اور اس اتفاقی ملاقات پر رسمی اظہار مسرت کے بعد صحبت احباب میں شرکت کی دعوت دی۔

نووارد مہمان مسٹر سامری بمبئی کی ایک تجارتی فرم کے حصہ دار تھے۔ اور کاروبار کے سلسلہ میں یورپ آئے تو مغرب کی سب سے بڑی تفرج گاہ پیرس کو فراموش نہ کر سکے۔ ان سے کچھ دیر تک ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ بالآخر مبادلۂ خیالات کو خشک پاکر ضیائی نے بھوتوں کے وجود پر بحث چھیڑ دی۔ پروفیسر صاحب نے اسے محض واہمہ کی تخلیق بتایا۔ میں نے اور ضیائی نے بھی انکی تائید کی۔ لیکن مسٹر سامری بالکل مخالف نظریہ رکھتے تھے۔ وہ نہ صرف بھوتوں کے بُری طرح قائل تھے بلکہ ہمیں بھی قائل کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔ اپنے نظریہ کے ثبوت میں انھوں نے اپنا ایک نہایت دلچسپ اور پُر اسرار تجربہ بیان کیا۔

(۲)

مسٹر سامری نے کہنا شروع کیا۔

ابتداءً ہماری فرم بمبئی میں ضروریاتِ معماری کی فراہمی کا ٹھیکہ لیا کرتی تھی۔ فضا سازگار ثابت ہوئی اور نہایت قلیل عرصہ میں ہم نے حیرت انگیز ترقی کر لی۔ جلد ہی میرے شریک کار مسٹر بھگوانداس کی تحریک پر ہم نے جنوبی ہند کی مشہور بندرگاہ منگلور میں ایک اینٹ اور کھپریل تیار کرنیکا کارخانہ کھول لیا۔ ہماری صنعت کیلئے مطلوبہ مٹی اور تجربہ کار مزدوروں کی منگلور میں فراوانی تھی۔ اس کے علاوہ وہاں اور بھی بیشمار آسانیاں تھیں جنکی وجہ سے ہم کارخانہ کے قیام کیلئے منگلور کے انتخاب پر مجبور تھے۔ حالانکہ ہماری اشیاء کیلئے واحد مارکیٹ بمبئی تھی جہاں ہمارا صدر دفتر بدستور قائم تھا چنانچہ ہمیں سال میں متعدد بار بمبئی اور منگلور کے درمیان بحری سفر اختیار کرنا پڑتا تھا۔

ایک ایسے ہی سفر کا واقعہ ہے بی۔ ایس۔ این کمپنی کا جہاز ایس۔ ایس پاربتی اٹھارہ بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے رات کی تاریکی کو چیرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ پچھلے پہر کا سماں تھا۔ دُخانی انجن کی ناقابل برداشت بدبو نے مجھے بیدار کر دیا تھا۔ اور میں کیبن سے نکل کر عرشۂ جہاز پر آکھڑا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ تاریکی دُور ہو رہی تھی۔ اور ستارے، ہمارے جہاز کے خاموش شریک سفر، مسکراتے ہوئے رخصت ہو رہے تھے۔ پھر تھوڑی دیر بعد ملکۂ شب نے ردائے تاریکی سمیٹ لی۔ اور صبح کی نوبہار دیوی کروٹ لیکر بیدار ہو گئی۔ افق مشرق پر سبزی مائل نارنجی روشنی پھیلنے لگی۔ اور چھوٹے چھوٹے سفید بادلوں کے ٹکڑے فضائے بسیط میں بادبانی کشتیوں کی طرح تیرتے ہوئے نظر آنے لگے۔

بمبئی سے روانہ ہوئے ہمیں ایک دن اور ایک رات گذر چکی تھی۔ میں افق مشرق پر ٹکٹکی لگائے طلوع آفتاب کے دلفریب منظر سے لطف اٹھا رہا تھا کہ میری نظر شمال مشرق کی جانب ایک جزیرے پر پڑی جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ میں نے لپک کر کیبن سے دوربین اٹھائی۔ جہاز سے تقریباً دس میل کے فاصلہ پر یہ خوبصورت جزیرہ واقع تھا۔ چونکہ اس مرتبہ ہمارا جہاز اپنے مقررہ راستہ سے نہیں گذر رہا تھا۔ بلکہ کسی وجہ سے اس کا راستہ بدل دیا گیا تھا۔ اس لئے اس سے پیشتر مجھے اس جزیرہ کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میں نے مُڑ کر ایک خلاصی سے جو عرشۂ جہاز پر صفائی میں مصروف تھا۔ دریافت کیا:۔

"وہ کونسا جزیرہ ہے؟"

"وہ بھوتوں کا جزیرہ ہے صاحب!"

"بھوتوں کا جزیرہ؟ کیا مطلب؟؟"

"صاحب! اس جزیرہ پر کوئی نہیں رہتا اور نہ رہ سکتا ہے۔ اس پر بھوتوں کا قبضہ ہے۔"

"بالکل لغویات، بھوتوں کا جزیرہ کیا معنی"

(۳)

عرصہ سے یہ بات ہمارے زیرِ غور تھی کہ کارخانہ کو کسی ایسے مقام پر منتقل کر دیا جائے جہاں وہ مینگلور کی پیداوار اور بمبئی کے مارکیٹ سے برابر وابستہ رہے۔ اور ہمارے لئے دونوں جانب سے سہولتیں مہیا ہوں۔ آج ایک خوشنما اور غیر آباد جزیرہ اس قدر غیر متوقع طور پر پا لینے سے میرے دل و دماغ میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور ان کمزور طبیعت والوں کے حق میں دل سے دعا نکلی جو اب تک بھوتوں کے خوف کی وجہ سے اس جزیرہ کو آباد کرنے سے گریز کرتے رہے۔ مزید براں یہ کہ موجودہ روایات کے زیرِ اثر اس جزیرہ کے حصول میں انتہائی آسانیاں نظر آ رہی تھیں۔ غرض جزیرہ کیا نظر پڑا تھا ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہاتھ لگ گئی تھی۔ اگر امکان سے باہر نہ ہوتا تو میں فوراً جہاز سے کود کر جزیرہ میں جا پہنچتا۔

جہاز کا دوسرا قیام تین گھنٹے کی مسافت کے بعد ایک مقام پر ہونے والا تھا۔ میں نے اپنے شریکِ کار مسٹر بھگوانداس سے، جو جہاز پر میرے ساتھ تھے۔ اس جزیرہ کا تذکرہ کیا۔ اور ہم دونوں اگلے قیام پر اتر گئے۔

جہاز خشکی سے دور گہرے پانی میں ٹھہرا تھا۔ جہاں سے دخانی کشتی میں بٹھلا کر مسافروں کو ساحل تک پہنچایا گیا۔ آفتاب ماہی گیروں کی جھونپڑیوں سے اوپر آ چکا تھا۔ چند ننگ دھڑنگ ماہی گیر جن کے سیاہ چمکدار جسم کی کل ستر پوشی ایک دو بالشت کی لنگوٹ کر رہی تھی۔ ریت پر جال پھیلائے بُن رہے تھے۔ ان کی عورتیں، نہیں بلکہ حسن و صحت کے لحاظ سے سانولی سلونی جل پریاں جھونپڑیوں کے دروازوں پر بیٹھی خشک مچھلیاں چھانٹ رہی تھیں۔ ایک طرف ٹین کی ایک قدرے مضبوط اور نمایاں جھونپڑی تھی۔ یہ جہاز راں کمپنی کی مقامی ایجنسی کا دفتر تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کمپنی کی دخانی کشتیاں صرف جہاز سے مسافروں کو لانے اور لیجانے کیلئے استعمال ہوتی ہیں۔ اور ماہی گیروں کی کشتیاں سوائے بھوتوں کے جزیرہ کے قصد کے اور تمام مقاصد کیلئے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

لوگ اس جزیرہ سے بری طرح خائف تھے۔ بہر حال انتہائی کوشش کے بعد ایک بوڑھے ماہی گیر کی کشتی اس طرح حاصل کی گئی کہ ہم نے کچھ رقم جہاز راں کمپنی کے دفتر میں جمع کر دی تاکہ اگر خدا نخواستہ جزیرہ کے بھوت ہمارے ساتھ کشتی کو بھی کھا لیں۔ تو یہ رقم بطور معاوضہ ماہی گیر کو دیدی جائے۔

اب چونکہ کوئی کشتی بان آمادہ نہ ہوتا تھا۔ اس لئے ہم نے خود چپو سنبھالے۔ بادبان چھوڑ دیئے گئے، ہوا موافق تھی اور ہم کافی تیز رفتار سے بھوتوں کے جزیرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

(۴)

دوپہر ڈھلنے پر ہم جزیرہ پہنچے ہیں تو ہماری حالت ایک ایسے مغرور فاتح کی سی تھی۔ جو ہر ہر قدم پر مقام مفتوحہ کی حقیقی قیمت کے احساس سے اچھل پڑتا ہو۔ کولمبس کو بھی جزائر بہاما دریافت کرنے پر وہ مسرت حاصل نہ ہوئی ہوگی جو اس جزیرہ کی شکل میں ہمارے حصہ میں

آئی تھی۔ جزیرہ واقعتاً غیر آباد تھا۔ ساحل سے کچھ دور تک تو بنجر میدان تھا۔ اس کے بعد ایک پہاڑی تھی جو مغربی گھاٹ کے سلسلہ کی دور افتادہ کڑی معلوم ہوتی تھی۔ ہم نے سُرعت سے درمیانی میدان طے کیا۔ اور پہاڑی پر چڑھ گئے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ اور ہم چاہتے تھے کہ پہاڑی کی اونچائی سے جزیرے پر ایک نظر ڈال کر غروبِ آفتاب سے پیشتر واپس لوٹ جائیں۔ پہاڑی کچھ زیادہ بلند نہ تھی۔ ہم جلد ہی اوپر پہونچ گئے۔ ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ جب ہم نے دیکھا کہ دوسری جانب دامنِ کوہ میں بھوتوں کی آبادی کے بجائے ایک نہایت سرسبز وادی ہے۔ کچھ فاصلے پر ایک پختہ جھونپڑی تھی۔ جس کی دائیں جانب ایک خوشنما باغ تھا۔ اور عقب میں دھان کا ایک وسیع کھیت جو جنوبی ہند کی خاص پیداوار ہے پھیلا ہوا تھا۔ ایک عمر رسیدہ شخص کھیت میں کام کر رہا تھا۔ غروبِ آفتاب میں ابھی کافی دیر تھی اس لئے ہم نے اس بوڑھے سے مل لینا مناسب سمجھا۔ یوں بھی بھوتوں کے جزیرہ میں اپنے ایک ہم جنس کو دیکھکر ایک رات کے محفوظ قیام کی امید بندھ چکی تھی۔ چنانچہ ہم جلد از جلد پہاڑی سے اتر کر بوڑھے کسان کے پاس پہنچے۔ بشرے سے وہ مغربی گھاٹ کے نیم وحشی قبائل کا کوئی فرد معلوم ہوتا تھا۔ ہمارا قیافہ درست نکلا۔ خوش قسمتی سے وہ ٹوٹی پھوٹی اُردو بول لیتا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ ایک وحشی قبیلے کا سردار ہے۔ اور اپنے دو لڑکوں اور ایک لڑکی سمیت اس جزیرے میں تنہا رہتا ہے۔ قبیلہ کا سردار ہونیکی وجہ سے وہ سب سے زیادہ مالدار شخص تھا۔ مذکورہ کھیت اور باغ اس کے امتیازی اعزاز تھے۔

میرے شریک کار مسٹر بھگوانداس ادبیات سے شغف رکھتے تھے۔ انھیں اس بوڑھے کی شکل میں بیشمار تصانیف کے موضوع نظر آئے اس لئے انھوں نے ایک رات اس کی جھونپڑی میں قیام کی اجازت طلب کی۔ جسے اس نے انتہائی مسرت کیساتھ قبول کر لیا۔

اس دوران میں ہم یہ بالکل فراموش کر چکے تھے کہ اس جزیرہ پر بھوتوں کا قبضہ ہے۔ اور درحقیقت اب تک واقعات نے اس کی کافی تردید کر دی تھی۔

آفتاب غروب ہو چکا تھا اور تاریکی چھا رہی تھی۔ بوڑھے کی وسیع اور پختہ جھونپڑی میں صرف دو مٹی کے چراغ جل کر یا رہے تھے اپنا مُنہ آپ ہی دیکھ رہے تھے۔ آج کی رات بوڑھے کے لڑکے کسی تقریب کے سلسلہ میں باہر ہی قیام کرنیوالے تھے اس لئے جھونپڑی میں ہمارے لئے کافی جگہ نکل آئی تھی۔ اس کی لڑکی البتہ موجود تھی۔ جس نے ہمارے پہنچنے پر ایک اور چراغ روشن کر دیا تھا چراغ کی مدھم روشنی میں ہم نے اُسے دیکھا وہ کمسن اور بلا کی حسین بلکہ شاید جنوبی ہند کی حسین ترین دوشیزہ تھی۔ اور نیم وحشی قبائل کی عورتوں کی طرح صرف ایک تہبند باندھے ہوئے تھی۔ ہماری آمد پر وہ مسرور اور متبسم نظر آتی تھی۔ ہم نے اس لطیف خیر مقدم پر اس کا شکریہ ادا کیا جسے وہ سمجھ نہ سکی اور مُسکراتی رہی۔ وہ صرف کنٹری بول سکتی تھی جس سے ہم قطعی ناواقف تھے۔

کھانیکا وقت ہوا تو بوڑھے کی لڑکی نے کیلے کے پتوں پر اُبلے ہوئے چاول اور ترکاری پیش کی۔ ضیافت کی یہ شان دیکھکر ہمیں ذرا جھجک سی محسوس ہوئی لیکن چونکہ ہم غروبِ آفتاب کے بعد یہاں ٹھہرنیکا ارادہ نہ رکھتے تھے۔ اور اسباب خورونوش بندرگاہ پر چھوڑ آئے تھے لہٰذا چاروناچار اسی پر اکتفا کرنا پڑا۔ ہم چاروں نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانیکے بعد تاڑ کی چٹائیوں پر ہمیں آرام کرنیکو کہا گیا۔ جو بطور بستر ہمارے نیچے بچھا دی گئی تھیں۔ ہم سوچ رہے تھے کہ ان پر رات کیسے بسر ہو سکے گی۔

بوڑھا بھی ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا۔ مسٹر بھگوانداس نے اس سے وحشی قبائل کی زندگی کے مختلف شعبہ جات کے متعلق بیشمار سوالات کئے اور نہایت دلچسپی سے جوابات نوٹ کرتے رہے۔ ان کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ گویا اس کے ہر لفظ پر ایک مستقل کتاب لکھ ڈالیں گے۔ کچھ

دیر تک یونہی گفتگو ہوتی رہی کہ معاً مجھے بھوتوں کا خیال آیا اور میں نے دریافت کیا:۔

"اور بڑے میاں، وہ بھوت کہاں ہیں جو ہم نے سنا ہے کہ اس جزیرہ پر قابض ہیں؟"

"کیا ابھی تک آپ اسے بھوتوں ہی کا جزیرہ سمجھتے ہیں؟" مسٹر بھگوانداس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جی ہاں!" بوڑھا بولا "اس جزیرہ پر درحقیقت بھوتوں ہی کا قبضہ ہے"

"لیکن آپ کیونکر یہاں رہتے ہیں؟" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔

"کیونکہ ہم بھوت ہیں" بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس پر ہم دونوں بھی ہنس پڑے قہقہوں کے درمیان میں نے کہا "سچ پوچھئے تو بڑے میاں یہ سب واہمہ کی تخلیق ہے ورنہ ہم تو بھوت ووت کے قائل نہیں"

"آپ بھوتوں کے قائل نہیں ہیں" بوڑھے نے تعجب سے نظریں گاڑ کر مجھے دیکھا اور ایک زبردست قہقہہ لگایا۔ وہ اس قدر ہنسا کہ ہمیں خدشہ پیدا ہوا کہ اس کے قہقہوں نے خطرناک صورت اختیار کرلی ہے۔ اس پر مسلسل ہنسی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ اس بوڑھے پوپلے منہ کے لرزہ خیز قہقہے؟ خدا کی پناہ ... ہمیں اس احساس سے اور بھی حیرت ہوئی کہ تاریک کمرے کے دوسرے سرے پر اس کی لڑکی بھی قہقہے لگا رہی ہے۔

بوڑھے کے ہیبت ناک قہقہے بلند سے بلند تر ہوتے گئے۔ ہم نے محسوس کیا کہ جھونپڑی کے دروازے کھڑکیاں اور روشندان تمام کے تمام انہی کی طرح زور زور سے قہقہے لگا رہے ہیں۔ اور دیواریں بُری طرح لرز رہی ہیں۔ گویا ساری جھونپڑی گہرے سانس لے لیکر مہیب قہقہے لگانے میں مصروف ہے۔ ہم دونوں خوف وہراس سے ایک سکتہ کے عالم میں بُت بنے بیٹھے ہوئے تھے کہ بھگوانداس نے بڑھکر پوری طاقت سے مجھے بھینچ لیا۔ ہمارے جسم کانپ رہے تھے اور روحیں منجمد ہوتی جارہی تھیں۔

ہم رات بھر بیہوش رہے۔ صبح میری آنکھ کھلی تو نہ جھونپڑی تھی نہ بوڑھا، نہ اسکی لڑکی تھی نہ کھیت اور باغ۔ صرف بھگوانداس میرے قریب ابھی تک اسی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ میں سخت پریشان تھا کہ کیا کروں لیکن جلد ہی انھیں بھی ہوش آگیا۔ میں نے سہارا دیکر انھیں اٹھایا اور ایک لفظ کہے بغیر ہم دونوں واپس لوٹے۔ راستہ میں بھی نہ میں نے کچھ گفتگو کی نہ بھگوانداس نے ہی کچھ کہا۔ ہمارے دل ودماغ پر ایک ہیبت طاری تھی۔ ہم خائف تھے کہ مبادا اس طلسمی جزیرہ کا ذرہ ذرہ قہقہہ زن ہوجائے۔

پہاڑی کی بلندی پر پہنچنے کے بعد ہم نے مُڑکر دیکھا تو بوڑھے کی جھونپڑی باغ اور کھیت سب نظر آرہے تھے۔

(۵)

مسٹر سامری نے اپنا واقعہ ختم کرکے معنی خیز نگاہوں سے ضیائی کی طرف دیکھا جس پر انھوں نے کہا:۔

"معاف فرمائیے گا مسٹر سامری! اگر میں کہوں کہ آپ بڑے کامیاب داستان گو ہیں۔ آپ نے نہایت خوبی سے ایک ایسا فرضی واقعہ بیان فرمایا ہے جس پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے"

"تو کیا آپ بھوتوں کے اب بھی قائل نہیں ہیں؟" مسٹر سامری نے ضیائی کے چہرہ پر نظریں گاڑ دیں۔

"جی نہیں! آپ کی قابلیت کا البتہ قائل ہوگیا ہوں" ضیائی نے مُسکراکر کہا۔

اس پر مسٹر سامری نے ایک طویل قہقہہ لگایا۔ اس قدر طویل کہ اس کی طوالت نے خطرناک صورت اختیار کرلی اور اس خیال سے ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ ان پر قہقہوں کا دورہ پڑ رہا ہے۔ مہیب قہقہے بلند سے بلند تر ہوتے گئے۔ اور ہم نے محسوس کیا کہ کھڑکی، دروازے اور روشندان بلکہ کمرے کی ہر چیز زور زور سے قہقہے لگا رہی ہے۔ ہماری آنکھوں کے نیچے تاریکی سی چھاگئی۔ اور اس دھندلکے میں ہم نے دیکھا کہ مسٹر سامری اپنے بلند قہقہوں کی آواز میں تحلیل ہو رہے ہیں۔

چند لمحہ بعد قہقہوں کی آواز زائل ہوگئی — مسٹر سامری کی نشست خالی تھی۔

میں، ضیائی اور پروفیسر کھوئی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔

طبعزاد — غلام عباس (مولوی)

سلمیٰ کا گیت

شام و سحر کے درمیاں میری حسین پوشیاں — چشمِ شفق کا نور ہیں میری ضیا فروشیاں
پہلوئے کائنات میں میری نوا سے ہے خروش — بزمِ گہِ حیات ہے میری نظر سے گرم جوش
عالمِ حیات میں رکھتی ہوں شانِ کو کبی — تیرگیٔ ممات کو دیتی ہوں شانِ دل لگی
خونِ شباب گرم ہے میرے پیامِ راز سے — چشمِ خیال مست ہے میرے سروشِ راز سے
فصلِ بہار و گل مرا تذکرۂ دوام ہے — مستیٔ جام و مُل مرا تحفۂ صبح و شام ہے
شاعرِ شرق ہے اگر میرے خیال میں مگن — شیشۂ غرب میں بھی ہے میرا جمال ضو فگن
میرے نفس کی آگ سے سوزِ تمامِ زندگی — عشق پیامِ زندگی، حسن پیامِ زندگی

رُوحِ عرب پہ غرب نے پھونک دیا دمِ دگر
اب نہ وہ گرمیٔ نفس اب نہ وہ تیزیٔ نظر

اے دلِ جذبۂ قوم۔ دیدۂ رنگ و بوئے قوم
اے دمِ آرزوئے قوم۔ پیکرِ آبروئے قوم

قطعہ

لوٹ گئی تری کمر۔ قلب مرا شکستہ تر
تو بھی اگر جوان ہو — میں بھی ہوں پھر جوان تر
قلبِ جوانِ عصر میں — ہو جو فغانِ عسکری
دیکھنا پھر فروغ تر۔ مجکو بشانِ دلبری

جمیل نجیب آبادی (بی اے علیگ)

حدیثِ عشق

یہ افسانہ میں نے استاذی ڈاکٹر عندلیب شادانی کی خواہش پر بنگلہ زبان سے ترجمہ کیا ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ اردو کے افسانہ نگار اس قسم کے تراجم کی مدد سے بنگال کے افسانہ نگاروں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اس افسانہ کے مصنف بابو بِبھوتی بھوشن بھٹاچاریہ بنگال کے نامور افسانہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے دوسرے افسانوں کے ترجمے بھی وقتاً فوقتاً قارئین ساقی کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے۔

(تسنیم)

اچھا تو کہانی سُننا چاہتے ہو؟ پریم کہانی؟ بس عشق و عاشقی کے سوا تم لوگوں کو سوجھتی ہی کیا ہے۔ مگر کبھی پہلے زمانے کے لوگ ایسے نہ تھے۔ وہ عجیب و غریب قصّے ضرور لکھتے تھے مگر اس کے ساتھ درد دل کا تعلق برائے نام ہی رہتا تھا۔ رامائن و مہابھارت ہی کو لے لو۔ پوری کی پوری کتاب خونیں داستان سے بھری ہوئی ہے، محبّت سے نہیں۔ الف لیلہ کی ابتدا عورت کی بیوفائی اور محبّت کی ناپائیداری پر ہے۔ البتہ اس زمانہ میں بھی لازوال محبّت کی نظمیں لکھی گئیں۔ مگر اس وقت نظمیں لکھی جاتی تھیں جوانی میں اور قصّے بڑھاپے میں۔ اس زمانے میں بڈھے کہانیاں کہتے تھے اور جوان سُنتے تھے۔ مگر اب جوان کہتے ہیں اور جوان سنتے ہیں۔ وہ عجیب و غریب قصّے نہیں کہتے بلکہ وہی کہتے ہیں جو ان کے تخیل میں لب ہوا ہے۔ میرے خیال میں تو بھی سن رسیدہ ہوئے بغیر قصّہ نہیں لکھنا چاہئے۔ جوانی کی کہانی، کہانی نہیں ہوتی، طوفانِ جذبات ہوتی ہے۔

خیر، داستانِ الفت جب کہنا ہے تو یہی کہانی ہی کہوں گا۔ مگر کبھی چند شرطیں ہیں۔ محبّت کا مطلب جو تم سمجھتے ہو شاید میری کہانی سے اس کا تعلق نہ ہو۔ البتہ محبت ہمیشہ سے ایک ہی قسم کی چیز رہی ہے یعنی بہت اچھا لگنا۔ وقت بے وقت، ظلم ہو یا کرم، ایک کا دوسرے کو بہت زیادہ چاہنا بس یہی ہے محبّت۔ آدمی کی اس دلی خواہش کو ہمیشہ ہی سے عشق کہا گیا ہے اور ساری دُنیا اس سے واقف ہے لیکن اس حقیقت کے متعلق سب متفق الرائے نہیں ہیں۔ اس مسئلہ پر اگر میں اپنی رائے کا اظہار کروں تو تم مجھے مارنے کو تیار ہو جاؤ گے مگر میں جو کچھ کہوں گا اپنے تجربے کی بنا پر کہوں گا۔

میں کہوں گا کہ محبّت ایک بہت ہی ناپائیدار شئے ہے۔ پودے میں بیلے کا پھول جتنی دیر کھلتا ہے انسان کی زندگی میں محبّت کا پھول بھی اتنی ہی دیر کیلئے شگفتہ ہوتا ہے۔ پورا برس گذر جاتا ہے پودے میں پھول کے آثار نظر نہیں آتے۔ جیٹھ بیساکھ کی تپتی ہوئی گرمی میں پھول کی زمین تیار ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب کوئی تھوڑا سا پانی اس پر ڈالتا ہے تو پھول خود بخود کھلنے لگتے ہیں۔ مگر صرف دو دن کیلئے۔ اس کے بعد جتنا بھی پانی دو محض بے سُود، بالکل بیکار، پھول کبھی نہ کھلیں گے۔ ہاں جیٹھ بیساکھ کا زمانہ آئیگا تو پھول پھر کھلیں گے۔

بات تکلیف دہ ہے مگر سچی ہے۔ عموماً محبّت پائدار نہیں ہوتی۔ کم از کم میں نے تو پائدار محبّت نہیں دیکھی۔ اگر تمھیں ایسی لازوال محبّت کہیں نظر آئے تو تم جلد بازی مت کرو۔ ٹھنڈے دل سے پتہ چلاؤ۔ تمھیں معلوم ہو جائیگا کہ اس محبّت میں پہلے کا سا سچّا جوش نہیں رہا ہے۔ اس میں خود غرضی مضمر ہے یا کسی اور قسم کی کشش۔ اس میں اب نہ وہ پہلا سا جوش ہے اور نہ وہ سادہ زندگی۔ انسان کا دل ایسا

ہی ہوتا ہے کسی چیز کی خواہش اس کے نہ ملنے تک ہوتی ہے۔ حصولِ مُراد کے بعد خواہش فنا ہو جاتی ہے۔ شاید اسی جذبہ کا نام عشق ہے۔ حاصل کی ہوئی چیز بار بار کھو جاتی ہے۔ اور ہر بار ایک نئی خواہش اسے حاصل کرنے کے لئے پیدا ہوتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ صرف خدا کی محبت ہی لازوال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کوئی حاصل ہونیوالی چیز نہیں ہے۔

ہماری دلی کیفیات بھی تغیر پذیر ہیں اور ہماری خواہش بھی۔ یہ سب جانتے ہیں مگر اس پر مختلف طریقوں سے غور کرتے ہیں۔ الف لیلہ کی مثال لے لو:۔

بادشاہ نے کہا:۔ "پیاری! آج ہم ملے ہیں جدا ہونے کیلئے۔ کیونکہ کل صبح ہی کو تمہارا سر قلم کر دیا جائیگا"

شہزادی نے کہا:۔ "ہے ہے۔ اس سے تمہیں کیا ملے گا؟"

بادشاہ نے کہا:۔ "تم لوگوں کی محبت چند روزہ ہے۔ آج مجھکو چاہتی ہو کل دوسرے کو چاہنے لگوگی۔ اس لئے اس سے پہلے ہی تمہارا خاتمہ کر دینا بہت بہتر ہے"

اور آجکل کے نوجوان لکھنے والے کیا کرتے ہیں؟ وہ پہلی محبت کو معمولی طور سے دکھا کر دوسری محبت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ محبوبہ اپنے پہلے چاہنے والے سے چھپ کر دوسرے شخص سے محبت کرنے لگتی ہے اور اس کو پاکر یا تو بہت خوش ہوتی ہے یا نہ پاکر دیوانی ہو جاتی ہے۔ لکھنے والے کا ارادہ کچھ بھی ہو مگر تاڑنے والے تاڑ جاتے ہیں کہ پہلی محبت بھی محبت تھی اور دوسری محبت بھی محبت۔ اور اگر موقع ملے تو تیسری بھی ایسی ہی ہوگی۔ محبت کی اس حقیقت کی طرف سے آنکھ نہ بند کر کے پہلے ہی سے اسے تسلیم کر لینا بہتر ہے۔ اگر اس میں شرم یا تکلیف محسوس ہوتی ہے تو پریم کہانی کے بجائے کچھ اور لکھنا ہی مناسب ہے۔

ذرا سوشیل کی طرف تو دیکھو، کیسا غصے سے لال پیلا ہوا جا رہا ہے۔ اس کی شادی کو اگرچہ پانچ برس ہو چکے ہیں۔ وہ ابھی تک بیوی کو پھولوں کا ہار پہناتا ہے۔ وہ ہزاروں طریقے سے ثابت کرنا چاہیگا کہ اس کی محبت ذرا بھی کم نہیں ہوئی۔ اس کی محبت کم ہوئی ہے یا نہیں یہ میں بھی ثابت نہیں کر سکوں گا کیونکہ یہ کب سے کم ہونے لگی ہے اس کا حساب لگانا ناممکن ہے۔ محبت ختم ہونیکے بعد بھی بہت دنوں تک ہمارے رجحانات عادتاً برقرار رہتے ہیں۔ جیسے آم کھا چکنے کے بعد بھی بچے گٹھلی چوستے رہتے ہیں۔ جیسے تنباکو ختم ہو جانے کے بعد بھی بُڈھے حقہ کا کش لیتے رہتے ہیں۔

تم کہتے ہو کہ ایک شخص سے محبت صرف ایک ہی دفعہ ہوتی ہے۔ یہ غلط ہے۔ پودے میں پھول جیسے ایک بار نہیں کھلتے محبت بھی صرف ایک ہی دفعہ بیدار نہیں ہوتی۔ متعدد بار وہ جلوہ گر ہوتی ہے اور ہر بار نئے رنگ میں۔ زندگی میں ایک ہی شخص کی محبت میں فنا ہو جانیکی نظیر نایاب ہے۔ یہ ایک ناممکن بات ہے۔ مجھ ہی کو لیلو، میں اپنی زندگی میں ابتک چھ دفعہ محبت کر چکا ہوں۔

میری محبت کی ابتدا اپنی ماں سے ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لمحہ بھر کیلئے بھی میں ماں سے جُدا نہ ہوتا تھا، سایہ کی طرح ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ ماں کی گود بہت آرام دہ معلوم ہوتی تھی۔ ماں کی گود میں بیٹھکر نہ کھانے سے تسکین ہی نہ ہوتی تھی۔ اور ماں کی گود کے بغیر نیند ہی نہیں آتی تھی۔ بہت دنوں تک یہی حالت رہی۔ لوگ کہتے تھے کہ لڑکا اتنا بڑا ہو گیا مگر ماں کی گود نہیں چھوڑتا۔ لیکن بھی توبہ، کون کس کی سُنتا تھا؟ ماں اگر کسی سے ہنس کر دو باتیں کرتی تھی تو میں اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے سو سو تدبیریں کرتا تھا۔ جب کامیاب نہ ہوتا تھا تو اپنے کو نوچ ڈالتا تھا یا بھوک لگی ہے کہکر چیخنے لگتا تھا۔ ماں اگر کسی سے کوئی بات کرنے کیلئے مجھے ہٹا دیتی تھی تو میں آتشِ رشک سے بھُن جاتا تھا۔ بچپن میں رشک کا

مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور رشک ہی محبت کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ جوانی کی محبت بچپن کی محبت کی نقل ہے۔ اس میں نئی بات کچھ بھی نہیں ہوتی۔ بچپن میں ماں سے جو جتنی خلوص کے ساتھ محبت کریگا جوانی میں اس کی محبت اتنی ہی گہری ہوگی۔ جس کی ماں بچپن ہی میں قضا کر گئی ہو اسکی محبت حاصل کرنی بہت ہی مشکل ہے۔ بچپن میں جو ماں کی محبت سے سیراب نہیں ہوتا جوانی میں وہ بڑا سنگدل ہوتا ہے۔

خیر! میرا دوسرا محبوب میرا ایک دوست تھا۔ آہ! اس محبت کا حال نہ پوچھو۔ نہ کھانے پینے کا خیال تھا نہ نہانے دھونے کا ہوش۔ آٹھوں پہر میں اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ آندھی چلے، طوفان آئے، کچھ بھی ہو جائے اس کے پاس جانا ضروری تھا۔ اس کے ساتھ سیر کو جانا اس کے ساتھ ایک ہی برتن میں کھانا کھانا، اس کے بچھونا میں سونا، ایک ہی ساتھ پڑھنے کا بہانہ کرنا میری زندگی کا مقصد بن گیا تھا۔ ہم نے عہد کیا تھا کہ کبھی شادی نہیں کریں گے۔ ہمیشہ ایک ساتھ رہیں گے۔ اپنے دوست کی ماں کی میں کتنی تعظیم کیا کرتا تھا گویا وہ میری ماں سے بھی بڑھکر تھی۔ میری ماں کھانا لیکر بیٹھی رہتی تھی، بار بار بلوا بھیجتی تھی۔ مجھے اپنے پاس رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر ماں کی پرواکس کو تھی۔ ماں کے دن گذر چکے تھے۔ اب میری محبت کا مرکز صرف میرا دوست تھا۔ اُف وہ کتنا بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی باتیں کتنی میٹھی معلوم ہوتی تھیں! اب بھی میرا وہ دوست زندہ ہے۔ مگر اب اس کو دیکھنے سے تعجب ہوتا ہے کہ اس کے اس منحوس چہرہ کو میں خوبصورت سمجھتا تھا۔ بچپن کی محبت! ہنسی آتی ہے بھئی۔ اب تو اس کے ساتھ بات کرنیکو بھی جی نہیں چاہتا۔ راستہ میں اگر ملاقات ہو جاتی ہے تو بڑی مشکل سے "خیریت تو ہے" کہکر پیچھا چھڑا لیتا ہوں۔

اس کے بعد تیسری محبت کی باری آئی۔ اس دفعہ اس کا مرکز میری بڑی بھابی تھی۔ اس وقت میری جوانی کی ابتدا تھی۔ سبزہ آغاز ہو رہا تھا۔ ڈاڑھی اچھی طرح نہ نکلی تھی پھر بھی اُسترا پھیرنے میں خاص ایک مردانہ تمکنت محسوس کرتا تھا۔ چھپ چھپ کر سگریٹ پینا بھی شروع کر دیا تھا۔ اگرچہ پوری طرح جوان نہ تھا لیکن جوانی کی خبر پا چکا تھا اور نوجوان کہلانیکی خواہش دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ اس وقت میری ایک چھوٹی سی نئی بھابی تشریف لائیں۔ نئی نویلی، منہ پر ڈیڑھ ہاتھ کا گھونگٹ، گھونگٹ کے نیچے ایک متبسم چہرہ۔ ماں کے سوا وہ پہلی عورت تھی جس نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ بھابی جان صرف میرے ہی سامنے گھونگٹ الٹ دیتی تھیں۔ گھونگٹ اُلٹتے ہی میں دیکھتا تھا کہ ان کے چہرہ میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو کوئی نہیں جانتا۔ مجھے اشتیاق ہوتا تھا کہ ان رازہائے سربستہ کا پتہ لگاؤں۔ بھابی جان کا ہمدرد، رفیق، غمگسار ایک میں ہی تھا۔ میرے ساتھ کھیل کر وہ ماں باپ کے چھٹنے کا غم غلط کرتی تھیں۔ کھیل ہی کھیل میں محبت نے انگڑائی لی۔ اس وقت میں نے محسوس کیا یہ محبت کتنی میٹھی، کتنی طرب انگیز ہے۔ اس کے سامنے دوست کی محبت کی کوئی ہستی ہی نہ تھی۔ گھبراؤ نہیں اس محبت میں خطرات ضرور تھے مگر رہی وہ آخر تک پاک۔ اس میں محبت کے سب آثار پائے جاتے تھے۔ بھیا کی قسمت پر رشک ہوتا تھا۔ میں بھابی کو بہت چاہتا تھا، انھیں ستاتا تھا، ان سے جھگڑتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بھابی بھی مجھکو بھیا سے زیادہ چاہتی ہیں۔ اور نہایت چالاکی سے اس راز کو بھیا سے پوشیدہ رکھا ہے۔ مگر بھیا ایسا بیوقوف ہے کہ کچھ نہیں سمجھتا۔ بھیا کی حالت پر مجھے رحم آتا تھا۔

خیر! میری چوتھی محبت کی ابتدا میری بیوی سے ہوئی۔ بھابی میں جس چیز کی ذرا خبر پائی تھی بیوی میں اسکی تکمیل ہوئی۔ دوسرے کی محبت میں خبر کچھ رکاوٹ ہے مگر یہاں رکاوٹ کون پیدا کرتا۔ ماں کے پاس جو جذبات کچل گئے تھے موقع پاکر وہ پھر نئے سرے سے بیدار ہوئے۔ محبت کی تشنگی یہاں آکر بجھی۔ یہاں ظلم بھی کرسکتے ہو اور ہمدردی بھی حاصل کرسکتے ہو۔ پہلی محبتوں سے اس محبت کا مقابلہ کیا۔ توبہ، وہ تو نہایت ہی ادنیٰ درجہ کی تھیں۔ بھلا اس محبت کی نظیر میں کیا دوں۔ میاں بیوی کی محبت دنیا میں ایک لاجواب شاہکار ہے۔ اس

وقت یہ خیال تھا کہ یہ محبت ایک لازوال، غیر فانی شے ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ ایسا گوہر بے بہا ہاتھ آیا۔ خدا کی خاص عنایت ہے کہ اس ذات مخصوص ہستی کو میرے لئے منتخب فرمایا۔ اگر کوئی دوسری عورت میری بیوی ہوتی تو میں تباہ ہو جاتا، میری زندگی برباد ہو جاتی۔ اسی طرح ہزاروں "فلسفیانہ خیالات" دماغ میں بسے ہوئے تھے۔ زیادہ کہنا فضول۔ تم خود اس کو سمجھتے ہوگے۔

اس کے بعد لڑکے بالے ہوئے۔ عملی دنیا سے سابقہ پڑا تو سارا فلسفہ تشریف لے گیا۔ اس کے بعد بھی بیوی کے ساتھ جسم و جان کا تعلق ہے۔ اس کے کہنے کی بھلا ضرورت ہی کیا ہے۔ بیوی کی میں دل و جان سے عزت کرتا ہوں یہ تو سب ہی جانتے ہیں۔ خیر اب اس موضوع پر میں زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتا۔ بیوی صاحبہ برابر کے کمرے میں ہیں کہیں سن لیں تو قیامت ہو۔

اس کے بعد بھی میں ایک اور محبت سے دوچار ہوا۔ مگر اس کا حال چپکے چپکے کہنا ضروری ہے۔ دیوار ہم گوش دارد۔ میرے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایسا واقعہ کبھی پیش آئیگا۔ محبت کے متعلق تو میں بالکل مطمئن ہو گیا تھا۔ خیال تھا کہ وہ بچپنے کی ایک جذباتی کیفیت ہے۔ چالیس برس کے سن میں ایک ایسی ہستی سے سابقہ پڑا کہ میرے جذبات پھر نئے سرے سے بیدار ہو گئے۔ میں پھر جوان ہو گیا۔ گویا سوکھی ڈالی میں دوبارہ محبت کے سبز پتے پیدا ہو گئے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ بیوی کے علاوہ بھی کسی دوسرے سے ایک اور طرح کی محبت ہو سکتی ہے۔ Man is polygamous by nature (تعدد ازدواج انسان کی فطرت ہے) بات پتے کی ہے۔ آج کسی کے دو بیویاں ہیں تو شرم کی بات ہے مگر پہلے کوئی شرم کی بات نہ تھی۔ بہت سے لوگ دو دو بیویاں رکھتے تھے۔ اور اسے چھپانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ مگر اب ہوا بدل گئی ہے۔ اگر محبت بار بار بیدار ہو تو تم کسی سے کہہ نہیں سکتے۔ اس محبت کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش میں میری زندگی کیسی رومانٹک ہو گئی تھی۔ وہی آج تم لوگوں کو سناؤں گا مگر پہلے مجھے بات تو ختم کرنے دو۔

اس کے بعد اس بڑھاپے میں بھی کسی کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ یہ میری چھٹی محبت ہے اور اس کی مالک میری نواسی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ وہ مجھ سے اتنی محبت کیوں کرتی ہے۔ اپنے ماں باپ کے پاس بھی نہیں جاتی۔ یہ بھی ایک بات ہے کہ محبت دوطرفہ ہوتی ہے۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ تم محبت کرو۔ تم سے بھی کوئی محبت کریگا۔ اس لڑکی کو میں نے ہی پالا ہے۔ وہ میری راحت ہے۔ وہ صرف خوبصورت ہی نہیں، اس بلا کی ذہین ہے کہ میں کیا بیان کروں۔ اس چھوٹی سی عمر ہی میں اس نے مجھکو رام کر لیا ہے۔ بڑی ہو کر خدا جانے کیا قیامت ڈھائے گی۔

خیر، میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ محبت کبھی دائمی نہیں ہوتی۔ کیونکہ محبت کی تخلیق قدرت کی اہم ترین ضرورتوں میں سے ہوتی ہے۔ یہ وہ آگ ہے کہ "لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے"۔ یہ ہر شخص کے رگ و پے میں پنہاں ہے۔ جب کبھی موافق سماں ہوتا ہے یہ عیاں ہو جاتی ہے۔ اور حسب ضرورت متعدد بار ظہور کرتی ہے۔ کسی ملک کی مٹی کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو اس کے نیچے پانی ضرور ہے۔ ٹیوب لگانے پر وہ نکل آتا ہے۔ اسی طرح سنگدل سے سنگدل کے سینے میں بھی اگر ٹیوب پہنچا دیا جائے تو ضرور بالضرور محبت کے فوارے چھٹنے لگیں گے۔ صرف یہی نہیں ایک ہی جگہ دو تین ٹیوب بھی لگائے جا سکتے ہیں۔ اس کی نظیر آپ موجودہ زمانہ کی کتابوں میں بھی پائیے گا۔ اور پرانے زمانہ کی رامائن اور مہابھارت میں بھی۔

تو کیا بے لوث محبت کا دنیا میں وجود ہی نہیں۔ نہیں، وہ بھی ہے۔ ارے بھئی وہ کونسی چیز ہے جو دنیا میں موجود نہیں۔ بے غرض محبت، "تم نہیں چاہو نہ چاہو ہم تمھیں چاہا کریں"۔ ایسی محبت بھی ہے۔ مگر شاذ و نادر۔ اس لئے اس کی جگہ رومان کی دنیا میں نہیں ہے۔

وہ محبت رومان سے بھی اونچے درجہ کی چیز ہے۔ اور اس میں بھی قدرت کا ایک مقصد پنہاں ہے۔ آخر دُنیا کو ابھی دو چار مثالوں کی بھی تو ضرورت ہے نا۔ مگر سچ پوچھو تو قدرت کو ایسی محبت سے سروکار نہیں ہے۔ قدرت کو معمولی انسانوں سے تعلق ہے۔ اور عموماً انسان خود غرض ہوتا ہے تو پھر محبت کیسے غرض سے پاک ہو سکتی ہے۔

میری باتیں تم لوگوں کو ناگوار گذر رہی ہوں گی۔ مگر تمہارے بُشرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تم دل ہی دل میں قائل بھی ہوتے جا رہے ہو۔ صرف اپنی طرف سے غور کرو گے تو صدمہ ضرور پہنچے گا۔ لیکن اگر ساری دُنیا کی طرف سے سوچو گے تو یہی قانون تم کو اٹل نظر آئیگا۔

تم کہو گے کہ مرد کی محبت ایسی ہو تو ہو لیکن عورت کا پیار ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرے باغ کے دونوں طرف مادھوی لتا کی بیل ہے وہ تم دیکھتے ہی ہو گے۔ ان میں سے ایک نیم کے درخت پر چڑھی ہے۔ اور دوسری آم کے پیڑ پر۔ ان میں سے اگر ایک سے پوچھو کہ کیا حال ہے۔ تو وہ کہے گی خدا کا شکر ہے، مجھ میں نرمی ہے، مٹھاس ہے اور درخت میں ہے کڑواہٹ، خوب جوڑا مل گیا ہے۔ دوسری سے پوچھو تو وہ کہے گی کہ کیا کہنے، مجھ میں پھول ہوتا ہے اور درخت میں پھل۔ لطف کی زندگی ہے۔ یوں تو دونوں ہی خوش ہیں مگر انھیں اتنی خبر نہیں کہ ان کی محبت ضرورت پر مبنی ہے۔ آج تم اس مادھوی لتا کو کاٹ دو اور اس کی جگہ پر مالتی کا پودا لگا دو، چند روز بعد دیکھو گے کہ وہ بھی درخت کے ساتھ اسی طرح خلط ملط ہو گیا ہے۔ عورتوں کی محبت بھی اسی طرح تعدّد ازدواج کا میلان رکھتی ہے۔ اسی کی ان لوگوں کو ضرورت بھی ہے۔

محبت کی بنا غرض پر ہے میرے کتے "جیک" کو لے لو۔ بچپن سے میں نے اس کو پالا ہے۔ میرے سوا وہ کسی کو نہیں پہچانتا۔ اس کی وفاداری میں کلام نہیں۔ آج اگر میں اسے فروخت کر دوں دو دن بعد اس کے نئے مالک کے ساتھ بھی اس کے تعلقات ٹھیک ایسے ہی ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر کبھی ملاقات ہو جائیگی تو وہ دو چار مرتبہ دُم ہلا دیگا اور بس۔

فضول بحث سے کیا فائدہ۔ اس روز دیکھا کہ ہمارے ہری "کاکا" نے بیلے کا ہار خریدا۔ میں نے پوچھا۔ کاکا! ہار کیا کیجئے گا؟ "کاکا نے بتیسوں دانت نکال دیئے" ارے بیٹا کیا کہوں۔ تمہاری نئی کاکی کو پھولوں کا بہت شوق ہے۔ پھول نہ ہونے سے اس کی طبیعت اُداس ہو جاتی ہے۔ کھیلتی ہے اور کیا بچپن ہے۔ گڑیا کو پہناتی ہو گی" نئی کاکی ان کی تیسری بیوی ہے۔ میں نے پوچھا۔ "کاکا! پہلی کاکی کو بھی کیا اسی طرح ہار لا کر دیتے تھے" کاکا میرے کان کے پاس مُنہ لا کر نہایت رازدارانہ طور سے کہنے لگے "ایسی بات جانے دو۔ وہ تو ستی ساوتری تھیں ان کو اسکی کیا ضرورت تھی" یعنی پہلی بیوی سے جو چیز (محبت) مفت ملتی تھی تیسری بیوی سے اس کو حاصل کرنے کیلئے پھولوں کی ضرورت ہے۔

لو بھئی اندر سے بُلاوا آیا ہے۔ رات کافی آگئی ہے کیا؟ تمہید ہی تمہید میں سارا وقت گذر گیا۔ بڈھا ہو گیا ہوں۔ اس لئے نہ بات کا ٹھیک ہے نہ وقت کا اندازہ۔ خیر تم لوگ وقت گذارنے کیلئے قصہ سُننا چاہتے تھے تو لو وقت گذر گیا۔ جیسے بھی گذرا۔ قصّہ پھر کسی دن سُن لینا۔

تسنیم (جہانگیر نگری)

حیاتِ دوام کی قیمت

یہ کہتے ہیں شیخانِ آوارہ گرد — کہ تھا اگلے وقتوں میں اک پیر مرد
جوانی میں بھی تھا وہ پیروں سے شاد — نہ تھی اس میں کچھ قوت اجتہاد
کسی پیر نے شربتِ جانفزا — دیا اور کہا، ہے یہ آبِ بقا
جو تھا اس کو مرشد پہ کامل یقیں — خیالِ بقا ہو گیا دل نشیں
رہا جب نہ مرنے کا غم رازِ خوف — خوشی اس کے دل کا لگی کرنے طوف
بہار اس کے ہمراہ چلنے لگی — نشاط اس کے سایہ میں پلنے لگی
نہ تھا واقف اس سے کہ ہے کیا ملال — وہ خوش اور خوش اس کے اہل و عیال
کبھی خوش بہن کی عنایات پر — کبھی شاد بیوی سے ہنس بول کر
گھر اس کا نمونہ تھا فردوس کا — کسی کو کسی بات کا غم نہ تھا
کبھی سامنے آ کے "نورِ نظر" — بڑھاتا تھا اس کا شعورِ نظر
دکھا کر کبھی اپنی طفلانہ چال — لبھاتی تھی دل دخترِ مہ جمال
جو خود شاد تھا سب کو خوشدل کیا — کئی سال یوں ہی خوشی سے جیا
کہ اتنے میں بیوی نے پائی وفات — گیا ساتھ ہمدم کے لطفِ حیات
تصور اسی کا جمانے لگا — نظر ہر کسی سے چرانے لگا
نہ کھانے کی تھی سدھ نہ پینے کی سدھ — ہوا ہو گئی سب وہ جینے کی سدھ
جو شیرازۂ دل بکھرنے لگا — تو جینے سے جی اس کا ڈرنے لگا
کیا غم نے اس کو جو دل باختہ — یہ کہنے لگا خود ہی بے ساختہ
مری جان بلا لے مجھے بھی وہاں — ہے مصروفِ گلگشت تو اب جہاں
مرا غمکدہ کیا جہنم نہیں — جناں میں تجھے کیوں مرا غم نہیں
نہ پیتا میں اے کاش آبِ حیات — نہ دیتی مجھے رنج تیری وفات
یہی ہے بہائے حیاتِ دوام — کہ جیتا رہوں اور جپوں تیرا نام

علی منظور

خواب و خیال

حسن حیرت آفریں، عشق آپ سے بیگانہ تھا
شمع سرگرمِ تجلّی، وجد میں پروانہ تھا

ہر نگہ تھی نشہ پرور، ہر ادا مخمور و مست
ایک ایک اندازِ ساقی حاصلِ میخانہ تھا

وہ سراپا شعر و نغمہ، وہ مجسّم حسن و کیف
رقص میں تھی مطرب یا دور میں پیمانہ تھا

زیبِ آغوش اک نگارِ دلنواز، آرامِ جاں
غمزۂ برہم بھی جس کا لطفِ محبوبانہ تھا

سر سے پاؤں تک وہ طوفانِ شباب و انبساط
شوق میں ڈوبا ہوا ہر نازِ معشوقانہ تھا

وہ تکلم نرم و نازک، وہ تبسم شوخ و شنگ
عشوہ عشوہ رہنمائے جرأتِ رندانہ تھا

دیدہ و دل محوِ حیرت، روح سرشارِ نشاط
جو شریکِ بزم تھا وہ آپ سے بیگانہ تھا

دیکھتے ہی دیکھتے بدلا جو منظر یک بیک
یہ ہوا محسوس گویا وہم تھا، افسانہ تھا

وہ سرورِ کامرانی ہو گیا خواب و خیال
اب نہ وہ مطرب نہ وہ ساقی نہ وہ میخانہ تھا

وہ شبابِ افروزِ گیتی، وہ گلِ رعنا، نہ تھا
وہ گلستانِ خراماں، وہ بہار افزا، نہ تھا

وہ فسوں گر، وہ کرشمہ ساز، وہ سحر آفریں
وہ حسیں، وہ حسن زا، وہ انجمن آرا، نہ تھا

راحتِ دل، جنتِ آغوش، فردوسِ نظر
روح کی وہ روشنی، آنکھوں کا وہ تارا، نہ تھا

جس کے قدموں سے سرودِ زندگی تھا نغمہ ریز
وہ نگارِ خوش نوا، وہ زمزمہ پیرا، نہ تھا

جس کے پرتو سے جہانِ آرزو تھا تابناک
وہ بتِ مہوش، وہ کافر گیسوؤں والا، نہ تھا

جس سے تھیں پُرنور آنکھیں، جس سے تھا مسرور دل
سامنے نظروں کے اب وہ جلوۂ زیبا، نہ تھا

مرثیہ خواں تھی تمنا، نوحہ گر تھیں حسرتیں
رنجِ حرماں کے سوا سر میں کوئی سودا، نہ تھا

سر اٹھاتے ہی غمِ دنیا کے ٹوٹا ہر طلسم
دونوں منظر ہو گئے معدوم، کچھ پیدا، نہ تھا

اُکھڑی سانسیں کہہ سکیں اتنا بمشکل زیرِ لب
وہ بھی تھا اک خوابِ شیریں یہ بھی اک افسانہ تھا

کوکب (شاہجہانپوری)

دیارِ شفق

(یہ ڈرامہ انگریزی نظم میں ہے۔ اور دسمبر ۳۳ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اسٹیج کیا گیا)

مترجمہ مسعود حسن علوی

کردار

محافظ ــــــــ تین زائرین ــــــــ نو وارد

منظر

(ایک دروازہ جہاں زمین اور آسمان ملتے ہیں، تمام افق سرخی سے معمور ڈوبتے سورج میں چمک رہا ہے۔ ایک محافظ دروازہ کی نگہبانی کر رہا ہے۔ جونہی زائرین کا ایک قافلہ دروازہ کے قریب آتا ہے محافظ آگے بڑھکر ان سے سوال کرتا ہے)

محافظ:۔ اے نیم عریاں آنیوالو تم کون ہو؟ تمھاری نگاہوں سے وحشت اور دنیا سے بے تعلقی ٹپکتی ہے۔

پہلا زائر:۔ ہم زائرین ہیں۔

دوسرا زائر:۔ ہم مسافر ہیں۔

تیسرا زائر:۔ ہمیں جانے دو۔

محافظ:۔ تم کہاں جا رہے ہو؟ کس مقدس سرزمین کو؟

پہلا زائر:۔ ہم اس پاک سرزمین کی طرف جا رہے ہیں۔

دوسرا زائر:۔ ہم دنیا کی سب سے زیادہ پاک جگہ جانیکا ارادہ رکھتے ہیں۔

تیسرا زائر:۔ ہمیں راستہ دو۔

محافظ:۔ لیکن یہ راستہ کہیں نہیں جاتا۔

پہلا زائر:۔ مگر یہی وہ راستہ ہے۔

دوسرا زائر:۔ ہاں، ہاں یہی وہ راستہ ہے۔

تیسرا زائر:۔ مقدس سرزمین کی شاہراہ یہی ہے۔

سب زائرین:۔ مقدس سرزمین! مقدس سرزمین!!

محافظ:۔ یہ دنیا کی انتہا ہے یہاں تمام راستے ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے آگے محض خلا ہے اور زمین کا نشان تک نہیں۔

پہلا زائر:۔ (غروب آفتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) لیکن ہم کو اس طرف جانا ہے، جہاں کی تمام فضا گلگونیت سے معمور ہے۔ جہاں اڑنے والے نیل کنٹھ کے شوخ رنگ ہر چیز پر چھائے ہوئے ہیں۔

دوسرا زائر:۔ ہم وہاں جانا چاہتے ہیں جہاں سے پھولوں کو رنگ ملتا ہے، جہاں ابابیلیں اپنے پروں کو خوشنما رنگوں میں رنگتی ہیں۔

تیسرا زائر:۔ ہمارا ٹھیک راستہ اس دیارِ شفق میں ہے۔ جہاں کی ہر چیز درخشاں رہتی ہے۔

سب زائرین:۔ (بے صبری سے) ہمیں جانے دو۔ ہمیں جانیدو!

محافظ:۔ مگر وہاں تو زمین کا نشان بھی نہیں ہے، وہ تو محض ایک سایہ ہے فریب ہے، کیونکہ یہ ہے وہ پاک زمین جو خوشبوؤں سے بھری ہوئی ہے۔

پہلا زائر:۔ لیکن یہ ناپاک جگہ ہے۔

دوسرا زائر:۔ یہ خود غرضی کی سرزمین ہے!

تیسرا زائر:۔ یہ کانٹوں سے بھری ہوئی دنیا ہے!

محافظ:۔ اُدھر نہ دیکھو، اس سایہ کے سینہ میں غیر یقینی امیدیں اور مصائب بھرے ہوئے ہیں، ساری مسرتیں اور آرام تو یہاں موجود ہیں۔

پہلا زائر:۔ ہم نے تمھاری مسرتوں کا پورا مزہ اٹھالیا، وہ بہت تلخ ہیں وہ تو محض بچوں اور دولت مندوں کیلئے ہیں۔

محافظ:۔ لیکن کیا تم وہاں مشرق اور مغرب کی عبادت گاہیں دیکھ سکو گے؟ تاثر منبر کرو یہاں ہیں۔

دوسرا زائر:۔ ہم نے تمہارے مقدس مقامات دیکھ لئے، وہ ریاکاری کی بارگاہیں ہیں۔ وہ محض ناد انوں کیلئے ہیں۔

محافظ:۔ لیکن کیا تم مہکتے ہوئے موسم گرما کی بھینی بھینی خوشبوؤں اور بسنت کی دلفریبیوں کو بھلادو گے؟ دیکھو، گلاب کے پھولوں نے زمین کو چمن بنادیا ہے۔

تیسرا زائر:۔ گلاب! ہمیں گلاب سے کیا کام جو اتنے جلد مرجھا جاتے ہیں؟ وہ صرف عاشقوں کیلئے ہیں۔

محافظ:۔ مگر یہاں پھولوں میں بسی ہوئی دوشیزائیں ہیں، وہ تمہارے دل کو سکون دیں گی، تم سے محبت کریں گی اور تمہاری پرستش کرینگی۔

پہلا زائر:۔ تمہاری دوشیزائیں! وہ جادوگرنیاں ہیں، وہ مکار ہیں۔

دوسرا زائر:۔ اُن کی محبت خودغرضی پر مبنی ہے، ان کے وعدے ناپائیدار ہیں۔

تیسرا زائر:۔ وہ کمزور دل والوں اور بوالہوسوں کیلئے ہیں۔

پہلا زائر:۔ ہم اس سرزمین میں جائیں گے جہاں ابدی شادکامی اور خوشی ہے، جہاں کی مسرتوں میں خودغرضی کی بو نہیں۔

دوسرا زائر:۔ ہم وہاں جارہے ہیں جہاں صداقت ہمیشہ مسکراتی رہتی ہے جہاں جھوٹ اپنا چہرہ جلاوطن کی ہوئی رات کی تاریکی میں چھپائے رہتا ہے۔

تیسرا زائر:۔ ہم اس دیار میں جارہے ہیں جہاں کے پھول مرجھانا جانتے ہی نہیں۔ جہاں ہمیشہ بہاری بہار ہے۔ جہاں حسن کی جادوانی کی حکومت ہے۔

پہلا زائر:۔ ہم اس سرزمین کو جارہے ہیں جہاں محبت اس طلوع صبح کے مانند ہے جو خوش آئند مستقبل کے نغموں اور امیدوں سے معمور ہے

دوسرا زائر:۔ جہاں عورتوں میں بیوفائی اور تلوّن نہیں ہے۔

تیسرا زائر:۔ جہاں محبت آزاد اور ابدی ہے۔

سب زائرین:۔ (بیصبری سے) ہمیں جانے دو، ہمیں راستہ دو، ہم شفق کی طرف جارہے ہیں۔

محافظ:۔ (جھنجلا کر) میں تم کو نہ جانے دوں گا اس لئے کہ میں نہیں جانتا تم کون ہو۔

پہلا زائر:۔ مگر ہماری راہ بہت طولانی ہے، بہت طولانی، اور راستہ تاریک اور دھندلا ہے۔

دوسرا زائر:۔ آہ! ہمارا راستہ کس قدر طویل ہے، ہمارے دل درماندہ ہیں۔

تیسرا زائر:۔ ہمیں جانیدو۔ اور راستہ پکڑ لینے دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ رات ہو جائے اور ہم اسکی تاریکی میں گم ہو جائیں۔

سب زائرین:۔ (مزید بیصبری سے) ہمیں جانیدو، ہمیں جانیدو۔

محافظ:۔ تمہارے الفاظ بے اثر اور بے سود ہیں۔ میں تمھیں ہرگز جانے دوں گا۔ اس لئے کہ نہ معلوم تم کون ہو۔

پہلا زائر:۔ مگر آہ! ہمارے کانوں میں دور دراز سرزمینوں کے قافلوں سے جرس کی صدائیں آرہی ہیں اور ہمارے دلوں کو شوق سے بیچین کئے دیتی ہیں۔

دوسرا زائر:۔ وہ دیکھو! وہ اب دور افتادہ پہاڑیوں پر چڑھ رہے ہیں، اور روشنی اور خوش نما رنگ ان کے چہروں کو کیسا دلکش بنا رہے ہیں۔ یہ دیکھکر ہمارے دلوں کا شوقِ طلب تو اور بھی بڑھتا جاتا ہے۔ ہمیں چلا جانے دو۔

سب زائرین:۔ وہ مڑ مڑ کر ہم کو دیکھ رہے ہیں، ہماری بزدلی کا مذاق اڑا رہے ہیں، آہ! وہ تمسخر کر رہے ہیں! ہمیں جانے دو۔

سب زائرین:۔ (التجا کرتے ہوئے) ہمیں جانیدو، ہمیں جانیدو۔

محافظ:۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارواحِ خبیثہ نے تمہارے جسم میں اپنا مکان بنالیا ہے اور تم بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو! تم کون ہو؟

پہلا زائر:۔ ہم زائرین ہیں۔

محافظ:۔ مگر تم ہو کون؟

دوسرا زائر:۔ ہم مسافر ہیں۔

محافظ:۔ لیکن تم ہو کیا؟

تیسرا زائر:۔ (بہت زیادہ عاجز ہو کر) ہم جو کچھ بھی ہیں تمھیں اس سے کیا ہم کو صرف راستہ دیدو۔ کیونکہ تاریکی گہری ہوتی جاتی ہے اور شفق کا رنگ دُھندھلا پڑتا جاتا ہے۔

سب زائرین:۔ (پہلے سے زیادہ بیقرار ہو کر) ہمیں جانے دو، ہمیں جانے دو۔

محافظ:۔ (کرخت لہجے میں) تمھاری بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بتاؤ کہ تم ہو کیا؟

پہلا زائر:۔ (شکوک سے بھرا ہوا) ہم کیا ہیں؟

دوسرا زائر:۔ (بیصبری سے) ہم زائرین ہیں۔

تیسرا زائر:۔ (یقین دلاتے ہوئے) ہم لوگ مُسافر ہیں۔

محافظ:۔ (فیصلہ کن انداز سے) تم نہیں جاسکتے۔

(ٹھیک اسی وقت دُور سے موسیقی سنائی دیتی ہے
اور کانوں میں کسی شخص کے گانے کی آواز آتی ہے
زائرین آپس میں سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں۔)

آواز:۔ (گاتے ہوئے لہجے میں) تم جوانتے حسین اور بھلے لوگ ہو، غلامی کی زندگی بسر کرنے کیلئے نہیں پیدا ہوئے۔ تم اس لئے نہیں بنائے گئے کہ مُردہ زندگی گذارو اور موت کے آغوش میں پڑے ہوئے قرنوں کو غبار کو تکتے رہو اور منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالو آزادی کے بچّوں اٹھو اور موت کا جوا اُتار پھینکو۔

سب زائرین:۔ (خوش ہو کر چلّانے لگتے ہیں) ہم آزادی کے بچّے ہیں ہم آزادی کے بچّے ہیں۔ ہمیں جانیدو۔

آواز:۔ (اور قریب سے) تم جو اتنے خوبصورت اور نیک سیرت انسان ہو موت کی زندگی بسر کرنے کیلئے نہیں پیدا ہوئے، بڑھو، فتح کی طرف بڑھو، اپنی تلواریں نیام سے نکالو، سینہ تان کر مقابلہ کرو اور موت کا جُوا کو پھینکنے کیلئے آگے بڑھو جو مدّتوں سے تمھارے کاندھوں پر رکھا ہوا ہے۔ ہے کوئی ایسا جو طاقتور عوام سے بحث کی جرأت کرے؟ آزادی کے بچّو بڑھو اور موت کا جوا اُتار پھینکو۔

(ایک دراز قد اور جسیم شخص جس کے چہرہ پر نقاب
پڑی ہوئی ہے جس میں دیکھنے کیلئے دو چھید کے بنے
ہوئے ہیں دکھائی پڑتا ہے اور دروازہ پر محافظ
کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو جاتا ہے۔)

محافظ:۔ (نووارد سے) اور تم؟ تم کون ہو؟

نووارد:۔ میں "جفتا" ہوں، میں بے نام ہوں، میں لوگوں کو قسمت سے بدلہ لینے کیلئے تیار کرتا ہوں۔ مدّتوں سے ہم گرد وغبار کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں اور تمھارے بے رحم پیروں سے کچلے جارہے ہو۔ لیکن اب ہم ایک بڑھتا ہوا طوفان بن کر اٹھے ہیں، تخریب کیلئے اور تعمیر کیلئے۔

محافظ:۔ (بدحواس ہو کر) میری . . . میری . . . . . . میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

نووارد:۔ کیا تم کبھی سمجھ سکتے ہو، کیا تم جو اسی دُنیا کے دروازے کے نگہبان جواب ختم ہو رہی ہے۔ کبھی سمجھ سکو گے؟ کیا تم ان کو سمجھ سکتے ہو جن کو تم نے ہمیشہ دھوکا دیا ہے اور اپنے پیروں سے خاک سمجھ کر روندا ہے۔ مگر اب تم سمجھو گے جب نشتر کی دھار تمھارے گلے پر ہوگی، سمجھے۔ (زائرین سے جواب تک سکتے کی حالت میں گوش بر آواز تھے) تم سکتے کے عالم میں کیوں کھوئے ہوئے ہو؟ اب وقت آگیا ہے۔ اٹھو، اور آگے بڑھو کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے۔ بڑھو، اس محافظ کی پرواہ نہ کرو۔ اور اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھو۔

زائرین:۔ (سکتے سے بیدار ہو کر چلّاتے ہیں) آزادی کی طرف! آزادی کی طرف! ہمیں جانے دو، ہمیں جانیدو۔

محافظ:۔ (آگے بڑھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر روکتا ہے) میں تمھیں یہاں سے گزرنے نہ دونگا، میں یہ نہیں کرسکتا (اور زیادہ تُرش رُو ہو کر) نادان نہ بنو، وہ سایہ کی دُنیا ہے، وہاں کے سایہ جنگ ہیں، وہاں مستقل انقلاب ہے، اور یہ ایک مسرّت آگیں سرزمین ہے، وہاں محض خون اور موت ہے، وہاں انسان کی تمام خوبیوں کا خون کر دیا گیا ہے۔ معبد اور حکومت

کی چوبیں ہلادی گئی ہیں، روحانیت کے سب راستے بند کر دیئے ہیں۔ اور خدا کو اس کی موروثی کائنات سے جلاوطن کر دیا ہے، بیوقوف نہ ہو وہ سرزمین تمھارے لئے نہیں ہے۔

نوواردؔ:۔ کیا خوب! سب جھوٹ، تم اسی طرح محض اپنی گفتگو اور ستانی سے لوگوں کو دھوکا دیتے ہو، ایسے وعدوں سے جو سچائی کو چھپا دیتے ہیں۔

جنگ کون کرتا ہے؟ وہ کہ تم؟ کس کے لئے؟ کیوں حقیقتاً کس کے لئے؟ انسان کی تمام خوبیوں کا خون کون کرتا ہے، تمھاری ہر بات جھوٹی ہے، تم جھوٹ پر اپنی بنیاد رکھتے ہو اور بڑی چالاکی سے صداقت پر پردہ ڈالتے ہو، شفق میں تمھیں صرف تشدد اور دہشت دکھائی دیتے ہیں۔ مگر تم نے ذاتی مفاد کیلئے ہمیشہ یہی کھیل کھیلا ہے۔ لوگوں کو خیالی فرشتے، مذاہب جنت اور تصوف کے بھلاووں میں ڈالے رکھنا تمھارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے مگر اس طرح تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو۔ خدا اور روح، کیا خوب!

(زائرین سے) اس کی بکواس پر کان نہ دھرو، اس کی غضب آلود دیوانگی پر دھیان نہ دو۔ کیا تم اپنی منزلِ مقصود پر اس طرح پہنچ سکو گے؟ یہ باتوں میں بہلانے کا ایک طریقہ ہے۔ جنکو بھی یہ اپنے نبرکا نشانہ بنا لیتے ہیں ان کو اسی طرح بیوقوف بناتے اور دھوکا دیتے ہیں اور ان مظلوموں کو معلوم بھی نہیں ہونے دیتے اسکا خاتمہ کر دو، اس کو مار ڈالو اور دروازہ سے ہو کر آگے بڑھو۔

محافظ:۔ (پریشان ہو کر) نہیں، نہیں، نہیں، میں جان بوجھ کر تمھیں موت کے منہ میں نہ جانے دوں گا۔

نوواردؔ:۔ جنون میں جتنا جی چاہے بکواس کرو، مگر ہم پر اب تمھاری ریاکاری کا اثر نہیں ہو سکتا (زائرین سے) کھڑے ہوئے منہ کیا تک رہے ہو؟ کب تک انتظار کرو گے اور جمود کے عالم میں ایک دوسری کا منہ دیکھتے رہو گے۔

پہلا زائر:۔ (محافظ سے) ہم تمھاری خلاف ورزی کرینگے۔

دوسرا زائر:۔ ہم تم کو قتل کر ڈالیں گے۔

تیسرا زائر:۔ ہم تمکو مار ڈالیں گے۔ (سب سے آگے بڑھتے ہوئے) چلو، چلو، آگے بڑھو۔

محافظ:۔ مگر میں دروازہ میں قفل لگا دوں گا۔

پہلا زائر:۔ تمھاری ہمت نہیں پڑ سکتی۔

دوسرا زائر:۔ یہ دیکھو ہم جاتے ہیں۔

تیسرا زائر:۔ لو ہم جا رہے ہیں۔

سب:۔ ہم جاتے ہیں، ہم جاتے ہیں، ہم جاتے ہیں۔

(جونہی سب لوگ محافظ کے قریب آتے ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا برا وقت آگیا ہے۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر زمین پر گر پڑتا ہے نوواردؔ کی قیادت میں سب آگے بڑھتے ہیں۔ اور محافظ کو پیروں سے روندکر گاتے ہوئے چلے جاتے ہیں)

(سب گاتے ہیں)

ہم شست قدم ہونے پر بھی\
آگے ہی بڑھتے جائیں گے\
شفاف شفق کے سایہ میں\
محرابِ اُفق کو پائیں گے\
آزاد ترانے گائیں گے\
گائیں گے بڑھتے جائیں گے\
آزادی کے شیدا ہیں ہم\
آزاد فضا میں جائیں گے

پردہ گرتا ہے

احمد علی

کرسمس کی ایک شام

مجھے یاد نہیں کہ یہ کونسا سال تھا۔ سارا مہینہ میں نے ایسی وحشیانہ مسرت کیساتھ شکار کرتے گذار دیا جو ایک نئے جذبہ کے مسلط ہونے پر آدمی محسوس کرتا ہے۔

بین نارمنڈے کے علاقہ میں، اپنے ایک نا کتخدا چچا زاد بھائی بون وَل کے ہاں، اس کی دیہاتی حویلی میں رہتا تھا۔ میرے ساتھ ایک خادم اور ایک محافظ شکار بھی تھا۔

سیاہی مائل سفید رنگ کی یہ پُرانی حویلی ایک قلعہ کے مانند تھی۔ شاہ بلوط اور صنوبر کے درختوں سے بنی ہوئی روشوں نے اُسے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ان درختوں میں ہوا ہر وقت دہشت انگیز آواز کے ساتھ سائیں سائیں کرتی رہتی تھی۔ اور گرد و پیش کی المناک فضا سے یوں محسوس ہوتا تھا گویا یہ حویلی کئی صدیوں سے ویران پڑی ہے۔ پُرانا ساز و سامان ہی اس کے کشادہ کمروں کی زینت تھا۔ یہ کمرے اب بالکل متروک الاستعمال تھے۔ مگر گیلری میں لٹکی ہوئی تصاویر سے پتہ چلتا تھا کہ کبھی یہاں ایسے لوگ آباد تھے جو اپنے شریف خصلت ہمسایوں کا بڑی گرمجوشی کے ساتھ استقبال کرتے تھے۔

یہاں صرف ایک ہی کمرہ رہائش کے قابل تھا جس میں ہم لوگ اقامت گزیں تھے۔ یہ ایک بڑا وسیع بادرچیخانہ تھا جس کی تاریک فضا کو روشن کرنے کیلئے ہمیں بار بار انگیٹھی میں ایندھن جھونکنا پڑتا تھا۔ ہر شام آگ کے قریب مختصر سی نیند سے لطف اٹھانے کے بعد۔ جب ہمارے بھیگے ہوئے جوتوں میں سے کچھ وقت تک بخارات نکلتے رہتے تھے اور ہمارے کتے، جو ہماری ٹانگوں کے درمیان دبکے بیٹھے شکار کے خواب دیکھتے رہتے تھے۔ ہم اوپر سونے کے کمرے میں چلے جاتے تھے۔ یہی ایک ایسا کمرہ تھا جسمیں چوہوں کے خوف سے فرش بچھ رہا تھا۔ اور اوپر سے پلستر کر دیا گیا تھا۔ ان بندوقوں، کوڑوں اور نرسنگوں کے باوجود بھی، جو دیواروں پر لٹک رہے تھے، یہ کمرہ بے رونق سا معلوم ہوتا تھا۔ ہم اس یخ بستہ کمرہ کے دو کونوں میں کانپتے ہوئے بستروں پر پڑے رہتے تھے۔

حویلی کے سامنے، ایک میل کے فاصلے پر، آگے کو جھکی ہوئی چٹانوں کی اونچی اونچی چوٹیاں سمندر میں گرتی رہتی تھیں۔ دن رات سمندر کی تیز و تند ہوائیں دیو پیکر درختوں کی مسلسل جنبش میں رکھتی تھیں۔ اور مرغ باد نما متواتر "چوں چوں" کرتا رہتا تھا۔ جب ہوا حویلی کی سلیٹ سے بنی ہوئی شکستہ، بڑے بڑے دودکشوں اور ہمیشہ کھلی رہنے والی کھڑکیوں کے راستے اندر داخل ہوتی تو ساری عمارت دردناک آواز سے گونج اٹھتی تھی۔

اُس روز سردی غضب کی تھی، شام ہو چلی تھی، ہم انگیٹھی کی دہکتی ہوئی آگ کے قریب جہاں ایک خرگوش اور تیتر بھونے جا رہے تھے کھانے پر بیٹھنے کیلئے تیار تھے۔

میرے چچا زاد بھائی نے نگاہ اٹھا کر کہا: "آج رات سوتے وقت شدت کی سردی ہوگی!"

میں نے بے اتفاقی سے جواب دیا: "ہاں، مگر کل صبح مرغابیاں بہت ملیں گی۔"

باورچن نے میز کی ایک طرف ہمارے لئے پلیٹیں چن دیں اور دوسری طرف دیگر خدمت گاروں کیلئے۔ کہنے لگی: "بھلے مانسو! خبر ہے کہ آج "کرسمس" کی شام ہے۔

ہمیں قطعاً خبر نہ تھی۔ کیونکہ کیلنڈر سے ہمیں کوئی سروکار نہ ہوتا تھا۔

میرے بھائی نے کہا: "ہاں یہی وجہ ہے کہ آج سارا دن گرجوں میں گھنٹے بجتے رہے۔ آج نصف شب تک عبادت ہوتی رہیگی۔"

باورچن بولی: "ہاں اس وجہ سے بھی کہ غریب فرزل آج چل بسا۔"

فرزل ایک بوڑھا گڈریہ تھا۔ اور اس علاقہ میں بہت مشہور تھا۔ اس کی عمر چھیانوے برس کی تھی۔ اور آج سے ایک ماہ قبل تک جب ایک تاریک رات کو کسی گڑھے میں گر پڑنے کے باعث اُسے سردی لگ گئی تھی۔ اس نے عمر بھر بیماری کا ایک دن تک نہ دیکھا تھا۔ کل سے بیچارا ابتری حالت میں بستر پر پڑا تھا۔ اور لمحہ بہ لمحہ کمزور تر ہو رہا تھا۔

میرے بھائی نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا: "اگر تم چاہو تو کھانے کے بعد ان غریب لوگوں کے پاس چلیں۔"

غریب لوگوں سے مُراد بوڑھے گڈریے کا کنبہ تھا، جو بوڑھے کے پچپن سال کی عمر کے نواسے اور نواسے کی چوّن سالہ بیوی پر مشتمل تھا۔ اس کے بچے کئی سال ہوئے، مر چکے تھے۔ اب وہ گاؤں کی دائیں جانب نہایت ہی خستہ جھونپڑی میں رہتے تھے۔

یہ شاید کرسمس ہی کا شیریں خیال تھا جو ہم اس تنہا مقام پر مصروفِ گفتگو ہو گئے۔ ہم نے ایک دوسرے کو زمانہ گذشتہ کی کرسمس کی شاموں کے متعلق دلچسپ کہانیاں سنائیں۔

ان ہی باتوں میں کھانا طویل ہو گیا۔ نہ جانے ہم کتنے پائپ بھر بھر کر پی گئے۔ ہم اس وقت ایسی مسرت سے محظوظ ہو رہے تھے۔ جو تنہا زندگی بسر کرنیوالے رازداں دوستوں پر اچانک ہی مسلط ہو جاتی ہے۔ ہم مسلسل باتیں کر رہے تھے، اور اُن یادگاروں، دل کے اُن سربستہ رازوں کو زندہ کر رہے تھے جو ان طویل لمحوں میں از خود زبان سے نکل جاتے ہیں۔

خادم جو دیر سے کہیں غائب تھا، اب پھر نمودار ہوا۔ کہنے لگا: "میں عبادت کیلئے جا رہا ہوں جناب۔"

میرا بھائی بولا: "اتنی جلدی!"

"پونے بارہ بج چکے ہیں۔"

"چلو ہم بھی چلیں۔ رات کی عبادت میں بڑا لطف آتا ہے۔"

میں نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا اور سمور دار شکاری کوٹوں میں لپٹے ہم چل پڑے۔

شدید سردی ہمارے چہروں کو کاٹ رہی تھی۔ اور ہماری آنکھوں سے پانی کی نہریں جاری تھیں۔ تیز و تند ہوا حلق کو خشک کرتی ہوئی پھیپھڑوں تک سرایت کر رہی تھی۔ صاف و شفاف آسمان پر بیشمار ستارے نظر آ رہے تھے۔ اور دھندلی فضا میں دھیمی دھیمی روشنی کے ساتھ چمک رہے تھے۔ اُن کی روشنی آگ کی طرح چمکیلی نہ تھی بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہ برف کے سفید سفید گالے ہیں جو ستاروں کے مانند آسمان پر چمک رہے ہیں۔ دور فاصلہ پر، ہم سخت اور ناہموار زمین پر کسانوں کی کھڑاؤں کی آوازیں سُن رہے تھے۔ قریب کے گاؤں میں گھنٹوں کی آوازیں رات کے گہرے سکوت کو توڑ رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ گاؤں کے لوگ ابھی جاگ رہے ہیں۔ فضا میں ان دھیمی دھیمی آوازوں کو سُن کر مرغ اذانیں دینے لگے تھے۔ اور جب ہم اصطبل کے قریب سے گذرے تو ہم نے دیکھا کہ مویشی زندگی کے اس سمندر سے جو اس وقت ہر جگہ موجزن تھا، اپنے آرام میں خلل پڑنے سے ہوئے مضطرب

نظر آرہے تھے۔

جونہی ہم گاؤں کے قریب پہنچے۔ میرا بھائی کہنے لگا "یہ ہے فرنل کی جھونپڑی۔ چلو اندر چلیں" ہم نے دروازہ بہتیرا کھٹکھٹایا مگر بے سود۔ ایک ہمسایہ جو گرجے کو جارہا تھا۔ بولا یہ سب لوگ عبادت کو چلے گئے ہیں تاکہ بوڑھے فرنل کیلئے بخشش کی دُعا کریں۔

میرا بھائی کہنے لگا "ہم آئی دفعہ اُن سے ملاقات کرلیں گے"

زوال پذیر چاند مغربی اُفق پر دھیمی دھیمی روشنی ڈال رہا تھا۔ تاریک فضا میں ہر طرف سے لیمپوں کی جھلملاتی ہوئی روشنی رقص کرتی معلوم ہوتی تھی۔ کھیتوں میں بھی ہلکی ہلکی روشنی نمودار ہورہی تھی۔

گرجے کے کھلے دروازوں میں سے روشن استھان نظر آرہا تھا۔ وسط میں چھوٹی چھوٹی شمعیں دائرے کی صورت میں رکھی تھیں۔ فرش پر دائیں جانب صنوبر کے پتوں سے بنی ہوئی ایک شکل حضرت عیسےٰ کے بچپن کے زمانہ کو ظاہر کرتی تھی۔ عبادت شروع ہوگئی۔ کسانوں نے اپنے سر جھکا دیئے۔ عورتیں عبادت کیلئے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئیں۔ اور یہ سادہ لوح انسان، جو انتی یخ بستہ رات میں محض عبادت کی غرض سے جاگ رہے تھے۔ بے حد انہماک کے ساتھ اس میں مصروف ہوگئے۔ ان پر اس وقت رقت طاری تھی۔ اور بہت خوش معلوم ہوتے تھے۔ سرد ہوا سے بتیاں جھلملانے لگیں۔ میرے بھائی نے کہا "چلو اب چلیں" ابھی کسان بڑی سرگرمی اور اشتیاق سے سجدہ ریز ہی تھے کہ ہم ویران سڑک پر چل پڑے۔ اور پھر اُن ہی باتوں میں مشغول ہوگئے، جو گرجے میں جانے سے پہلے ہماری گفتگو کا موضوع تھیں۔ ہم بڑی دیر تک باتوں میں لگے رہے یہاں تک کہ جب ہم گاؤں پہنچے تو عبادت ختم ہوچکی تھی۔ فرنل کی جھونپڑی میں سے روشنی کی ایک شعاع نمودار ہورہی تھی۔

میرے بھائی نے کہا "یہ سب لوگ بوڑھے فرنل کی لاش کے پاس بیٹھے ہیں۔ چلو اندر چلیں اور دیکھیں کہ یہ غریب انسان کیا کررہے ہیں۔ وہ ہمیں دیکھکر ضرور خوش ہونگے" انگیٹھی میں چند چنگاریاں باقی تھیں اور وہ بھی بجھ رہی تھیں۔ تاریک کمرے میں گرد کی تہیں جم گئی تھیں اور سالخوردہ ساز و سامان میں سے سڑے ہوئے خون کی سی بُو آرہی تھی۔ ایک بڑی میز کے نیچے، اس کی پوری لمبائی تک، ایک بڑا صندوق بنا ہوا تھا۔ ایک ٹوٹا پھوٹا آہنی شمع دان چھت کے درمیان میں لٹک رہا تھا جس میں ایک شمع بدبودار دھواں چھوڑ رہی تھی۔ دونوں میاں بیوی اکیلے ہی کرسمس کا لُطف اٹھا رہے تھے۔ غمگین، اداس اور کسانوں کے سے سادہ انداز میں وہ شکم پُری کررہے تھے۔ ایک پلیٹ ان کے درمیان پڑی تھی۔ اس میں سیاہی مائل رنگ کے حلوے کی ایک بڑی مقدار رکھی تھی۔ حلوے میں سے تیز خوشبو آرہی تھی۔ کبھی وہ حلوے کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اُسے روٹی پر پھیلاکر آہستہ آہستہ چبالیتے تھے۔ جب میاں کا گلاس خالی ہوجاتا تھا تو بیوی مٹی کے جگ میں سے شراب لیکر گلاس بھر دیتی تھی۔

انھوں نے ہمیں بیٹھ جانے اور کھانے میں شریک ہونیکی دعوت دی۔ ہم نے انکار کر دیا اور وہ پھر کھانے میں مشغول ہوگئے۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد میرا بھائی بولا "ہاں اینتھائن تو تمھارے دادا چل بسے"

"ہاں صاحب! اسی دوپہر کو بیچارے انتقال کرگئے"

عورت نے آہستہ سے شمع کا گُل تراشا۔ میں نے یونہی سکوت کو توڑنیکی غرض سے کہا "بیچارا بہت عمر رسیدہ تھا، تھا نہ!"

کہنے لگی "ہاں بیچارے کا وقت آپہنچا۔ انسان آخر فانی ہی تو ہے"

میرے دل میں معاً اس بیحد سالہ بوڑھے انسان کو دیکھنے کی غیر معمولی خواہش پیدا ہوئی۔ اور میں نے اینتھائن سے اس بات کا اظہار کیا۔ اس بات پر میاں بیوی یکایک مضطرب نظر آنے لگے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کا نظریہ معلوم کرنے لگے۔ میرے بھائی

نے جب یہ کیفیت دیکھی تو وہ اور زیادہ مُصر ہوا۔ پھر میاں پُر اسرار نگاہیں ہماری طرف اٹھا کر پوچھنے لگا: "اس بیچارہ کو دیکھنے سے تمھیں کیا فائدہ پہنچیگا؟"

میرا بھائی بولا: "کچھ نہیں۔ مگر اسے دکھانے میں تمھارا کیا ہرج ہے!"

میاں نے اپنے کاندھے سکیڑتے ہوئے کہا: "میں تیار ہوں۔ صرف اس وقت تکلیف کا خیال ہے"

ہم نے بہتیری کوشش کی مگر ان میں سے کسی فرد پر بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی آنکھیں نیچی کئے ترش رو ہو کر بیٹھے یوں معلوم ہوتے تھے گویا ہمیں کہہ رہے ہیں: "یہاں سے چلے جاؤ۔ یہاں سے چلے جاؤ"

میرا بھائی بولا: "آؤ اینتھائن ہمیں اس کے کمرے میں لے چلو"

میاں بولا: "صاحب کیا فائدہ۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں نہیں ہے"

عورت نے کہا: "ہاں ہمارے پاس سوائے اس صندوق کے اور کوئی جگہ نہ تھی۔ ہم نے اگلی صبح تک اسے یہیں رکھ چھوڑا ہے" اور میز اٹھا کر وہ شمع کے ساتھ اس صندوق پر جھکی تاکہ اس کا اندرونی حصہ روشن کر کے بوڑھے فرنل کا چہرہ ہمیں دکھا سکے۔ صندوق کے پیندے میں ہم نے گٹھڑی کی طرح بندھی ہوئی کوئی چیز دیکھی۔ جس کے ایک سرے سے سفید بالوں والا سکڑا ہوا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اور دوسرے سرے سے برہنہ پیر دکھائی دے رہے تھے۔ یہ تھا بوڑھا فرنل جس کا جسم بالکل سکڑ چکا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور گدڑیئے کے چغے میں لپٹا ہوا، آخری نیند سو رہا تھا۔

اس کا نواسہ اس صندوق کو جس میں اس کا بے جان جسم پڑا تھا میز کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔

میرا بھائی یہ دیکھ کر غصّے سے لال پیلا ہو گیا۔ اور کہنے لگا: "بھلے آدمیو، تم نے اسے اس کے بستر ہی پر کیوں نہ لٹا دیا؟"

مگر عورت کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور وہ جلدی سے کہنے لگی: "صاحب! ایسا کیونکر ہو سکتا تھا؟ ہمارے پاس صرف ایک ہی بستر ہے اور اسی پر ہم سب سو رہتے تھے۔ مگر جب یہ زیادہ بیمار رہا ہم فرش پر سوتے رہے۔ ان دنوں فرش بہت سخت اور بہت سرد محسوس ہوتا ہے۔ اب کہ دوپہر سے اس کا انتقال ہو چکا ہے، ہم نے دل میں سوچا کہ چونکہ اس کی قوت احساس یکسر زائل ہو چکی ہے اسے بستر پر لٹانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ کیوں نہ ہم کل تک اسے اسی صندوق میں رکھ چھوڑیں۔ اور اس یخ بستہ رات میں بستر پر خود سو رہیں۔ ہم بے جان جسم کے ساتھ نہیں سو سکتے۔ کیا یہ ٹھیک نہیں ہے؟"

میرا بھائی غصّے کی حالت میں زور سے دروازے کو دھکیل کر باہر چلا آیا۔ اور میں ہنستا ہوا اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ یہاں تک کہ ہنستے ہنستے میری انتڑیوں میں بل پڑنے لگے۔

(موپساں) ——— ❊ ——— طاہر قریشی

"ملاحظہ ہو!"

گنگا جمنا کے بیچ ایک چھوٹے سے قصبے میں جون کی گرمیاں! اے معاذ اللہ کی پناہ!" لو چل رہی تھی، خاک اڑ رہی تھی، بھوبل برس رہی تھی، مختصر یہ کہ دوزخ کا لطف آرہا تھا۔ امیر امرا منصوری یا نینی تال پر، اور ہم ننگ دھڑنگ بہ یک دھوتی سفید کہ از تار عنکبوت ہم باریک تر بود، پیچیدہ و ملفوف، گھر کے ایک نمناک گوشہ میں بانس کی کھرّی کھاٹ پر نیم خفتہ و نیم بیدار افتادہ بودیم۔

"صبح بنارس، شامِ اودھ" دیکھ چکے ہو، آؤ تمھیں شبِ مالوہ بھی دکھا دیں، گھر سے ٹکٹ لو اور بیک گردشِ لیل و نہار سیدھے جھانسی اور وہاں سے ریل تمھیں بدلے یا تم ریل کو، مانک پور لین کے پانچویں اسٹیشن پر اترو، یہاں بھاڑے کے ٹٹو ملیں گے ڈیڑھ روپے میں ایک راس یابو، اور تین چار گھنٹے میں بندیل کھنڈ کے اتار چڑھاؤ، ندی نالے پہاڑ جنگل طے کر لو گے تو مجھے دیدہ و دل فرشِ راہ، اپنا منتظر پاؤ گے۔ کالے تیتر اور چکارے کا شکار، مہوبہ کے خستہ ٹھبر ٹھبرے پان اور مالوے کی سہانی رات تمھارا انعام ہے۔ اپنا ۳۲ — ۴۰ ونچسٹر رائفل ساتھ لائیو، اور تھوڑا سا نورتن کا اچار، اور ہاں بستر و ستر کی ضرورت نہیں، نقدم آنا، اشیاءِ مایحتاج سب مہیا ہوں گی۔"

اشیاءِ مایحتاج کی ترکیب پُر معنی، اور الفاظ خط زدہ تھے۔ اور یہ تھا اللہ جانے کس درجہ کی ایک دیسی ریاست کے ایک آدھ چھوڑ۔ باقی خانوں کے واحد مہتمم ہمارے کرمفرما مرزا عسکری بی۔اے ناکام کے طویل خط کا نچوڑ، ڈاکیہ لایا، ہم نے پڑھا، ساتھ ہی محسوس ہوا کہ جیسے تلوے کھجا رہے ہوں اور پاؤں میں چکر ہو۔

اب لازماً سوال پیدا ہوا زادِ راہ کا، اور سچ پوچھتے ہیں آپ تو ایک ذری پیچیدہ ہی تھا، یوں کہ خادم نے اپنے خانگی بجٹ کا توازن کچھ اس حساب سے قائم کیا ہے کہ آپ کی دعا سے مداخل سے مخارج ہمیشہ اضعافاً مضاعفہ ہی رہتے ہیں۔ قریب تھا کہ حالات اندوہ ناک صورت اختیار کر لیں، سکون و انجماد کے ساتھ ارادہ بھی بہ فصل آئندہ فسخ کرنا پڑے کہ ع مژدے از غیب بروں آید و کارے بکند۔ گتھی سلجھ گئی۔ اور قبلہ گاہی کی اجازت کے علاوہ زادِ راہ کے پچاس اور امام ضامن کے نام سے ایک روپیہ کی منظوری ہوئی۔ اسبابِ سفر میں ایک نو وہی میان میں کیا ہوا رفل، ایک تبان چلغی کا، اور ایک مختصر سا سوٹ کیس۔ یہ تیسرا عدد البتہ عمرو عیار کی زنبیل یا مداری کی پٹاری سے کم نہ تھا۔ دو جوڑ کپڑے، پانوں کا ڈبہ۔ چھالیہ تمباکو کا الفربہ بٹوہ، ڈبیہ دیا سلائی کی، سوئی دھاگا، ٹنچر آیوڈین، نمکِ سلیمانی، جلاب کی گولیاں، منجن کی پڑیا اور اعادۂ شباب کا ضروری سامان مثلاً کنگھا، آئینہ، برش، سیفٹی ریزر، ہیئر لین، پومیڈ، روز وغیرہ۔ حسنِ اتفاق سے ہم واقع ہوئے ہیں اماں باوا کے لاڈلے، اور شاید بلاشرکتِ غیرے افزائشِ نسل کے تنہا ذمہ دار، امام ضامن کے علاوہ جس کے متعلق پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ متھرا پر ملائی کی کھرچن اور آگرہ کی دال موٹھ کا کفیل ہوگا۔ ہم پر زِ فرق تا بہ قدم کئی قسم کی آیتیں اور منتر پڑھ کر دم کیے گئے۔ اور گھر والوں کی یہ مجموعی دعا لیتے ہوئے کہ "جاؤ سدھارو، جیسے پیٹھ دکھائی ہے منہ بھی دکھانا" برآمد ہوئے تو اسٹیشن۔

وقت تھا، آنے والی گاڑی کا انجن افقِ بعید پر ایک کالے دھبے کی طرح نظر آرہا تھا۔

چونکہ دیسی ناداری کے تحقیقاتی کمیشن کو ابھی آخری اعداد و شمار کا انتظار ہے، اور چوتھے درجہ کا رواج معرضِ التوا میں ہے، بدرجہ مجبوری "سیکنڈ کلاس" کا ٹکٹ کٹوایا اور بسم اللہ مجریہا کہتے ہوئے جا ڈٹے ایک ڈبہ میں تو اب جدھر دیکھیے ع کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست۔

ریل کا دھواں، سُلفوں کی مہک، اشہار پوری کے خالی ڈبے، منھ راجی کے جاتری، دھوتی بند ذکور اور لہنگے پوش مذکورات، اور اُن کے حوائج ضروری کے سلسلہ میں ننگے بچے، اور بلا ترتیب حروف تہجی ان کے سیالات و مغلظات، اب ہنسئے تو چھوٹی لین، بالاخرچ، زیرنشیں پر منظر تک بغیر کسی حادثہ یا ماجرے، اکے مع الخیر والعافیہ پہنچ گئے۔

یہاں سے جی، آئی، پی تھی۔

یہ زمانہ وہ تھا کہ سمندر پار کی ساری پیٹ بھری دُنیا میں جوتی دال بٹ رہی تھی۔ اور ھندوستانی دساور سے بھی امدادی قرضے لئے جا رہے تھے۔ جدھر دیکھو نگروٹ بگڑی تھی۔ ہمارے درجہ میں بھی ایک حوالدار قسم کے صاحب بھرتی کا چھٹا بانس لئے درجن بھر گرفتار و نکو نتھی کئے بیٹھے تھے۔ ریل کیا تھی چلتا پھرتا پنچ قومی عجائب گھر تھا۔

اتنے میں ایک ٹکٹ کلکٹر صاحب نہایت ڈکٹیٹرانہ شان سے "ٹکٹ ٹکٹ" کہتے نازل ہوئے۔

ہماری باری آئی تو حسبِ عادت ہستم جوتے کے بند کھولنے شروع کئے۔ وہ سمجھے کہ شاید پاؤں کی عزت ہات میں آنیوالی ہے اور صورتِ حال مخدوش، جھک کر ذرا پیچھے ہٹے اور دُور ہی سے پنسل ہلا کر کہنے لگے "وِل ٹکٹ؟"

جوتا اتر چکا تھا اور اب پتابے کا منبر تھا۔ اندر سے ٹکٹ نکلا تو اُن کے دم میں دم آیا۔

ٹکٹ کے متعلق ہمارا یہ نہایت قدیم اور محفوظ اصول شاید انھیں بے ضابطہ معلوم ہوا کیا کہ ناک بھوں چڑھا کر انھوں نے ہمیں اپنی نبی کی روشنی میں دھر لیا، نظر پڑی بندوق پر، کندھے اچکا کر ہمیں دیکھا، تھرڈ کلاس کو دیکھا اور دوسرا سوال فیر کیا۔

"Have you got a license for this gun?" (تمہارے پاس اس بندوق کا لائسنس ہے)

ہمیں سوجھی چھیڑ کی، کہا:۔ "Not only for the gun. but for shooting with the gun even." (یعنی، نہ صرف بندوق کا بلکہ بندوق سے مار ڈالنے کا بھی)

یہ سنتے ہی صاحب بہادر کن انکھیوں سے ہمیں دیکھتے ہوئے "بیک شنٹ" ہو گئے۔

اب دل لگی سُنئے کہ آپ نے جاتے ہی پولیس میں رپورٹ داغ دی کہ "تھرڈ کلاس بوگی نمبر ۔ میں خاکی ڈریس پہنے ایک خطرناک اور مُسلح جرائم پیشہ سفر کر رہا ہے۔"

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا، تھانیدار سوچے کہ اچھا شکار گھا، اگر ثابت ہو گیا جیسا کہ ہم ثابت کر لیں گے، تو اس خاکسار کو بھی دبوچیں گے، اور بیک گردش چرخ نیلوفری، عہدہ، ترقی اور نام بھی کما لیں گے۔ وردی ڈانٹ، کرچ لگا، ترپ ترپ کرتے آن دھمکے، اور مستقبل کی خوشی میں ایسے سٹ پٹائے کہ فرمانے لگے "تم بغیر بندوق کے لائسنس لئے جا رہے ہو۔ حراست میں آنا ہوگا۔" ہم مُسکرائے تو اور بھڑکے۔

"ہم سب انسپکٹر ازروئے قانون سوال کرتے ہیں کہ اس بندوق کا لائسنس کہاں ہے؟"

ہم نے جواب دیا کہ واللہ اجون کا بھی کیا پُر تاثیر مہینہ ہے۔ داروغہ جی! اس بندوق کیلئے لسن پیاز کی ضرورت نہیں۔ اس میں کارتوس کا بگھار دیا جاتا ہے۔ کمر کی پیٹی دکھا کر۔ اور ملاحظہ ہو، ایک دو کا نہیں پورے دو سو کا۔

اب تو یقیناً داروغہ جی کے سامنے پولیس کی کپتانی ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ لپک کر چاہتے تھے کہ کلائی پر ہات ڈالیں جو ہستم کہا، بوکھلائے کی سند نہیں، قبلہ، یہ بگلوری حاضر ہے۔ پھر آہستہ سے کہا "ہمارا نام ہے خانبہادر آوارہ آف ۱۹۱۸ء، سرکاری گزٹ دیکھئے، بندوق تو بندوق

ہمیں تو سرکار سے توپ باندھنے کی بھی اجازت ہے ۔

• خان بہادر، اور گزٹ کا نام سُنا تو دزا داروغہ جی کی وردی ڈھیلی پڑی، اور وہ ڈبے سے یہ دھمکی دیتے ہوئے نکلے کہ گزٹ دیکھتا ہوں اگر ر تی برابر جھوٹ نکلا تو بغیر لائسنس کے اسلحہ آتش فشاں رکھنا، ایک، بھک سے اڑجانے والے آتشگیر مادہ کا قبضے میں پایا جانا، دو، اور تلبیس شخصی کا تیسرا چالان بھی پیش کرنا ہوگا ۔

اتنے میں گاڈ نے سیٹی دیکر ہری لالٹین کا سگنل دیا ۔

دیو پیکر انجن گرجا، اور ایک دفعہ بھق بھقا کے جو سٹتا ہے تو صد ہا قینچیوں پہ بل کھاتا، فیل مست کی طرح جھومتا ہوا جھانسی لائن پر دوڑنے لگا ۔

پلیٹ فارم کے آخری سرے پہ داروغہ جی کھڑے تھے، ریل کی شائیں شائیں میں سُنائی دیا "خان بہادر صاحب! آپ سچے سرکاری گزٹ سچا، مگر میں سب انسپکٹر کہتا ہوں کہ آپ لائسنس بغیر بندوق کے لئے جا رہے ہیں"

"ہم نے کہا سچ ہے، موسم ہی ایسا ہے"

رفل ور بغل، سوٹ کیس کا تکیہ، سوئے تو پچھلے کو ہزاروں برقی قمقموں میں جگمگاتا ہوا جھانسی کا سٹیشن، دو پہر کا کھایا پیا سب تہ نشین ہو چکا تھا، اب بھوک لگی تھی، اور بڑی مشکل یہ کہ جیسے بھوک لگی تھی وہ ایک شریف آدمی تھا اور اس وقت دوگونہ کشمکش میں مبتلا تھا، یعنی ادھر تو حلوائی کی دکان اور ہمارے درمیان خاکی سوٹ اور ویلوکاف کا بوٹ حائل تھا۔ ادھر جیب کی تہی دامنی اور ریفرشمنٹ روم کا بل کسی ایک نقطۂ اتحاد پر جمع نہیں ہو رہے تھے۔ ناچار آنکھوں پہ ٹھیکری رکھ کے مٹن چاپ اور کٹلس کے مقابلہ میں پوری کچوری اور کدو کی ترکاری کے حق میں اپنا ووٹ دینا پڑا ۔

آتما کے اس خالص سودیشی تغذیہ سے فارغ ہوتے ہی گھنٹی بجی کہ مانک پور برائے قریب المارچ تھی ۔ ہمیں ٹکٹ بدلوانا تھا، بکنگ آفس کی کھڑکی میں جھانکا، بابو صاحب دھوتی بنیان میں ننگے سر، ناک کی نوک پر عینک جمائے ڈبڈبائی آنکھوں سے کوئی رجسٹر دیکھ رہے تھے ۔

"بابوجی! ٹکٹ"

"کہاں کا؟"

"مانک پور لین پر پانچویں اسٹیشن کا"

انگلیوں پر گن کر "ٹھر کا"

ہم سمجھے کہتے ہیں "ٹھہر کے آؤ"

"بابوجی! گاڑی جا رہی ہے آپ کہتے ہیں "ٹھہر کے آؤ""

"تم کانوں کا آپریشن کراؤ۔ ہم کہتے ہیں "ٹھر کا، وہ سُنتے ہیں "ٹھہر کے آؤ""

بات واجبی تھی، باعزت پسپائی اور ٹکٹ لیکر جھپ سے گاڑی میں بیٹھ گئے ۔ جیٹی کا مرتبان اور سوٹ کیس چھینکے پر رکھا، اپنے لئے جگہ بنانے کی فکر تھی کہ ریل چل دی ۔

معاذ اللہ! ریل کیا بھونچال تھا۔ یعنی ریل پٹری پر اُچک رہی تھی، ہم ریل میں پھدک رہے تھے۔ کسی چیز کو قرار نہ تھا۔ لوٹا گلاس سی گلاس

ناشتہ دان سے ٹرنک صندوق سے اور صندوق بنچ سے مسلسل ٹکرا رہے تھے اور اس پیہم تصادم سے لے تال میں پورا آرکسٹرا بج رہا تھا۔

قریب ہی ایک بزرگ سب کی نظر بچا ئے پو پھٹنے سے پہلے ہی پیٹ کی پوجا میں مصروف تھے۔ ہر دوسرا یا تیسرا نوالہ بات یا مُنہ کے سکر نان کو آپریشن پر تُلا ہوا تھا۔

فضا کا مارا جیٹنی کا مرتبان کسی پڑوسی سے اُلجھ پڑا۔ کاغذی کارنج کا میڈان جاپان اگر دن الگ، پیندہ الگ اور ناشتہ چٹ ہیں کہ از سر تا پاشیرہ ہی شیرہ، لاحول ولاقوۃ؛

نوالہ کی جگالی کرتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا تو تقاطر ابر نیساں سے مروارید آبدار، کچھ آنکھوں میں، کچھ ریش مبارک پر، اس پر سرکے کی تیزی، اور نمک مرچ کی چرچراہٹ، گھبرا کے اُٹھے، ایک ڈھیکلی کھائی۔ ناشتہ دان مع محمولات سر بسجود۔ اور خود حضرت رکوع میں، لگے ایک سرے سے ہمیں، اچار اور ریل کو کوسنے۔ عرض کیا، قبلہ، چرھندے نہ ہوں۔ اللہ میاں نے کبھی اپنے بندوں کیلئے آسمان سے من وسلویٰ اتارا تھا، صاف ہو جائیے آپکی مسافر نوازی کے کہ اس مرتبہ آپکی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے نورتن کا اچار مرحمت ہوا ہے، مگر اتنا خیال رہے کہ متعاد سے زیادہ نہ چکھیئے گا۔ ورنہ منہ کے ساتھ پیٹ چلنے کا بھی اندیشہ ہے۔

چلتے چلتے ریل ٹھیری، سامنے بغیر پہیوں کی ایک مال گاڑی زمین پر دھری تھی اور انفرادی حیثیت سے بکنگ آفس، تارگھر، مال گودام، لیمپ روم، ویٹنگ ہال اور اسٹاف کوارٹرز کو مخلوط کر کے اس مرکب کا نام تھا "کھٹر کا ریلوے اسٹیشن"

اترے ٹکٹ دیا، بوجھ ہلکا ہو ہی چکا تھا۔ بندوق پیٹھ پر، سوٹ کیس ہاتھ میں، بابو جی سے پوچھا "بابو کہاں ملیں گے؟"

دل لگی باز بابو نے جواب دیا "بابو تو نہیں یہ بابو بیٹک حاضر ہے، قلی کو بتاکر، اور وہ ہے کانے ٹٹو کا بدھو نفر، کہاں کے ارادے ہیں؟"

منزل مقصود کا نام لیا تو کہا، لین لین چلے جائیے، آگے پگڈنڈی ہے۔ پو قدمے چلے تو بارہ کوس زمین ناپنے کے بعد آبنگی ندی، ادھر انگریزی، اُدھر جوالہ، گڈبائی۔

اس گڈبائی نے تو ہمیں بھی کھلا دیا۔

جون کا مہینہ وہ بھی بندیل کھنڈ کا، پگڈنڈی کی پیادہ روی، سونا جنگل، کہیں کہیں کوئی بندیلا چرواہا، اور بار بار کالے تیتروں کی سبحان تیری قدرت، نہ کھانا نہ پانی۔

الحاصل ٹھیک اس وقت کہ آفتاب سوا نیزے پر تھا، ندی دکھائی دی جو بھرپور جا رہی تھی۔ اب اسے پار کرنا ایک معمہ تھا، جس کا حل ایک فرتوت کشتی، اس کے بارے میں راویان اخبار و ناقلان آثار کا یہ قول فیصل سینہ بہ سینہ چلا آیا ہے کہ تحفظ ناپائداری اور خود ناخدا کا وجود اگر محذوف مان لیا جائے تو کشتی نوح کے باقیات الصالحات یہی بوسیدہ تختے تھے جو چند زنگ خوردہ کیلوں سے جڑے ہوئے ہم میں اور ہمارے مرقد آبی میں حد فاصل قرار دیئے جا سکتے تھے۔

یہ طرفہ ماجرا بطور جملہ معترضہ ذکر کے قابل ہے کہ کشتی پانی پر تھی اور پانی کشتی میں۔ شاید کسی ایسے ہی موقع واردات "پر شاعر کو "درِ دریا درون کشتی، کشتی درون دریا"۔ والا صوفیانہ مضمون ہاتھ آیا ہوگا۔

یہ دیکھکر انتشار انتشار میں خمیر اٹھ جائیگا۔ ہم نے پانی کا رُخ کیا اور رخ کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں، کہکر آنکھیں میچ، ڈانڈ لے اناڑی کے سے ہات چلانا شروع کر دیئے۔

کیا ہوا اور کیا گذری، کچھ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، مگر آنکھیں اس وقت کھلیں، جب کشتی راج کے کنارے سے ٹکرائی اور بدحواس ہو کر ریتی پر چڑھ گئی۔

کیچڑ پانی میں گل حکمت ہو کر اٹھے ہی تھے، اور زبان پر بیساختہ سے

جان بچی تو لاکھوں پائے   خیر سے بدھو گھر کو آئے

جاری تھا کہ آواز آئی، پہلے چوکی پہ ایلم (علم) لکھائیے۔ جا کر دیکھا تو ایک ٹیلے کی آڑ میں ٹین کا سائبان، اس میں ایک پرانی آرام کرسی پر داڑھی چڑھائے، خضاب لگائے، ہاتھ پاؤں پھیلائے ایک بزرگوار دراز تھے۔ جن کی ہیئت کذائی دیکھ کر خیال ہوا کہ یا تو یہ شہر کے راجہ والوں کے سرغنہ ہیں، یا شاید ریاست میں آثار قدیمہ کا محکمہ ابھی نہیں کھلا ہے۔ ورنہ پولیس کا یہ قبل مسیح ایڈیشن اس سائبان کے بجائے اسٹیٹ میوزیم کے کسی شوکیس میں ہونا چاہئے تھا۔

"السّلام علیکم!"

جواب میں کڑکڑا کے ارشاد ہوا "یہ راج ہے اور ہم پولیس، تمھاری رجسٹری ہوگی اور پھر صاحب سپرڈنٹ بہادر کا ملاحظہ"

ہم سمجھ گئے کہ ان سے کوئی سنجیدہ گفتگو بھینس کے آگے بین بجانا ہے، عرض کیا کہ "جناب کی دعا سے یہاں تک تو بیڑا آگئے ہیں۔ ندی میں البتہ بیرنگ ہو جانے کا خطرہ تھا، وہ بخیر گزشت، اب رجسٹری سے تو ہمیں رکھئے معاف، ورنہ محصول رجسٹری بذمہ رجسٹرار ہوگا۔ رہ گیا صاحب سپرڈنٹ کا ملاحظہ، یہ آپکی صواب دید پہ ہے، چاہے مسل پر 'بملاحظہ' لکھکر آگے بڑھادیں، چاہے یہیں داخل دفتر کردیں"

گفتگو کا سلسلہ قلم دوات اور ایک ہی کھاتہ نما رجسٹر کی آمد نے منقطع کردیا، لانیو الاپولیس کا جوان تھا اور ہمارا ایمان ہے کہ اس کی صورت دیکھکر اگر کسی شخص کو اقدامِ خودکشی کا شوق نہ پیدا ہو تو وہ بد ذوق در شکم مادر بہتر۔

اب ہم درج رجسٹر ہونا شروع ہوئے۔

"نام؟"

"خان بہادر آوارہ"

"والد کا نام؟"

"عالی جناب تقدس مآب حضرت قبلہ و کعبہ . . . ."

"ٹھیریئے، رجسٹر کا خانہ چھوٹا ہے اور نام بڑا معلوم ہوتا ہے، خانہ پُری بالفعل ملتوی، آگے چلئے، کہاں سے آتے ہو؟"

"گھر سے"

"شاباش، خانہ کے بالکل برابر، نہ چھوٹا نہ بڑا، کیوں آئے؟"

"اوّل تو آپکی ندی میں غریق رحمت ہوتے، یا پھر، سوئے اتفاق سے بچ گئے تو گھومتے پھرنے، دیکھنے بھالنے"

"وہ تو ہم سمجھے ہی ہوئے تھے، یقیناً تم ولایتی جاسوس ہو اور تیزی سے پولیس کی زد میں آرہے ہو"

"اپنے نزدیک تو موت کے منہ سے اس وقت نکل کر میں پولیس پر دف ہو چکا ہوں۔ آگے آپکی مرضی"

"تمھارے پاس سامان کیا کیا ہے؟"

"ملاحظہ ہو۔ اوّل تو ہم بہ نفسِ نفیس۔ پھر یہ بیگزبن رائفل، گیارہ کارتوس کا لقمہ، نصف منٹ میں ہضم، اٹھارہ خوراکیں کمر میں موجود، پھر بھی احتیاطاً دو فاضل، اس کے بعد یہ سوٹ کیس جس میں کپڑے بدلنے کا مکمل سٹ، اور اخیر میں واسکٹ کے اندر تھرڈ کلاس کا ٹکٹ، اور پوری کچوری کا بل، مہاکر کے اکتالیس روپے تین آنہ سوا پانچ پائی زرِ نقد، چہرے شاھی، کہئے تھانیدار صاحب کیا خیال ہے؟"

بیان ختم ہوا۔ البتہ رجسٹر کے آخری خانہ میں جو عبارت لکھی گئی یہ تھی۔

"فدوی تھانیدار متعین لبِ دریا کی رائے و تجربہ میں مظہر نووارد بڑا کوئی وہ معلوم ہوتا ہے، حدودِ ریاست میں نہ داخل ہونے دیا جائے، آئندہ جو حکم!"

اس کے بعد ہمارے اور تھانیدار کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ اشد راز میں تھی۔ اور سچ پوچھتے ہیں آپ تو اب یاد بھی نہیں۔ اتنا ضرور خیال رہ گیا ہے کہ شاید حق کا مطالبہ، اس کی رقم کا تعین اور در صورت عدم چکائی حوالات سے لے کر حبسِ دوام بعبور دریائے شور تک کوئی کھٹکا شامتِ اعمال سے ہماری سواری کیلئے جو گاڑی پکڑی گئی اس میں پنجرہ پول کے بیل تھے، اور خود گاڑی چھوٹی موئی کی لکڑی کی پہلی منزل میں۔ اس پر ہم اور کانسٹیبل "بمعہ" بہی کھاتہ نمار جسٹر لدے، اور سفر کے آخری حصہ میں جبکہ خدا خدا کر کے صاحب سپرنٹنڈنٹ کے درِ دولت کا کچا احاطہ اور ناروں کی چھاؤں میں لہراتے ہوئے جھنڈے والا پھاٹک سامنے تھا تو گاڑی اور بیل ہم پر سوار تھے۔

ہمارے قافلہ نے ابھی دم بھی نہ لیا تھا کہ فضا مرتعش ہوئی، اور کان کے پردوں پر "ہلٹ ہُکم سدرہ" کا موہوم سا نقش چھوڑ کر ساکن ہو گئی، نیم تاریکی میں دکھائی دیا کہ پھاٹک کے اندر ایک غولِ بیابانی نے کونے میں سے بندوق کی وضع کی کوئی چیز اٹھائی، پھونک مار مار کر اس کی گرد جھٹکی، اور ہم سے کوئی چھ سات ہاتھ کے فاصلہ پر پینترہ بدل کر مقابل کھڑا ہو گیا۔ شاید جلدی میں یا ممکن ہے بھول کر، بہرکیف ہم نے غور کیا تو بندوق کا کندہ ہماری طرف تھا اور بیچ سینے کو تاک رہا تھا۔

"ڈرو نہیں، چلانے کیلئے نہیں تم کو چمکانے کی خاطر پہرہ دار نے چھینائی ہے، گرمی گرمی گولی بارود بھرنے کا آرڈر نہیں ہے، اور کہنے کو تو ہم برسات میں بھی نہیں بھرتے، ہاں جاڑوں میں آتے تو ابتک کبھی کے چھٹانک بھر سیسہ پی چکے ہوتے!" پھاٹک گذر چکا تھا، صاحب سپرنٹنڈنٹ کی کوٹھی کا بیاباں منظر کیا تھا۔ بنجاروں کا ٹانڈا تھا یا کسی دیہاتی برات کا پڑاؤ۔ دو چار جھلملاتی منتشر لالٹینیں، کہیں اناج کے چھکڑے لدے کھڑے ہیں، بیل چارہ کھا رہے ہیں۔ جوتے تلے گاڑیبان کا چولھا چڑھا ہے، مکئی کی موٹی موٹی روٹیاں پک چکی ہیں۔ دال کھدبد کھدبد کر رہی ہے۔ خود تریل کے کش لے رہا ہے۔ فیلبان ہاتھیوں کے روٹ پکا رہے ہیں۔ دو سنکے پیپل کے موٹے موٹے ڈالوں سے سونڈ کو ورزش کرا رہے ہیں، ایک چھپر کے نیچے گھمر گھمر چکیاں چل رہی ہیں۔ گھوڑوں کا دانہ دلا جا رہا ہے۔ گھوڑوں کے منہ پر توبڑے چڑھے گھسیاروں نے گھاس کے گٹھے سامنے جھٹک دیئے ہیں۔ کسی کی مالش ہو رہی ہے، کوئی نہلایا جا رہا ہے۔ لوہے کی سلاخوں کے ایک بڑے پنجرے میں چیتے پڑے ہوئے ہپ ہپ کر رہے ہیں۔ کسی جگہ بطخوں کا جھرمٹ ہے، سب بیٹھی ہیں، لطخا ایک ٹانگ پر کھڑا پہرہ دے رہا ہے۔ دو تین اونٹ بھی بلبلاتے دکھائی دیئے۔ ساربانوں کی عورتیں بچے کہانی کہہ سن رہے ہیں۔

غرضکہ اس بے محابہ مجمع کو پھاندتے پھوندتے آگے بڑھے، سامنے ایک مکان نظر آیا۔ دروازہ پر ٹاٹ کا پردہ، روشنی بھی ذرا مدھم سی تھی۔ یہی صاحب سپرنٹنڈنٹ بہادر کی کوٹھی یا آپ جو چاہیں کہیں، چلتے چلتے کسی نے ہمارا راستہ روکا، گیروی کھادی کا دھاری دار کرتہ اور جانگیہ پہنے، ایک شخص نمودار ہوا، سر پر غالباً مقوے کی ٹوپی تھی جس پر پیتل کا مارکہ لگا تھا، گلے میں لوہے کا طوق اور اس میں لکڑی کی تختی پتہ دے رہی تھی کہ یہ

کوئی میعادی مہمان سرکار تھا۔ اور اپنے کئی ہم پیشہ برادروں کے ساتھ ڈیوڑھی کا محلدار اور صاحب سپرڈنٹ بہادر کا عرض بیگی تھا۔

اطلاع ہوئی ۔

تابڑتوڑ جمائیاں آرہی تھیں، پیاس کے مارے حلق میں آنچ ہورہی تھی، کہ صدر کمرے کی چلمن ہٹی، چکن کا کرتہ، غرارے دار پاجامہ پہنے، پان چباتے صاحب سپرڈنٹ بہادر یا مرزا عسکری بی ٹائے ناکام کھڑے تھے، خاصدان پٹک دیا، لپکے اور لپٹ گئے، کانسٹبل دم بخود کہ صاحب پر "میاں" آگئے یا نصیب دشمناں کوئی دورہ پڑگیا ۔

"اٹھئے کا بھی یا دن بھر شکن بستر ہی بنے رہئے گا!"

آنکھ کھلی، روز روشن تھا، اور مرزا عسکری ناشتہ کا خوان اور چار کی کشتی ہمراہ، ہاتھ میں خاصدان چھپر دان میں سے جھانک رہے تھے۔

"فراغت کرلو تو آج پاگل خانہ سے تمہاری بسم اللہ کریں جس کے خوش قسمتی سے ہم پاگل آنچیف ہیں، واپسی میں سیر و شکار کا تفصیلی پروگرام بنیگا"

"بھئی ہم تو نذی پار کرتے ہی اپنے کو پاگل خانہ میں تصور کرتے ہیں۔ کیا ابھی کچھ باقی ہے؟"

"ہاں میں کہنا ہی بھول گیا کہ اس سڑی تھانیدار کو روبکار کے ذریعہ تمہارے حالات سے مطلع کردیا گیا ہے۔ تم سے "حق" مانگتا تھا! احمق کہیں کا! تھانیدار تو کیا تم سے تو لاٹ صاحب بھی حق نہ مانگ سکیں"

اب ہم تھے اور دن عید، رات شب برات، یعنی صبح کو نمک سلیمانی اور رات کو جلاب کی گولیاں ۔

آوارہ

ساقی بکڈپو دہلی کی کتابیں

(ریڈیائی ڈرامہ):-

جنگل کا پھول

منظر

(بمبئی کے نشاط کیفے میں عشرت اور رحمان داخل ہوتے ہیں۔ عشرت ایک روزانہ اخبار کا اڈیٹر ہے اور رحمان ایک بڑا تاجر۔ کیفے کی چہل پہل۔ پلیٹ اور چمچوں کی آواز۔ کرسیاں کھینچکر دونوں آدمیوں کے بیٹھنے کی آواز۔)

رحمان:۔ یہ تو خوب مقام ہے۔ عشرت کیا تم روز یہاں آتے ہو؟

عشرت:۔ ہاں تقریبًا۔ اس لئے کہ اور مقامات سے یہاں مشاہیر زائد تعداد میں آیا کرتے ہیں۔

رحمان:۔ مثلاً۔

عشرت:۔ مثلاً کیا۔ داہنی طرف نظر ڈالو۔ وہ کنارے کی میز پر ایک شخص بیٹھا ہوا ہے۔

رحمان:۔ کون؟ وہ کھویا کھویا سا آدمی۔

عشرت:۔ وہ مشہور افسانہ نگار ہے۔

رحمان:۔ نام کیا ہے؟

عشرت:۔ نام تو کسی کو بھی معلوم نہیں۔ اس نے ایک تخلص رکھ چھوڑا ہے "گلفام"۔

رحمان:۔ تو ملاقات کراونا۔

عشرت:۔ چلو۔ (چلنے کی آواز)

عشرت:۔ مولانا گلفام۔ میرا اسلام قبول فرمائیے۔ اور میرے عزیز دوست مسٹر رحمان سے ملئے۔

گلفام:۔ آداب عرض ہے عشرت میاں۔ مجھے مسٹر رحمان سے شرف نیاز حاصل کر کے بڑی مسرت ہوئی۔ کہئے اخبار کا کیا حال ہے؟

عشرت:۔ خدا کا شکر ہے۔

گلفام:۔ تشریف رکھیں آپ حضرات۔ بوائے۔

بوائے:۔ حضور کیا حکم ہے؟

گلفام:۔ کسی عمدہ شربت کے تین گلاس۔

(یکایک ایک کثیر مجمع کے داخل ہونے کی آواز)

رحمان:۔ یہ کیفے تو خوب چلتا ہے۔

گلفام:۔ جی ہاں پارسال تو یہاں آتو بولتا تھا۔

رحمان:۔ ایک سال میں یہ انقلاب؟

گلفام:۔ اس انقلاب کی عجیب داستان ہے۔ بالکل ایک معجزہ۔

رحمان:۔ انقلاب ۔۔ معجزہ ۔۔ مولانا۔ یہ دونوں لفظ مجبور کر رہے ہیں کہ میں درخواست کروں کہ آپ مجھے یہ واقعہ بتادیں۔

(میز پر گلاس رکھنے کی آواز)

گلفام:۔ مجھے کیا عذر ہے۔ گلاس آچکے۔ داستان کے دوران میں شربت نوشی ذرا مزا دیتی ہے۔

رحمان:۔ تو فرمائیے مولانا۔ میں ہمہ تن اشتیاق ہوں۔

گلفام:۔ رحمان صاحب اس کیفے کا مالک دو سال پہلے ایک معزز خاندان میں خانساماں تھا۔

رحمان:۔ خانساماں!

گلفام:۔ جی ہاں خانساماں صاحب کو اسی گھر کی ایک ملازمہ سے عشق پیدا ہوگیا تھا۔ ملازمہ نے ان کے عشق کو اس شرط پر گوارا کر لیا کہ وہ عقد کے بعد ہی کوئی ہوٹل اپنا ذاتی کھول لے۔ چنانچہ یہ شرط منظور ہوئی اور عقد ہوگیا۔

رحمان:۔ خوب!

گلفام:۔ جی ہاں۔ خانساماں غریب کے پاس کافی سرمایہ تو تھا نہیں مگر اس نے ہمت کی اور اس کیفے کو کھولا۔ یہ مقام کیفے کیلئے کسی طرح موزوں نہ تھا نہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ چلتے کا نام گاڑی ہو جائے چنانچہ کیفے کھلنے کو تو کھل گیا۔ لیکن بجز اس کے کہ مالک صاحب دن بھر بیٹھے مکھیاں مارا کریں اور کوئی صورت نہ تھی۔ کبھی ٹپا ٹوئیاں کوئی خریدار آگیا تو اس سے کیا فائدہ تھا۔ کرایہ تو کرایہ ایک بوائے کی تنخواہ بھی نکلتی تھی۔ چنانچہ ایک دن مالک کیفے نے اپنی بیوی سے کہا :۔

مالک:۔ بیگم! تمھاری ضد کا انجام یہ ہونا ہے کہ میں بالکل تباہ ہو جاؤنگا

بیگم:۔ بھلا مجھ کو اس کی کیا خبر تھی۔ اب بند کر دو۔

مالک:۔ بند کر دو۔ کیا خوب۔ وہ خود ہی ہفتہ عشرہ میں بند ہو جائیگا۔

گلفام:۔ میاں بیوی کو تو ان خیالات میں چھوڑیئے۔ رحمان صاحب اب دوسرا حال سنئے۔ پارسال تک یہاں ایک رقاصہ تھی جس کا بڑا دور دورہ تھا۔ اس کو دنیا "جنگل کا پھول" کے نام سے جانتی تھی۔ بمبئی کے تمام شوقین اس کے پروانے تھے۔ اور وہ ان کے دلوں پر حکمراں تھی۔ اس کے حسن کا اتنا اثر تھا کہ ہر نوجوان کی جیب میں اس کا فوٹو ہونا فیشن ہو نا قرار پا گیا تھا۔ میاں بیوی کی اس گفتگو کے دوسرے ہی دن ایک قاصد ایک خط لیکر مالک کیفے کے پاس آیا۔

مالک:۔ یہ کس کا خط ہے؟

آدمی:۔ اس کو آپ پڑھ لیجئے۔ تو دہی معلوم ہو جائیگا۔ میں جا رہا ہوں۔

(کاغذ کھلنے کی آواز)

مالک:۔ بیگم۔ بیگم۔ اِدھر جلدی آؤ۔

(آنیکی آواز)

بیگم:۔ کہو کیا کہتے ہو؟

مالک:۔ کسی صاحب نے ہم سے مذاق کیا ہے۔ ایک خط آیا ہے جو "جنگل کے پھول" کی طرف سے ہے۔ اس میں آج رات کیلئے احکام ہیں "جنگل کا پھول" اپنے سَو مہمانوں کے ساتھ اس کیفے میں کھانا کھانا چاہتی ہیں۔ اور یہیں محفلِ رقص بھی گرم ہوگی۔ کھانا اور تواضع کا آرڈر ہمارے کیفے کو دیا گیا ہے۔

بیگم:۔ ہائیں سو آدمیوں کی دعوت اور ہمارے کیفے میں۔

مالک:۔ سمجھ میں تو میری بھی نہیں آتا۔

بیگم:۔ تو آخر یہ ہے کیا۔ مذاق یا حقیقت!

مالک:۔ اب میں کیا جانوں۔ میں کوئی علمِ غیب تو پڑھا ہوا ہوں نہیں۔ "جنگل کا پھول" ایک مشہور و معروف ہستی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ اپنے مہمانوں کے ساتھ میرے تیسرے درجہ کے کیفے میں کیوں آ رہی ہے۔ اس کو تو کسی اعلیٰ ترین کیفے میں جانا چاہیئے۔

بیگم:۔ تو تم خود جا کر کیوں نہیں مل لیتے۔ یہ معاملہ صاف ہو جائیگا۔

مالک:۔ میں تو نہ جاؤنگا۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ تباہی اوّل آنا ہی آخر آنا ہے۔ جہاں اب تک ہم پر اتنا قرض ہے وہاں اور ہو جائے گا۔ میں ابھی تمام ضروریات کی چیزیں قرض لاتا ہوں۔ تم ذرا بوائی کی وردی اور کیفے کی صفائی کا انتظام کر لو۔

گلفام:۔ رحمان میاں۔ دن بھر میں مالک نے کیفے کو سامان قرض لاکر سج دیا۔ وہ یہ آخری جوا کھیل رہا تھا۔ اس موقع سے اس کو کئی ہزار کا فائدہ ہوا۔ اور یہ موقع اس کے واسطے سنہری تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر یہ آرڈر حقیقت ہے تو کئی ہزار کی رقم اس کو نفع میں ملتی ہے علاوہ ازیں شہر کے تمام شوقین اور مشاہیر اس کے کیفے سے روشناس ہو جائیں گے۔

چنانچہ رات آئی اور گھڑی نے دس کا گجر بجایا۔

(دس کا گجر بجنا)

بیگم:۔ ابھی تک تو کوئی مہمان نہیں آیا۔ افسوس۔

مالک:۔ افسوس کی کیا بات بیگم۔ یا تباہی یا عروج!

(موٹر رکنے کی آواز)

مالک:۔ دوڑو۔ دوڑو مہمان آرہے ہیں۔

(مجمع کے اندر داخل ہونیکی آواز)

گلفام:۔ اس دن تمام رات کیفے میں محفلِ رقص گرم رہی "جنگل کے پھول" کو اس جگہ کے انتخاب میں مبارکبادیں پیش کی گئیں۔ ہر کھانے ہر تواضع کو خوب خوب سراہا گیا۔ اس دن مالک کیفے کو اتنا انعام ملا کہ وہ حیران رہ گیا۔ مطالبہ تو بعد کی چیز تھا۔ وہ دن ہے اور آج کی گھڑی یہ کیفے دن دُونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ یہاں پر آنا فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔

رحمان:۔ گلفام صاحب! واقعہ آپنے تو ختم کر دیا ہے لیکن میری رائے میں ابھی تکمیل نہیں ہوئی ہے۔

گلفام:۔ رحمان صاحب! آپ بہت حسّاس ہیں۔ بیشک ابھی واقعہ باقی ہے۔

رحمان:۔ تو آپ فرماتے کیوں نہیں۔ بوائے۔ تین اور گلاس۔

گلفام:۔ آپ بہت مجبور فرما رہے ہیں۔ بہتر ہے۔ مہمان کی ہر خاطر میزبان کا فرض ہے۔ میں عرض کرتا ہوں۔

رحمان:۔ بہت بہت شکریہ!

گلفام:۔ سنیئے جناب! "جنگل کا پھول" اس واقعہ کے بعد بمبئی سے چلی گئی۔ اس کے حُسن کی بہار ایک دم سے خزاں سے بدل گئی آسپرفرینا دی آلام ایک دم سے آگئے۔ اس کے جواہرات چوری ہو گئے اور وہ مجبوراً جبل پور میں ایک غریبانہ سوز زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ایک دن اُسے اپنی پُرانی زندگی یاد آئی اور وہ بمبئی آ ہی گئی۔ لیکن اب اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور وہ عجب بیمار تھی۔ اس کا گلاب جیسا چہرہ اب کانٹا سا ہو گیا تھا۔ دہ کئی دن ہوئے اسی کیفے میں آئی اور خاموش ایک طرف بیٹھ گئی۔ بوائے اس کے پاس گیا اور بولا۔

بوائے:۔ حضور کیا چاہئے ہے؟

عورت:۔ کچھ نہیں۔

بوائے:۔ تو حضور معاف فرمائیں گی۔ یہ وقت کیفے کے بند ہونیکا ہے۔

عورت:۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔ یہ کیفے رات بھر کھلا رہتا ہے۔

بوائے:۔ سرکار! یہاں کے اصول کے مطابق صرف خریداروں ہی کو یہاں ٹھیرنے کا استحقاق ہے۔

عورت:۔ تم تہذیب کی حدیں بھول رہے ہو۔ اپنے مالک کو بھیجدو۔

بوائے:۔ بہت خوب سرکار۔

(جانیکی آواز۔ آنے کی آواز)

مالک:۔ کہئے حضور۔ مجھے کیوں یاد فرمایا ہے؟

عورت:۔ تقریباً ایک سال کا عرصہ ہوا۔ یہ کیفے جو آج اتنا مزین اور خوبصورت ہے انتہائی گندا اور بدتر تھا۔

مالک:۔ آپ کا اس سے مطلب؟

عورت:۔ سُنتے جائیے۔ اس زمانہ میں ایک عورت تھی جس کے بہت سے پرستار تھے۔ وہ ایک دن اس طرف سے گذری۔ وہ اپنے دل میں سوچی کہ جہاں وہ ہزاروں کی زندگی تباہ کر رہی ہے وہاں ایک شخص کی زندگی بنا کیوں نہ دے۔ اُسے اپنی قوتِ حسن کا امتحان لینا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک آرڈر بھیجا کہ وہ سو مہمانوں کے ساتھ یہاں کھانا کھائیگی۔

مالک:۔ ہائیں میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ میری محسنہ آپ اور اس حال میں۔

عورت:۔ ہاں میرے دوست اسی کا نام انقلابِ زمانہ ہے۔ جس ذات کیواسطے تم اور تمہارے ملازم کل تک سر جھکاتے تھے۔ آج اُسے نکل جانیکا حکم دے رہے ہیں۔

مالک:۔ حضور معاف فرمائیں۔ وہ غریب پہچان نہیں سکا۔ آپکا قیام کہاں ہے؟

عورت:۔ محلوں کی ٹھہرنیوالی ایک سرائے کی گندی کوٹھری میں مقیم ہے۔ جہاں اس کو صرف ایک سکون ہے کہ برابر کے ناچ گھر سے وہ موسیقی کی صدائیں اس کے کانوں تک پہونچ جاتی ہیں۔ جو اس کی رُوح کو رقص کرا دیتی ہیں۔

مالک:۔ بوائے! یہاں ان خاتون کیلئے اعلیٰ ترین کھانا لگاؤ۔ یہ میری مہمان ہیں۔

گلفام:۔ کھانا کھا چکنے کے بعد "جنگل کے پھول" نے مالک کیفے کا شکریہ ادا کیا اور اپنی کوٹھڑی کی طرف روانہ ہوئی۔ راستہ میں اس نے تھوڑی سی سنکھیا ایک پنساری کے وہاں سے مول لیلی۔

رحمان:۔ پھر کیا ہوا؟

گلفام:۔ کیا ہوا۔ (قہقہہ) جو ایک شکست یاب انسان کا ہوا کرتا ہے

رحمان:۔ کچھ آپ کو معلوم ہے کہ اس نے کس سرائے میں قیام کیا تھا؟

گلفام:۔ نہیں مطلق نہیں لیکن ہاں میں یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ پیدا کہاں اور کیونکر ہوئی؟

رحمان:۔ پھر یہی بتا دیجئے۔

گلفام:۔ میز پر کیا رکھا ہوا ہے؟

رحمان:۔ گلاس۔

(گلفام گلاس لیکر پٹخ دیتا ہے)

گلفام:۔ وہ اسی میں پیدا ہوئی۔ اور اسی میں فنا ہوگئی۔

(قہقہہ)

بہزاد لکھنوی

اس وقت مجھے کیا ہوتا ہے

دل پر چھریاں چل جاتی ہیں اور ہوش و خرد کھو جاتے ہیں
ہوکوں کی پیہم شورش میں امیدیں گم ہو جاتی ہیں
برسات کی وحشت زا شامیں جب رنگینی برساتی ہیں
اور سرد ہواؤں کے جھونکے نغمات محبت گاتے ہیں
کیا ہوتا ہے، کیا ہوتا ہے، اس وقت مجھے کیا ہوتا ہے!
اُف پچھلی رات کا وہ عالم جب کیف سا چھایا ہوتا ہے
مجروح کر! دل کے ٹکڑے اک دلکش جال بناتے ہیں
اور مشرق سے مغرب تک سقف نیلوفریں کو سجاتے ہیں
اک کالے کالے بادل سے پھر چاند نمایاں ہوتا ہے
کیا ہوتا ہے، کیا ہوتا ہے، اس وقت مجھے کیا ہوتا ہے!
جب تھک جاتا ہے دماغ فشار مسلسل سے، سو جاتی ہوں!
پھر روح بھٹکنے لگتی ہے تاریکی سہری ویرانوں میں
دریاؤں اور پہاڑوں میں مسمار شدہ ایوانوں میں!
پا اپنے کو خونخوار درندوں کے جھرمٹ میں پاتی ہوں!
کیا ہوتا ہے، کیا ہوتا ہے، اسوقت مجھے کیا ہوتا ہے!
دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، گو جاں کاہ علائق نے!
ہمراز، علائق میں پھر بھی اک کشش سی پائی جاتی ہے!
دے دیکے محبت کے دھوکے کیا چیز مجھے بہکاتی ہے!
مفروضہ بندھن توڑ دیئے جب بلیت کے تلخ حقائق نے!
کیا ہوتا ہے، کیا ہوتا ہے، اللہ مجھے کیا ہوتا ہے!
کیا ہو جاتی ہے بعض اوقات بصارت میری آنکھوں کی!
مایوسی کے ہیبت زا شعلے جھلسا دیتے ہیں تمنائیں
اور یورش کرب بلا سے فضا تک بھرنے لگتی ہیں آہیں
جب شکل نہیں پہچانی پڑتی دیکھے بھالے لوگوں کی!
اس وقت مجھے کیا ہوتا ہے، اللہ! مجھے کیا ہوتا ہے!

"دلفگار"

الٹا منتر

افرادِ ڈرامہ

محمود .. .. غصہ ور میاں
رشیدہ .. .. تیز مزاج بیوی
شاہدہ .. .. رشیدہ کی چچازاد بہن
سلیم .. .. میاں کے یار غار
کلو .. .. ملازم لڑکا

پہلا سین

(رشیدہ کمرے میں تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی ہیں۔ قریب ہی پاندان کھلا ہے۔ ایک ہاتھ میں سروتا ہے سامنے ایک رسالہ کھلا رکھا ہے۔ کبھی چھالیہ کاٹنے لگتی ہیں کبھی رسالہ پر نظر ڈالتی ہیں۔ بار بار نظر اٹھا کر دروازے کو دیکھتی ہیں۔ ماتھے پر بل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کسی کا انتظار ہے۔ مسٹر محمود سوٹ پہنے، چھڑی ہاتھ میں لئے سیٹی بجاتے بڑے اطمینان سے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔)

محمود :۔ کلو اے او کلو، ہماری بیگم کہاں ہیں؟

کلو :۔ حضور وہ دیکھئے سامنے والے کمرے میں پڑھ رہی ہیں۔

محمود :۔ پڑھ رہی ہیں؟ کیا پڑھ رہی ہیں قرآن شریف؟

کلو :۔ نہیں حضور وہ تو چھالیہ کاٹ رہی ہیں مگر . . . . .

محمود :۔ مگر کے بچے۔ مگر کیا؟

کلو :۔ وہ میاں میرا مطلب یہ تھا کہ بیگم صاحب چھالیہ بھی کاٹ رہی ہیں اور کتاب بھی پڑھ رہی ہیں۔ میاں کہیں ان کا ہاتھ نہ کٹ جائے۔

محمود :۔ چپ بدتمیز، تجھے اس سے کیا۔ (مسکراتے ہوئے بیوی کے پاس جاتے ہیں۔) کہئے بیگم کیا ہو رہا ہے؟ اوہو ہمارے لئے پان لگائے جا رہے ہیں۔ شکریہ صاحب شکریہ۔

رشیدہ :۔ اگر آپ کتاب پڑھنے کو پان بنانا سمجھتے ہیں تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں آپ کی نظر کا قصور ہے۔

محمود (ہنسکر) :۔ بھلا بیگم میری نظر بچاری کا کیا قصور ہے۔ پاندان آپکے آگے کھلا ہے، چھالیہ آپ کاٹ رہی ہیں تو اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ چھالیہ کاٹنے کے بعد پان بنانے کا نمبر آئے گا اور آپ پان اپنے چہیتے میاں کے سوا اور کس کے لئے بنائیں گی۔

رشیدہ :۔ بس رہنے دیجئے، مجھے یہ الٹی سیدھی منطق نہیں آتی چھالیہ تو میں ایسے ہی شغل کیلئے کاٹ رہی ہوں اور آخر مجھے کیا غرض ہے کہ بیٹھی بیٹھے آپ کیلئے پان ہی بنایا کروں۔

محمود :۔ تو آپ کو ہم سے کچھ غرض ہی نہیں؟

رشیدہ :۔ جب آپ کو مجھ سے غرض نہیں تو میں ہی کیوں آپ کے پیچھے مرمٹوں۔

محمود :۔ ہم نے کیا بے پروائی کی جس کے سبب یہ الٹے سیدھے الزام لئے جا رہے ہیں۔

رشیدہ :۔ اپنے دل سے پوچھئے۔

محمود :۔ (بلند آواز سے) نہیں آخر معلوم تو ہو کس بات پر منہ پھولا ہے۔

رشیدہ :۔ لے واہ میرا منہ کیوں پھولنے لگا۔

محمود :۔ میں کہتا ہوں کہ آخر تمہیں یہ کیا عادت ہے کہ ادھر میں نے گھر میں پاؤں رکھا اور ادھر تم نے ٹانگ لی۔

رشیدہ :۔ (تنک کر) ذرا زبان سنبھال کر بات کیجئے۔ ٹانگ لینا کیا معنی؟ آخر میں کون ہوں؟

محمود:- اب خدا جانے کون ہو. بات کا سیدھی طرح جواب دینا تو آتا ہی نہیں (تیزی سے) آخر ہوا کیا جو یوں غصّے میں بھری بیٹھی ہو۔

رشیدہ:- (بھرائی آواز میں) صبح کے گئے گئے اب گھر میں قدم رکھا ہے اور آتے ہی چیخنا پیٹنا شروع کر دیا۔ ہماری تو کوئی ہستی ہی نہیں مریں یا جئیں انہیں اپنے کام سے کام ہے۔ گھر میں آئیں گے تو سوائے لڑنے کے دوسری بات نہیں۔

محمود:- (چلا کر) کیا کہا۔ میں لڑتا ہوں؟ میں؟ تمہیں شرم نہیں آتی کہ جو ذرا سی دیر گھر میں رہتا ہوں اس کو بھی چین سے نہیں گزارنے دیتیں، خوش قسمت لوگوں کی بیویاں ایسی ہوتی ہیں کہ ہر وقت میاں کی خوشی کا خیال رکھتی ہیں۔ ایک ہماری پھوٹی قسمت ہے کہ ایسی جھانجھنکار بیوی گلے پڑی۔

رشیدہ:- (رو کر) تو کون تمہارے آگے ہاتھ جوڑنے آیا تھا کہ مجھ سے شادی کر لو۔ تمہاری ہی اماں بھینا جا جا کر ہاتھ جوڑا کرتی تھیں۔

محمود:- خدا سمجھے ان اماں بھینا کو جنہوں نے ایسی بدزبان لڑاکا سے شادی کر کے میری زندگی برباد کر دی۔

رشیدہ:- (روتے روتے تیز آواز سے) انہیں کیوں کوستے ہو۔ شکر کرو شکر۔ اگر میں اس گھر میں نہ آجاتی تو کوئی تھوکتا بھی تو نہیں وہ تو ہمارے ہی ماں باپ تھے کہ بغیر دیکھے بھالے ایسے جلاد کو بیاہ دیا۔

محمود:- (کڑک کر) جلاد تو تیرا خاندان۔ میں کیوں جلاد ہوتا۔ دُور ہو میرے سامنے سے۔

رشیدہ:- (غصّے سے کانپتی آواز میں) بس بہت آگے نہ بڑھو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

محمود:- ہٹ میرے سامنے سے ورنہ خون کر ڈالونگا۔

رشیدہ:- ہائے کس آفت میں پھنسی ہوں۔ خدا کرے میں مر جاؤں جو اس مصیبت سے چھُٹوں۔ یا اللہ تو مجھے موت دیدے۔

محمود:- (طنز سے) ایسوں کو موت ہی نہیں آتی۔

رشیدہ:- ہاں تم تو چاہتے ہی ہو کہ یہ مر جائے تو نئی نویلی لا کر بٹھاؤ۔ مگر یاد رکھنا کوئی تھوکے گا بھی نہیں۔

محمود:- بس زیادہ نہ بکو ہٹو میرے سامنے سے۔ نہیں جاؤ گی؟ اچھا میں ہی اپنا منہ کالا کرتا ہوں۔

(غصّے میں بھرا باہر جاتا ہے، جو چیز سامنے آتی ہے پھینک دیتا ہے۔ بیوی ہچکیاں لے لیکر رو رہی ہے)

دوسرا سین

(رشیدہ پلنگ پر لیٹی ہے۔ آنکھیں سوجی ہیں چہرے پر اب تک آنسوؤں کے نشان ہیں۔ شاہدہ آتی ہے۔)

شاہدہ:- لے ہے میری آپا کہاں ہیں؟ لے لوئی تو یہ لیٹی ہیں۔ آپا۔ لے بی آپا، اوئی تم بولتی کیوں نہیں؟

رشیدہ:- کون شاہدہ؟ آؤ بہن بیٹھو۔ خوب آئیں میں تمہیں یاد کر رہی تھی۔

شاہدہ:- واہ بی اس جھوٹ کا بھی کچھ ٹھکانا ہے۔ تم مجھے کہاں یاد کر رہی تھیں۔ ہاں دولہا بھائی کو یاد کرتی ہو گی۔

رشیدہ:- بس رہنے دے شاہدہ۔ یہ نام نہ لے۔

شاہدہ:- کیوں بی آپا کیا بات ہے کیا پھر لڑائی ہو گئی؟

رشیدہ:- (رنجیدہ ہنسی ہنس کر) پھر کی خوب کہی۔ ہوتی کب نہیں۔ یہاں تو روز کا یہی رونا ہے۔ میں تو دعا کرتی ہوں کہ موت آجائے تو اس روز روز کی مصیبت سے رہائی ہو۔

شاہدہ:- لے خدا نہ کرے کیوں بری فال منہ سے نکالتی ہو بہن لڑائی کس میاں بیوی میں نہیں ہوتی۔ جب دو برتن ہوتے ہیں تو کھڑکتے ہی ہیں۔

رشیدہ:- (رو کر) شاہدہ تجھے میری مصیبت کی کیا خبر۔ یہ مردوا سب سے نرالا ہے۔ آپ لڑائی چھیڑتا ہے اور الزام مجھ پر رکھتا ہے۔ اور جو جو منہ میں آتا ہے بکتا چلا جاتا ہے۔ زبان کو لگام ہی نہیں۔

شاہدہ:- بہن سچ سچ بتانا تم تو کچھ جواب نہیں دیتی ہو؟ آپ ہی چیخ پیٹ کر چپ ہو رہتے ہوں گے۔

رشیدہ:- جب وہ لڑتے ہیں تو مجھے بھی غصّہ آتا ہے۔ میں بھی برابر سے جواب دیتی ہوں۔

شاہدہ:- یہی تو بری بات ہے۔

رشیدہ:- واہ میں کیا کسی کی ذلیل ہوں کہ وہ جو چاہے کہیں اور میں زبان نہ کھولوں۔

شاہدہ:- آپا اسی سے تو لڑائی بڑھتی ہو گی۔ اب دیکھئے آپ کے بہنوئی کا مزاج بھی تیز ہے مگر جب ان کا پارہ چڑھنے لگتا ہے تو میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ وہ کچھ ہی کہتے رہیں میں جواب نہیں دیتی۔ آپ ہی شرمندہ ہو کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

رشیدہ:۔ نہ بہن تمہارے میاں کا مزاج ایسا جناتی نہیں ہے۔ یہ تو ایسی ایسی باتیں کہتے ہیں کہ کوئی چُپ رہ ہی نہیں سکتا۔ تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔

شاہدہ:۔ دیکھو آپا میاں بیوی کا رشتہ کوئی اللہ نہ کرے چھوٹنے والا تو ہوتا نہیں ہے۔ اب تو جیسے بھی ہیں زندگی انہیں کے ساتھ گزارنی ہے۔ اور ہر وقت کی لڑائی سے بھی واقعی بہت تکلیف ہوتی ہوگی اب تم ایسی ترکیب کرو کہ یہ لڑائی جھگڑا مٹ ہی جائے۔

رشیدہ:۔ میری بہن تو ہی کچھ بتا۔ میں تو بہت ہی عاجز ہوں سچ کہتی ہوں زہر کھا لینے کو جی چاہتا ہے۔

شاہدہ:۔ (ہنسکر) زہر کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ زہر کھانے سے تکلیف بھی ہوگی اور گناہ بھی ہوگا۔ ہم ایسی ترکیب بتائیں کہ یہ بھی نہ ہو اور لڑائی جھگڑا بھی مٹ جائے۔

رشیدہ:۔ اچھی بہن وہ کیا ترکیب ہے جلدی بتا دے۔

شاہدہ:۔ بس وہی میری والی ترکیب۔ جب دولھا بھائی کی کوئی بات تمہیں بُری لگے چُپ ہو جاؤ۔ وہ غصہ کریں بُرا بھلا کہیں تم خاموش رہو۔ سچ کہتی ہوں آپ ہی چُپ ہو جائیں گے اور دل میں شرمندہ بھی ہوں گے۔

رشیدہ:۔ بڑا مشکل کام ہے۔

شاہدہ:۔ کچھ مشکل نہیں۔ ذرا دل اور زبان پر قابو رکھنے کی ضرورت ہے، آپ ہی سب معاملہ ٹھیک ہو جائیگا۔

رشیدہ:۔ اچھا بہن یہ بھی کر دیکھوں۔ شاید تیرا ہی کہنا ٹھیک ہو۔

شاہدہ:۔ ہاں بی میری آپا ضرور کرو۔ پھر دیکھنا کیسی آپ دونوں میں صلح رہنے لگے گی۔

رشیدہ:۔ اللہ مالک ہے۔

شاہدہ:۔ اچھا اب میں جاتی ہوں۔

رشیدہ:۔ لے ذرا دیر اور بیٹھو۔

شاہدہ:۔ آپا "آن" کا بھی تو خیال ہے۔ مزاج بگڑا تو اور مشکل ہوگی۔ ہاں میری بات بھولنا نہیں۔ نہ کسی بات کا جواب دینا اور نہ غصے میں آنا۔ ——)

تیسرا سین

(میاں بیوی دونوں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں طرز سے معلوم ہوتا ہے کہ صلح ہوگئی ہے ——)

محمود:۔ بیگم سچ کہتا ہوں مجھے تم سے بڑی محبت ہے۔ رہی لڑائی تو اس کا کیا ہے وہ تو ہوا ہی کرتی ہے۔

رشیدہ:۔ آپ کی تو خبر نہیں ہاں مجھے آپ سے بیشک ایسی محبت ہے کہ میں جان تک آپ پر سے نثار کر سکتی ہوں۔

محمود:۔ نہیں صاحب ہمیں زیادہ محبت ہے۔

رشیدہ:۔ (ناز سے) نہیں صاحب آپ غلطی پر ہیں مجھے زیادہ ہے۔

محمود:۔ اس کا ثبوت؟۔

رشیدہ:۔ ثبوت؟ سب سے بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ لڑائی کے بعد میرے دل میں غصہ نہیں رہتا۔ ورنہ جھگڑا تو ایسا ہوتا ہے کہ اور کوئی ہوتی تو مہینوں بات نہ کرتی۔

محمود:۔ مگر بیگم قصور کس کا ہوتا ہے۔ ذرا انصاف سے بتایئے پرسوں کی لڑائی میں کس کا قصور تھا۔

رشیدہ:۔ جس نے بدزبانی کی۔

محمود:۔ (تیزی سے) کس نے بدزبانی کی؟ بولو کس کی زیادتی تھی؟۔

(رشیدہ کو میاں کا لہجہ ناگوار گزرتا ہے۔ شاہدہ کی بات یاد کرکے خاموش رہتی ہے۔)

محمود:۔ ارے بھئی بولو آخر جواب کیوں نہیں دیتی ہو۔ کیا پھر لڑنے کا ارادہ ہے؟۔

(بیوی خاموش رہتی ہے)

محمود:۔ اب آپ کا اتنا مزاج ہوگیا کہ ہم بھونکتے رہیں اور حضور جواب بھی نہ دیں۔

(بیوی تیوری پر بل ڈال کر گردن جھکا لیتی ہے)

محمود:۔ میں کہتا ہوں کہ بے بات آخر یہ منہ کیوں پھول گیا۔ کچھ کہا نہ سُنا آپ ہی آپ۔ اب یہ نئی حرکت سیکھی۔

(رشیدہ سسکی بھر کر آنسو پونچھتی ہے۔)

محمود:۔ اچھا گریہ وزاری ہو رہی ہے۔ آخر کیا ہوا؟ منہ سے نہیں پھوٹتی کہ بے وجہ بے سبب کیوں بھوت چڑھ گیا۔

(رشیدہ غصہ بھری نظروں سے محمود کی طرف دیکھتی ہے)

محمود:۔ (چیخ کر) گھورتی کیا ہو۔ منہ سے پھوٹو گونگی تو نہیں ہو۔

رشیدہ:۔ کس مصیبت میں جان ہے۔ جواب دو تو مصیبت چُپ رہو تو آفت۔ یا اللہ میں کیا کروں۔

محمود:۔ (غصے میں پیر پٹک کر) دیوار سے سر پھوڑ ڈالو۔ سارا قصہ پاک ہو جائے گا۔

رشیدہ :- مَیں کیوں سر پھوڑ ڈالوں۔ میری جُوتی سر پھوڑتی ہو جس کا جی چاہے خود سر پھوڑ لے۔

محمود :- افوہ زبان کیا قینچی ہے۔

رشیدہ :- ابھی زبان نہ چلنے کی شکایت تھی اب زبان قینچی ہو گئی۔

محمود :- (غصّے میں بھرے لہجے میں) اچھی خاصی طرح باتیں کر رہا تھا مگر یہ عورت کیا بلا ہے۔ پیار محبت کی بات پر بھی بگڑتی ہے۔

رشیدہ (روتے ہوئے) آگ لگے اس محبت کو جس میں ایسی ایسی باتیں کہی جائیں۔

محمود :- بس زیادہ بک بک نہ کرو۔ خدا جانے کس قسم کے جاہل ماں باپ تھے جنہوں نے ایسی بدزبان لڑکی اٹھائی۔

رشیدہ (تلملا کر) میرے ماں باپ کی شان میں کچھ نہ کہنا ورنہ خُدا کی قسم مُنہ نوچ لوں گی۔

محمود :- یہ مُنہ نوچنا بھی والدہ محترمہ نے سکھایا ہوگا۔

(بیوی دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ پیٹ لیتی ہیں میاں چِلّاتے ہوئے باہر چلے جاتے ہیں۔)

چوتھا سین

(میاں غصّے میں بل کھاتے ہوئے باہر دیوان خانے میں آتے ہیں۔ یہاں اُن کے ایک گہرے دوست محمد سلیم بیٹھے پان چبا رہے ہیں ___)

سلیم :- اے میاں محمود کیا بات ہے کیوں جلال آرہا ہے۔

محمود :- کچھ نہیں بھئی کچھ نہیں۔

سلیم :- کوئی بات تو ضرور ہے جو تم یوں غصّے میں بل کھا رہے ہو۔ آخر کیا ہوا؟ ۔

محمود :- اے میاں ہماری وہی مثل ہے کہ اپنا گھٹنہ کھولو آپ ہی لاجوں مرو۔

سلیم :- اب مجھ سے کیا پردہ ہے میں تو کوئی غیر نہیں۔

محمود :- کیا کہوں وہی تمہاری بھابی بات بات پر لڑتی ہیں۔ ناک میں دم آگیا زندگی حرام کر دی۔

سلیم :- ہاں بھئی اُن کے مزاج کی تیزی کا حال تو میں نے بھی سُنا ہے مگر یار ہیں بڑے سلیقے کی اور سُنتا ہوں کہ خوبصورت بھی بہت ہیں۔

محمود :- اے میاں صورت ایسی پیاری کہ سُبحان اللہ۔ سلیقہ سگھڑاپا ایسا کہ جو دیکھے عش عش کرے۔ مگر زبان ایسی خراب ہے کہ سب خُوبیوں پر خاک پڑ جاتی ہے۔

سلیم :- مزاج تو محمود تمہارا بھی تیز ہے۔ تم بھی ضرور بدزبانی کرتے ہوگے۔

محمود :- یار غصّہ آتا ہے تو سب کچھ کہہ ڈالتا ہوں۔ مگر جھگڑا شرُوع تو وہی کرتی ہیں۔

سلیم :- (ہنس کر) ارے بھائی خوبصورت بیوی کی دو چار کڑوی باتیں برداشت کرنا بھی مشکل نہیں" جواب تلخ می زیبد لبِ لعل شکر خارا" تم بات ٹال دیا کرو۔

محمود :- چاہتا تو میں خود بھی ہوں کہ بات ٹل جائے مگر وہ بات ایسی کہتی ہیں کہ خواہ مخواہ غصّہ آتا ہے۔

سلیم :- تو ہم تمہیں ایسا منتر سکھائیں کہ تمہارا غصّہ فرو ہو جایا کرے اور شاید بھابی کا غصّہ بھی اُتر جائے۔

محمود :- ہاں بھئی ضرور بتاؤ۔ میں تو خُدا سے چاہتا ہوں کہ یہ ہر وقت کا جھگڑا مٹے۔

سلیم :- تم یہ کرو کہ جب تمہیں بھابی کی کسی بات پر غصّہ آئے تو ایک سے دس تک گنتی گن جایا کرو۔ اتنی دیر میں غصّہ دُور ہو جائیگا۔

محمود :- تم تو مذاق کرتے ہو دوست۔

سلیم :- واہ بھئی واہ کیا داد دی ہے۔ یہ مذاق ہے؟

محمود :- مذاق نہیں تو کیا ہے۔

سلیم :- اسی سمجھ پر اکڑتے ہو۔ اے میاں یہ تو ایسا منتر ہے کہ پٹ پڑ ہی نہیں سکتا۔ ہم تو لے آزما چکے ہیں۔

محمود :- اچھا تمہارا ہی کہنا سہی۔ اسے بھی کر دیکھیں۔

سلیم :- ہاں بھئی آج شام کو جمیل کے ہاں ٹی پارٹی میں آؤ گے نا۔

محمود :- ضرور۔ ضرور۔

سلیم :- اچھا اب چلد ہیے۔ سلام علیکم۔

محمود :- وعلیکم السلام۔

پانچواں سین

(میاں محمود اور بی رشیدہ بہت دیر سے باتیں کر رہے ہیں آپس میں کسی قسم کی رنجش نہیں معلوم ہوتی ۔)

رشیدہ :- آپ نے "میدانِ عمل" تو پڑھی ہے نا؟

محمود :- "میدانِ عمل"؟ نہیں تو، یہ کس کی کتاب ہے؟

رشیدہ :- پریم چند مرحوم کی آخری اور بہترین تصنیف ہے۔

محمود :- واقعی؟ ان کے مختصر افسانے تو مجھے بھی پسند ہیں۔ مگر ناول زیادہ پسند نہیں آئے۔

رشیدہ :- واہ اگر آپ اس کو پڑھ لیں تو آپ کو اپنا خیال بدلنا پڑے۔ واقعی یہ کتاب ان کا شاہکار ہے۔

محمود :- کیا تم نے یہ کتاب منگائی ہے؟

رشیدہ :- نہیں ابھی تو نہیں منگائی۔ جمیل صاحب کی بیوی سے عاریتاً لی تھی۔

محمود :- خوب یاد آیا مسز جمیل نے تم سے پوچھا ہے کہ آپ زنانہ کالج کے جلسے میں چلیں گی؟

رشیدہ :- ارادہ تو ہے۔ مگر صاحب سُنئے تو آپ میری ساڑھی کا "بارڈر" کب لا کر دینگے؟

محمود :- یہ ساڑھی کے "بارڈر" کا اسوقت کیا ذکر تھا۔

رشیدہ :- ذکر کیوں نہ ہو۔ "بارڈر" نہ آیا تو جلسے میں سادی ساڑھی پہن کر جاؤں گی۔

محمود :- اور پچھلے سال بھر میں جو چھ سات "بارڈر" لا چکا ہوں وہ سب کیا ہوئے؟

رشیدہ :- آپ بھی خوب باتیں کرتے ہیں۔ وہ سب تو استعمال ہو چکے۔ اب اتنے بڑے جلسے میں کیا پرانا "بارڈر" لگا کر جاؤں۔

محمود :- کیا ہرج ہے۔

رشیدہ :- نہیں صاحب ہمیں یہ گوارا نہیں کہ لوگ کہیں کہ محمود صاحب کی بیوی کے پاس ساڑھیاں بھی نہیں ہیں۔ ہر جگہ ایک ہی ساڑھی پہنے پھرتی ہیں۔

محمود :- اس میں میری ہی تو بے عزتی ہے۔

رشیدہ :- اب نہ لانے کے سو بہانے۔

محمود :- آخر سوچو تو اتنا روپیہ کہاں سے آئے کہ ہر مہینے پندرہ بیس روپے کا صرف "بارڈر" لا کر دوں۔

رشیدہ :- (بگڑ کر) آپ کے پاس ہر کام کیلئے روپیہ ہے میرے لئے نہیں۔

محمود :- ایک۔

رشیدہ :- بیس ہی دن تو ہوئے آپ اپنی بہن کیلئے بارہ روپے کا جوتا خرید کر لائے تھے میں نے کچھ نہ کہا۔

محمود :- دو۔

رشیدہ :- اور اب مجھے ضرورت ہے تو اس طرح صاف انکار کر رہے ہیں۔

محمود :- تین .....

رشیدہ :- گنتی پھر گننے لگا، میری بات کا جواب دیجئے۔ لانا ہے یا نہیں۔

محمود :- چار ....

رشیدہ :- (جھنجھلا کر) خیر جائیے ہم جلسے میں جاتے ہی نہیں۔ ہماری قسمت میں تو جلنا اور رونا ہی لکھا ہے۔

محمود :- پانچ ....

رشیدہ :- میں کہتی ہوں کہ آخر یہ کیا سیکھا ہے، نہ بات کا جواب نہ کچھ ایک دو تین گننا شروع کر دیا۔

محمود :- چھ ....

رشیدہ :- (مُنہ چڑا کر) چھ ... چھ۔

محمود :- سات۔

رشیدہ :- آخر یہ ماجرا کیا ہے۔

محمود :- آٹھ۔

رشیدہ :- آگ لگے اس سات آٹھ کو۔ کیا کچھ دماغ میں خرابی آ گئی ــــ؟

محمود :- (بگڑ کر) او بدزبان عورت زبان سنبھال۔ جو مُنہ میں آتا ہے بک جاتی ہے کتنا ہی طرح دو مگر اُسے جھگڑا کئے بغیر چین نہیں۔

رشیدہ :- لعنت ہے اس زندگی پر اس گھر پر جہاں عورت کی عزت نہ ہو۔

محمود :- تو جاؤ دفان ہو کس نے منع کیا ہے۔

رشیدہ :- ہاں اب اس گھر کا پانی بھی پیوں تو حرام کھاؤں جا کلو ڈولی لا۔

محمود :- شریف عورت ہوتی تو ہرگز ایسی زبان دراز نہ ہوتی۔ آخر ہے نہ گنواری۔

رشیدہ :- (چلا چلا کر) گنواری تمہاری اماں بہنا۔ رذیل تمہارے ہوتے سوتے ....

کلو :- بیوی جی ڈولی آ گئی۔

محمود :- دور ہو مردود کیوں لایا ڈولی۔

رشیدہ :- (رو رو کر) پردہ کرا کلو میں اس گھر سے اپنا مُنہ کالا کرتی ہوں۔

(محمود غصے میں بکتا جھکتا باہر چلا جاتا ہے۔ رشیدہ ڈولی میں سوار ہو جاتی ہے رونے کی آواز آ رہی ہے۔)

(پردہ)

مسز صالحہ عابد حسین

چھوٹے نواب اور میں

بہو ماں کا عرصے سے اصرار تھا کہ میں انہیں دیدی جاؤں، جانے کیوں انہیں مجھ سے اتنی محبت تھی کہ پہلی ہی بار جو آئیں تو انہوں نے مجھے بیٹی بنا لینے کو کہا، اور وہ ماں سے زیادہ مجھے چاہتی بھی تھیں۔ شاید یہ وجہ ہو کہ ان کے بھی دو لڑکیاں ہوئیں اور جاتی رہیں۔ جیسے بوا کی شادی اور ان سے یہ ناتا بھی ہوا وہ تو اڑ ہی گئیں کہ اب تو لیتی ہی جائیں گی۔

چونکہ دور کی سسرال تھی ادھر بھی یہ سوال درپیش تھا کہ بوا کیسا تھ جائے کون۔ تنہا ان جانے سے ایسی گھبراتی تھیں جیسے مقتل کو جا رہی ہوں۔ ان کی میری بہت محبت تھی اور میرا بھی دل اس تصور سے بیٹھا جاتا تھا کہ نہ صرف وہ اکیلی جا رہی ہیں بلکہ مجھے بھی اکیلی چھوڑ رہی ہیں۔ ان سب باتوں کا نتیجہ جو ہونا تھا وہ اب کوئی پہیلی تو نہیں کہ بوجھتی بیٹھوں۔

ہم بوا کی سسرال پہونچے۔ میں کوئی ایسے اونچے گھرانے کی بیٹی نہیں، نہ ہی مجھے زنانہ حماقت آتی ہے۔ میں ایک سیدھی سادی اور صاف گو عورت ہوں۔ گو بقول "ان" کے شریر بھی۔ خدا لگتی تو یہ ہے کہ جب میں نے ایک عالیشان مکان، باغ بغیچہ، ٹھاٹ باٹ دیکھا تو دل میں تو آنکھیں پھاڑ کر رہ گئی، گو چونکہ اس وقت بھی ضرورت سے کچھ سوا ہی ہشیار تھی کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

عیش آرام تو اپنے گھر بھی تھا لیکن یہاں آکر جیسی گذری اس کا تو رنگ ہی کچھ اور تھا۔ یہاں بھی کھانے پینے، کھیلنے کودنے کے سوا اور کام ہی کیا تھا۔ رہا وطن کا خیال اور اپنوں کی محبت کا سوال، سو اسکو بھی یہاں کے لوگوں کے برتاؤ نے کچھ ایسا مٹایا کہ یونہی کبھی یاد سی آجاتی تھی۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ وہاں سے زیادہ میں یہیں کی ہو رہی۔ ہینز دو مہینے کے لئے جاتی بھی تو ایک بے چینی سی رہتی کہ کب بہو ماں بلائیں اور کب میں اڑ کر جاؤں۔

بوا کی ایک نند تھیں، مجھ سے کچھ بڑی ہی، مگر اخلاق و محبت کی ایسی تھیں کہ ہم دونوں جنم جنم کی ساتھی معلوم دیتیں۔ ان کے ایک چھوٹے بھائی تھے جو سب سے چھوٹے اور اپنی نوعیت کے ایک ہی ذات تھے۔ بی آپا ان ہی سے سبق پڑھتی تھیں۔

"یہ" سارے گھر بار کے عزیز تھے، اس لئے کہ سب سے چھوٹے تھے اور اس سے بڑھکر اس لئے کہ مجھ سے زیادہ ہوشیار اور شریر تھے۔ گھر میں آتے تو اس شان سے کہ لاٹ صاحب ہیں اور مدرسہ جاتے تو یوں گویا یہی ہیڈ ماسٹر ہیں۔

جیسی فطرت پائی تھی اس سے بڑھکر صورت۔ اور جیسی صورت تھی اس سے بڑھکر سیرت۔ غرض جب کبھی سوچتی ہوں کہ "ان" میں کیا تھا اور کیا نہ تھا تو حیرت کی پتلی بنکر رہ جاتی ہوں۔

میں ان کی طبیعت تو سمجھ ہی نہ سکتی تھی۔ اس لئے کہ ان میں اتنی متضاد خوبیاں جمع ہو گئی تھیں کہ مجھے تو ایک معمہ معلوم ہوتے، اور مجھے کیا خود "وہ" کہتے تھے کہ "میری فطرت ایک معمہ ہے، جانے کب کھلے"۔ جتنے شریر، اتنے ذلیل، جتنے شوخ اتنے سنجیدہ، ظاہر کچھ، باطن کچھ۔ ابھی خوش ابھی خفا۔

ایک بات جو بہت نمایاں تھی یہ کہ دل میں ہمیشہ ایک حاکمانہ شان تھی اور ہر وقت، ہر جگہ "ان" سے اس کا اظہار ہوتا تھا۔ اصول کے بھی قطرتاً بہت پابند تھے، اس لئے کسی سے ڈرتے نہ تھے۔

البتہ گھر میں سب ان سے ڈرتے اور لحاظ کرتے تھے، گو پیٹھ پیچھے خود باپ، مغرور، بد دماغ اور فرعون کہا کرتے۔ سامنے یہ حال کہ "چھوٹے نواب"، "چھوٹے نواب" کہتے منہ خشک ہو رہا ہے۔ سارے گھر میں یہ اسی نام سے پکارے جاتے تھے۔ دماغ میں سچ مچ کی نوابی شان تھی۔ معمولی کام کرنا اپنی کسر شان سمجھتے۔ کوئی مرتے وقت بھی کہے کہ ذرا شربت ڈالدو تو کہدیں "اٹھکر پی لو، وہ شیشہ دھرا ہے" اور جو جی میں آگئے تو معمولی سے معمولی کام کر جائیں۔

کھیل میں بھی ان کی اس خصوصیت کا اظہار ہوتا تھا چنانچہ ہماری رفیق بہن صاحبہ انہیں جب کبھی ہمارے ساتھ کھیلنے کے لئے بلاتیں تو شرط کرتے کہ "وہی راجہ رانی" والا کھیل! نہیں تو ہم نہیں کھیلتے"۔ بہن صاحبہ کی بھی عین یہی آرزو تھی۔ جٹ سے اٹھتیں اور کہتیں کہ میں رانی بنوں گی، بی آپا کو دیوان بنائیں حسین کو سہیلی، مراد کو کوتوال اور مجھے باندی۔ میں دروازے پر کھڑی کر دی جاتی۔ راجہ صاحب بڑی شان سے محلسرا میں داخل ہونے آتے، مجھے دیکھکر پوچھتے "یہ کون ہے؟" رانی صاحب جواب دیتیں "باندی ہے!" کہتے "باندی! نہیں جی، یہ تو ہماری رانی بننے کے لائق ہیں — داخل کر دو انہیں ہمارے محل میں۔ آج سے ان کا خطاب

"تاج محل آگرہ" ہوگا" میں چپکے سے کہہ دیتی" اور آپ کا نام قطب صاحب کی لاٹ" کہتے" پھر بھی ہم اونچے ہے!"

اسی لئے جتنے خوش مذاق تھے اتنے ہی غصیلے بھی، نواب صاحب کو ذرا ذرا سی بات پر غصہ آجاتا۔ اور کئی کئی دن تک کسی سے بات نہ کرتے۔ ماں بہن سے کچھ زیادہ خلوص تھا۔ اور ان سے بڑھکر، میرا خیال غلط نہیں تو، مجھ سے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ہم اُن کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ کرتے۔

اُن کی بڑی آرزو یہ بھی تھی کہ 'ہرفن مولا' بنیں۔ اسی لئے وہ جہاں تک ہنر کا تعلق ہے کسی کام کو نہ چھوڑتے، اور یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ذرا اُنہوں نے 'خالہ بی' کو کشیدہ پر ناز کرتے دیکھا، لے بیٹھے اور کاڑھ پھینکا۔ کسی کوشن پر زعم ہوا کہ انہیں نا آیا، اور سیکھکر ہی دکھایا، پھر کسی کی مدد نہ مشورہ۔ حتیٰ کہ پکانے سے بھی عار نہ کرتے اور تھوڑے ہی دنوں میں خوب پکانے لگے۔ کبھی میں طعنہ دیتی کہ "لیجئے آج کل نوابوں کو بھی عورت بننے کی سوجھی ہے" کہتے "کوئی ہنر آتا ہو تو بندہ عورت کیا، باندی بننے سے بھی نہیں رکتا، سمجھیں!"

نہ صرف "وہ" ہنر سیکھنا چاہتے تھے بلکہ اتنے وسیع النظر تھے کہ سب کو اسی طرح ترقی کرنے کی ترغیب دیتے، چنانچہ اسی توجہہ سے اُنہوں نے ہمیں بھی سارے مردانہ کام اور کھیل سکھاتے۔ فٹ بال اُن کو بہت بھاتا کھیل تھا، اسی لئے زیادہ تر انہوں نے ہمیں اسی پر گھسیٹا۔

پہلے پہلے مجھے ان سے بہت حجاب محسوس ہوتا۔ دل جتنا اُن کی طرف کھچتا، اتنی ہی شرم بھی غالب آتی اور میں اُن سے بات بھی نہ کرسکتی تھی، اس لئے ایک عرصے تک وہ مجھے "مس ثُم" کہا کرتے۔ بی آپا تو ان سے پڑھتی ہی تھیں، کیونکہ ان لوگوں میں ابھی مشرقی ذہنیت بھی کافی تھی اور وہ مدرسہ بھیجنا پسند نہ کرتے تھے۔ اُنہوں نے مجبور کیا کہ میں بھی شریک ہوجاؤں۔ پڑھنے کا مجھے فطرتاً بہت شوق تھا، اور یہاں آتے ہوئے مجھے اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ میری تعلیم چھوٹ جائے گی، لیکن خوشی کی بات تھی کہ یہاں بھی اس کا انتظام تھا۔ میں اور بی آپا ان سے پڑھنے لگیں اور رفتہ رفتہ اسی سلسلہ میں میں اُن سے بہت بے تکلف بھی ہوگئی۔

انگریزی کا انہیں "بہت شوق تھا، اسی لئے پہلے ہی دن انہوں نے مجھ سے کہا کہ انگریزی کا سبق بھی لوں، اور پہلے ہی دن جو سبق انہوں نے دیا وہ غالباً ٹینیسن کی نظم "The Brook." کا یہ شعر تھا۔

"For men may come and men may go,
But I go on for ever!"

یہ شعر "اُنہیں" بہت پیارا تھا، اور اکثر پڑھا کرتے۔ دوسرے ہی دن میں نے بھی زبانی سُنایا تو بہت خوش ہوتے، اور پیٹھ ٹھونک کر شاباشی دی اور کہا "تم تنی اچھی ہو ثریا!"

اس ایک جُملہ کا جو اثر میرے دل پر ہوا آج تک کسی کی تعریفوں سے نہ ہوا تھا۔ بی آپا سے بھی "اُنہوں" نے بار بار خواہش کی لیکن انگریزی سے اُنہیں رغبت نہ تھی ــــــــ سبق سے ہٹ کر جو باری رہتی کھیل کی تھی۔

شام ہوئی، یا چاندنی چٹکی "اُنہوں" نے سب نوکروں کو باہر ہنکایا اور کھینچا ایک ایک کو۔ ہم عورتوں کو فٹ بال سے بھلا کیا نسبت۔ نہ آنے کا عذر کرتے تو کہتے "نہیں کے کیا معنے ثریا! نپولین کا قول ہے کہ 'نہیں' کا لفظ بیوقوفوں کی لغت میں ہوتا ہے ـــ چلو، آؤ ہم سکھائیں!"

دن بھر دوستوں اور نوکروں سے کھیلتے، پاؤں میں کانٹے تک چبھ جاتے، مگر وہ نہ تھکتے۔ ہمارا ان کا کیا مقابلہ! گول پہ گول کیا ہوتا گویا انہیں خزانہ ملتا۔ ہم میں سے کسی نے کہا کہ "نہیں بھئی، تم اکیلے اور ہم سب ــــ نہیں تو ہم نہیں کھیلتے!" کہتے "منظور!" پھر بھی بھلا ہم کاہے کو جیتتے۔ "وہ" ہیں کہ گولے سے زیادہ تیز بھاگ رہے ہیں کبھی گھٹنوں سے مارا، کبھی سر سے لیا، کبھی پاؤں میں نچایا، اور یہ گول، وہ گول۔ ہم اینچتے، جھجکتے رہ گئے، یا گولا ایک قدم بڑھا کہ اُنہوں نے صدا لگائی "یہ فالٹ، یہ ہینڈ، یہ پنالٹی، یہ رانگ سائڈ!" کہا "عورتوں کو سب معاف ہونا چاہیئے۔ نہیں تو ہم نہیں کھیلتے!" کہا "آلرائٹ!" پھر بھی کیا ہونا تھا۔

غرض جب خوب تھکے ہارے تو بڑی شان سے، جیسے سچ مچ کے کپتان ہوں "اوور!" کہا اور سیٹی بجادی۔

رات، اور آدھی رات کو سیٹی، کبھی کسی نے ٹوکا، کبھی بابا نے للکارا "کون ہے رے یہ! آدھی رات کو سیٹی!"

یہ لپک کر اُن کے کمرے کے پاس گئے اور ڈرایا "کیوں ثریا، تمہاری عقل ٹھکانے نہیں؟ آدھی رات کو سیٹی بجاتی ہو، بارہا کہہ چکا ہوں کہ میرے پڑھنے میں ہرج ہوتا ہے!"

جیسے ہی میں جواب دوں، وہ دوڑے آتے اور اُنگلی سے بتاتے ہوئے "خاموش!" کہا اور سیٹی ہاتھ میں لٹکتے ہوئے بولے "اگر بابا حل کر

پوچھیں تو کہہ دینا کہ میں نے بجائی تھی!"

"واہ، مجھے کیا ایسی پڑی ہے کہ قصور کریں تو آپ، اور سر لوں میں ——!"

"ارا ہا! اپنے سر تم اتنی سی بات کیوں کر لو گی، تمہارا سر تو یہ پھولوں کے لئے ہے نا!"

"کیسی دھولیں؟"

"یہ جو گول پہ گول اور پھر یہ جھڑ پڑی اتنے میں بھول گئیں؟"

"چلو میاں، یہ منہ اور مسور کی دال! خود کا سر جو بوجھ کے مارے جھکا جا رہا ہے، اس کی خیر تو مناتے نہیں، دوسروں میں کیڑے نکالنے چلے ہیں!"

"بوجھ کے مارے سر جھکا جا رہا ہے، پر شرم کے مارے دیدہ تو نہیں جھکا!"

"ہاں، شرم کیوں نہ آئے، عورتوں سے کھیل کر سورمائی دکھانے میں تو شرم آنی ہی چاہیئے!"

"اس کی حقیقت ذرا آپ اپنے بہنوئی سے پوچھ لیں کہ ان جیسے سورماؤں نے ہی خاکسار کے ساتھ کھیل کر کیا ایسا تیر مارا ہے، جو آپ عورتوں کا طعنہ دے رہی ہیں!"

"ذرا پھیسی ہوتی تو بتاتی!"

"جی ہاں ضرور بتاتی! —— ٹوکرے پہ ٹوکرا اُٹھا کر، اور وہ بھی "کچے گو" کا —— اچھا ہوا کہ آپ نے نہیں بتایا ورنہ ناک کٹ دی جاتی!"

"ناک ہے ہی کہاں جو دی جائے!"

"کیا! —— ناک نہیں؟ کس سے؟ ہم راجہ ہیں راجہ، معلوم؟ ہمارے ناک کیسے نہیں! —— البتہ تم ہماری باندی ہو، تمہارے نہ ہو گی تو خیر جانے دو، ہمیں تم سے ہمدردی ہے، لتھڑ چکی ہو گی، اب تو سو رہو، صبح اُٹھ کے دھو لینا!"

ایک اور دلچسپ مشغلہ ہمارا یہ تھا کہ تالاب جائیں جو بابا ہی کا تھا اور مکان سے قریب ہی۔ آہ کتنا اچھا منظر! جدھر دیکھو پانی ہی پانی، کناروں پہ ہرا بھرا سبزہ، جگہ جگہ کنول کے پھول، ایک طرف مرغابیوں کا غول، دوسری طرف مچھوں کا پرا، ہر موج سے دل میں ایک لہر، چمن کی نزہت سے دماغ معطر، آسمان ابر آلود، ہوا میں خنکی، گویا قدرت کو بھی یہ منظور تھا کہ ہم یہاں کھیلیں، مزے لوٹیں، اور دل کے کنول کھولیں۔

تالاب کو انہوں نے دیکھا کہ "آہا کتنا اچھا منظر، ثریا!" کہا اور وہی اپنا شعر پڑھا۔

For men may come & men may go,
But I go on for ever!"

اور منصوبے باندھنے شروع کئے: "جی چاہتا ہے کہ بس ہمیشہ یہیں رہیں —— جب میں بڑا ہونگا تو ضرور اس کے کنارے بنگلہ بناؤں گا، ایک بڑا پُر فضا باغ لگاؤں گا، بی آپا کو رکھوں گا —— اور تمہیں بھی ثریا کیوں تم رہو گی نا؟ جی چاہتا ہے ہم تم تینوں مل کر ایک جگہ رہیں، اور اسی طرح ہنستے کھیلتے دن بتا دیں —— مگر نہیں معلوم، یہ دن رہتے بھی ہیں یا نہیں —— ثریا تو آخر ایک دن اپنے وطن چلی جائیں گی، پھر تم کہاں ہم کہاں —— کیا اچھا ہوتا بی آپا کہ ان کی شادی بھی یہیں کہیں ہوتی —— یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کے شوہر کوئی اعلیٰ خیال کے ہونگے یا ویسے ہی کھوسٹ اور ذلیل ذہنیت کے —— اور جب تک ہم زندہ بھی رہیں یا مر جائیں —— خدا کرے کہ نہایت شائستہ ہوں اور ثریا کی زندگی نہایت خوش گذرے!

بی آپا بولیں: "خوش گذرے کیا، خوش گذریگی ہی! سنا ہے کہ جب سے یہ پیدا ہوئیں ان کے پھوپھیرے بھائی سے ان کا نام لگا ہے، اور اب وہ بڑے خوش حال ہیں!"

"اچھا، یہ بات ہے! تو مبارک ہو ثریا، پھر تو تم کبھی فاتحہ میں بھی ہمارا نام نہ لو گی، ابھی سے اتنی بیگانہ ہوتی جاتی ہو کہ سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتیں!"

"بات آتی ہی کہاں ہے جو کروں، سوائے مرنے، مٹنے کے ——!"

"ارے! —— یہ بات ہے! تو چلو کوئی نہ مرے، ہم تمہاری شادی کریں گے!"

"اب آپ کے منہ کون مُردی لگے!"

"تو پھر چلو ذرا راؤنڈ نگ کریں!"

زمانہ گذرتا گیا، دن بدن، ماہ بہ ماہ، سال بہ سال۔ ہم الھڑ سے سگھڑ، خام سے پختہ، بچے سے بڑے، بالے سے جوان ہوتے گئے پھر بھی نہ کھلا کہ کیا سے کیا ہو رہا ہے۔ زمانہ کا ہے کو تھا، سوئی تاگا کہ یہ پرویا، یہ پھسلا، اور یہ نکل گیا! نہیں بتا سکتی کہ اس اثنا میں ہمارے دل میں کیا کیا تاثرات ہوتے، صرف اتنا محسوس ہوتا تھا کہ "یہ دن بدن" "ان" میں کم ہوئی

جا رہی ہوں، اور "وہ" مجھ سے قریب تر آ رہے ہیں۔ دن بدن "وہ" مجھے دلکش سے دلکش، عقلمند سے عقلمند اور بلند سے بلند مقام پر نظر آتے، اور ان کی ایک گھڑی کی جدائی بھی میرے لئے شاق گذرتی، نہیں کہہ سکتی کہ یہ جذبہ کس قسم کا تھا۔ دل میں ہزاروں شکوے ہوتے، اور اتنی چڑتی کہ جیسے "وہ" آئیں وہ خبر لوں کہ یاد ہی کریں، مگر "وہ" آئے، اور ــ اور میں سب کچھ بھول گئی۔

کتنی ہی دفعہ بچھڑے، کتنی ہی دفعہ ملے، کتنی ہی دفعہ روٹھے، کتنی ہی دفعہ منے۔ جو زیادہ جی بھرا۔ ٹیڑھی ترچھی باتیں کیں کہ "انہوں" نے ایک بات میں نکھلا دیا۔ "ثریا، گھڑی کا بڑا کانٹا اس لئے جدا ہوتا ہے کہ چھوٹے کانٹے سے ملے، اور خود چھوٹے کانٹے کو بڑھائے! کیا تو نہیں جانتی؟"

"اچھا تو گویا آپ مجھ سے زیادہ تیز رفتار ہیں؟"

"لیکن پھر بھی مجھ میں اور تجھ میں گھنٹے اور منٹ کا فرق ہو ثریا۔ تیرا مقابلہ بھلا ہم کہاں سے کریں!"

"اسی لئے تو ہم باندی اور آپ راجہ ہیں نا!"

"باندی! ــ کون کہہ سکتا ہے تجھے باندی! تو تو مہارانی بننے کے قابل ہے ثریا!"

"جی! اور کھیل میں جو اتنی دفعہ بنایا!"

"ارے، آخر وہ کھیل ہی تو ہے، اے، اگر تجھے ناگوار گذرتا ہو، تو آج سے تو مہارانی اور میں غلام!"

یہ کہتے ہوئے وہ پیچھے ہٹے، سینہ پہ ہاتھ رکھا اور ایک فرشی سلام کرنے جھکے۔

"میرے اللہ! ــ آپ کبھی ایسا نہ کریں"۔ میں دوڑی اور فوراً انہیں اٹھایا۔ "انہوں" نے میرے بازو تھامے، نظر سے نظر لڑی اور جھک گئی۔ اور زبان سے نکلا "جب بڑا کانٹا چھوٹے کو بڑھاتا ہے تو چھوٹے کو بھی شکر گزار ہونا چاہئے، اس لئے میں باندی اور آپ راجہ!"

جب یہ تخیلات آتے ہیں تو اب ایک خواب سے معلوم دیتے ہیں، اور یہ کیا، زندگی خود ایک خواب ہے۔

سچ ہے کہ پھول کے ساتھ کانٹا، اور بہار کے پیچھے خزاں لگی ہوئی ہے۔ اگر اس جنت ارضی میں کوئی خلش تھی تو صرف یہ کہ جب سے ہماری بہن صاحب یہاں آئی تھیں ان کا رنگ ہی کچھ بدل گیا تھا، اور ان میں بجائے انس و محبت کے میں چشمک و رقابت پاتی تھی۔ مجھے بھول کر کبھی یہ خیال نہ ہو سکتا تھا کہ جس کو میں اس درجہ لائق محبت سمجھتی تھی وہ اسقدر ذلیل اور قابل نفرت ہوگی۔ ان کی بڑی کوشش یہ تھی کہ "وہ" میرے ساتھ نہ رہیں بلکہ ان کے ہاں رہیں، اور اس میں وہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکتی تھیں۔

لہذا اب مجھے سکھانے لگیں کہ میں "ان" سے الگ رہوں۔ کنوارپن کا طعنہ اور شرم و شرافت کی دہائی دیتیں۔ بہو ماں کے کان بھرتیں، مگر چونکہ ہم دونوں سب گھر پر حاوی تھے کسی کی پیش جانی محال تھی۔

لیکن ایسا زمانہ بھی آ گیا کہ میں خود "ان" سے حجاب محسوس کرنے لگی، اور ایسا حجاب جو میرے قابو سے باہر تھا۔ جب کبھی "وہ" میرے قریب آتے مجھے ایک لرزش سی محسوس ہوتی اور مارے شرم کے میری نظریں آپ سے آپ جھک جاتیں۔

اسی اثنا میں ان مہربانوں کو مجھے پھول پہنانے کی رسم سوجھی۔ "وہ" کتنا سچ کہتے تھے "اس سے زیادہ بیہودہ رسم اور کیا ہو سکتی ہو ثریا! کہ شریف بیٹیوں کی 'جوانی' کا ڈھنڈورا بھرے گھر پیٹا جائے، گویا کسی سینما کا ایڈورٹزمنٹ ہے"!

بہرحال اس بیہودہ رسم کے بعد تو ہماری مہربان بہن کو اور موقع ملا کہ میرے راستے میں روڑے اٹکائیں۔ لیکن وہ اس حقیقت سے شاید بے خبر تھیں کہ پھول کے ساتھ جو کانٹا ہوتا ہے اس سے پھول کی خوبی میں کوئی فرق نہیں آ سکتا بلکہ وہ خود بُرا کہلاتا ہے۔ ہاں اس سے مجھ پر اتنا اثر پڑا کہ دل میں ایک ایسی خلش سی پیدا ہو گئی جسے میں برداشت بھی نہ کر سکتی تھی۔ اور دل سے نکال بھی نہ سکتی تھی۔ یہ بھی کچھ بُرا نہ ہوا، کیونکہ صحیح معنی میں تو ابھی مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ محبت دراصل کیا ہوتی ہے۔

کہتے ہیں کہ اب میں 'جوان' ہو چکی تھی اس لئے اب مجھے بے منہ کا جانور بن جانا چاہئے تھا، گویا کہ یہی صلہ شعور ہے۔ اس لئے اب میں "ان" سے کھل کر بات بھی نہ کر سکتی تھی، البتہ اب بھی فٹ بال کا کھیل اور سبق جاری تھا۔ اور اس کمبخت فٹ بال نے بس میں ایک اور بس ملا دیا۔

بی آپا کی عادت تھی کہ کھیل سے جب "وہ" سونے جاتے تو "ان" کا اور "ان" کے بستر کا جائزہ لیتیں، پاؤں کے زخم خود دھوتیں، خود ہی مرہم پٹی کرتیں، تب جا کر آرام لیتیں۔ کتنی اچھی اور کتنی محبت والی بہن تھیں کہ تصور سے ہی جان قربان ہوئی جاتی ہے۔

جب میں ان میں مل گئی تو انہوں نے کبھی مجھ سے بھی اس کام کو

کہہ دیا۔ رفتہ رفتہ میں نے یہ کام اپنے ہی ذمہ لے لیا۔ کبھی وہ آکر بیٹھتیں یا میں تنہا ہی کوتی۔ ابتداً جب میں گئی تو انہوں نے ضد کی پھر بہن کی سفارش سے خاموش ہو گئے۔

طبیعت میں چونکہ شوخی اور چلبلا پن بھی بہت تھا، کبھی ان سے نچلا نہ بیٹھا جاتا تھا۔ میں پٹی کتر رہی ہوں، انہوں نے قینچی کو لات ماردی، زخم دھلا رہی ہوں، لوٹے کو پاؤں سے ایسا اچھالا کہ سارا پانی میرے منہ اور کپڑوں پر، مرہم گرم کر رہی ہوں اور انہوں نے شمع کو پھونک مارا، اور لگے بات بنانے "لو ثریا، تمہارا دامن سنبھالنا کیا ہوا کہ پنکھا جھلنا ہو گیا"۔

میں بھی "ان" کی شرارتوں کا بدلہ لئے بغیر نہ چھوڑتی۔ کام ختم ہونے تک تو چپ بیٹھتی، مگر جاتے ہوئے پورا لوٹا اونڈیل دیتی یا ایک در کی چٹکی لیکر بھاگ جاتی۔

ایک دن بی آپا بیٹھی تھیں، پھر بھی انہوں نے اپنے گن نہ چھوڑے، شرم کے مارے میں کٹی جاتی تھی، مجھے غصہ آیا اور چٹکی پر چٹکی لینی شروع کی۔ وہ خاموش ہو گئے، تھوڑی دیر میں بی آپا چلی گئیں، جیسے میں جانے لگی، پرکے پڑے "انہوں" نے ایک اڑنگ جو دی میں دھڑام سے زمین پر آرہی"۔ وہ" ہیبت کے مارے اٹھے اور مجھے اٹھانے لگے۔ مجھے غصہ آیا۔ اور میں ہاتھ میں جو قینچی تھی چپکے سے پاؤں میں چھپانی چاہتی تھی کہ غلطی سے وہ ان کے انگوٹھے کے زخم میں لگ گئی، اور خون بہنے لگا، اور وہ "آہ!" کی ایک چیخ کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئے، اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

جیسے ہی ان کی آواز سنی، بی آپا دوڑی آئیں۔ "میاں، میاں، کہو، کیا ہوا؟"

اتنے میں وہ سنبھل گئے، زخم پر جھٹ سے دستی ڈالی اور مجھے اٹھاتے ہوئے کہا "ذرا مجھ سے بیوقوفی ہو گئی بھی۔۔۔ میں نے مذاق سے ذرا کی ذرا یوں جو کیا یہ سچ مچ کی گر گئیں"۔

میں نے فوراً آنسو پونچھنے کی کوشش کی، لیکن بی آپا نے دیکھ لیا "اے بہن، تم رو رہی ہو؟"

کہا "جی نہیں، بی آپا آنکھ میں تنکو جو لگا ہے ویسے ہی پانی نکل رہا ہو، میں کیوں روتی!"

مگر وہ سمجھ گئیں اور "ان" سے مخاطب ہو کر کہا "دیکھو میاں، ایسے مذاق سے کیا فائدہ، عورتوں کی تمہاری بھی کوئی برابری ہے۔۔۔ اچھا بہن، اب جاؤ سو رہو!"

"انہوں" نے از راہ دلگی سے کہا "ہاں بی آپا، مجھ سے غلطی ہوئی، اب کبھی ایسا نہ کرونگا"۔

وہ تو چلی گئیں، اور مجھے دکھ پر دکھ ہونے لگا۔ "وہ" "میرے قریب آئے، اور میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "تم خفا ہو گئیں ثریا؟۔۔۔ میں نے صرف مذاق کیا تھا، تمہیں دکھ دینا مجھے ہرگز منظور نہیں۔۔۔ ایک بار میری طرف دیکھو ثریا۔۔۔ جیسے میں نے دیکھا، انہوں نے ہاتھ جوڑے اور کہا "لو قصور ہو گیا، معاف کر دو، آئندہ سے کبھی ایسا مذاق نہ کروں گا!"

میں کہنا چاہتی ہوں اور الفاظ یاری نہیں دیتے۔ زبان ہے کہ اور بھاڑ میں گھس گئی ہے۔ مجھ سے کچھ بن نہ پڑا۔ لپک کر "ان" کے ہاتھ رکے اور قدموں پر سر رکھ دیا "میرا مطلب آپ غلط سمجھے۔ اچھا ہوتا کہ آپ کو دکھ دینے سے پہلے مر جاتی!"

"یہ کیا ثریا!" یہ کہتے ہوئے انہوں نے مجھے اٹھایا "ثریا، یہ تو کیا کرتی ہے۔۔۔ یہ بھی کوئی ایسی بات ہے جس کا تجھے اتنا غم ہو۔ لاحول ولا!"

انہوں نے میرے آنسو پونچھے، اور سو جانے کو کہا۔ میں نے وہ دستی اٹھالی جو آج بھی میری حرز جاں، رفیق تنہائی، اور مونس بیکسی ہے۔ اور جس پر ایک زخم کا خون نہیں بلکہ میری ہزاروں تمناؤں کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔

جیسے میں باہر نکل رہی تھی دیکھا کہ بڑی بہن صاحب ذرا تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف جا رہی ہیں۔ فوراً میرا ماتھا ٹھنکا۔ لیجئے، انہوں نے بلا ہی لیا۔ جوئیں گئی، اپنے کمرے میں لے گئیں اور شوہر سے فرمایا "دیکھے آپنے اپنی سالی صاحبہ کے کرتوت؟"

"یعنی؟"

"ابھی سے مشق عشق ہو رہی ہے!" (مجھ سے) "جانتی ہو ثریا، کہ تم کتنے ذلیل راستے پر قدم رکھ رہی ہو؟"

"جی ہاں، جانتی ہوں کہ اگر یہ راستہ ذلیل ہے بھی تو اتنا نہیں کہ ایک کی ہوں، اور دوسرے کو تاکوں!"

ان واقعات کا جو اثر نہ ہونا تھا ظاہر ہے۔ دوسرے ہی دن بہو ماں نے بلا کر مجھے تاکید کی میں آئندہ ایسی غلطیاں نہ کیا کروں، اور یہ کہ رفیق بہن سے معافی مانگ لوں۔۔۔ ایسی غلطیاں نہ کیا کروں گویا کی ہی ہیں۔۔۔ اور معافی مانگ لوں!۔۔۔ جو غلطی کرے وہ ضرور

معانی مانگ لے:

اس کے علاوہ اندرونی طور پر مجھ پر دباؤ ڈالا گیا کہ میں "ان" سے پردہ کیا کروں، لیکن چونکہ ایک دم ایسا کرنے سے اُن کے اثر لینے کا اندیشہ تھا، سکھایا گیا کہ میں رفتہ رفتہ اس مقصد کو پورا کروں۔

اِدھر "ان" پر بھی سب کا ایک ٹھنڈا قہر تھا۔ گو منہ سے کچھ نہ بولتے تھے پر تیوریاں سب کی چڑھی ہوتی تھیں۔ "وہ" اُڑتی چڑیا پر گننے والے تھے، سمجھ جو گئے تو اور بھی کھل کھیلے اور یہ تو "ان" کی عادت ہی تھی کہ جلتے کو جلائیں اور کُڑھتے کو کڑھائیں۔

"انہوں" نے مجھ سے بے تکلفی اور بڑھا دی، اب ہر بات مجھی سے پوچھتے، جہاں بھی میں ہوں گھس آتے، ہاتھ پکڑ کھینچتے، گدگدیاں کر دیتے، یا ایسی باتیں سناتے جن سے ان لوگوں کی جلن میں اور اضافہ ہو۔ اس کا بھی گویا احساس نہیں کہ میں "ان" سے بات نہیں کر رہی ہوں، ساتھ نہیں دے رہی ہوں۔

ایک دفعہ سب دسترخوان پر بیٹھے تھے "انہوں" نے چھیڑ نکالی۔

"مچھلی کے شکار کو گئے ہوئے عرصہ ہوا، بابا!"

بابا کو مچھلی کے شکار کا بہت شوق تھا، کہا "ہاں ہاں، اگلے جمعہ کو چلیں گے:"

کہا "ثریا کو بھی لے چلیں گے نا، بابا؟ —— کیوں چلوگی ثریا؟ ——"

بہن صاحب جھنجلا گئیں مگر کہہ کیا سکتی تھیں۔ البتہ بہو ماں نے اُن کا مقصد پورا کر دیا "لے کنواری بیٹی کو کیونکر لے چلیں گے!"

"تو بہو ماں، کیا بی آپا بیاہی ہیں؟"

"نہ سہی، پر وہ تو ہماری ہیں۔ پرائی بیٹی پر کیا اختیار؟"

"پرائی کیسی! اب تو وہ بھی ہماری ہیں۔ کیوں ثریا؟"

"ہماری!" میں نے دل میں کہا اور خاموش ہو گئی۔

سارے گھر میں ایک کانا پھوسی اور اندرونی مشورے ہوا کرتے، جانے کوئی ریاست لُٹی تھی، یا آسمان کے تارے توڑنے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ہمیں جدا کر دیں، لیکن اس سے ہمارے دلوں کو تو جدا نہیں کر سکتے۔

***

لیجیے، اُن کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ گھر میں اب اسی بات کے چرچے شروع ہوتے۔ ماں یا بھاوج کبھی "انہیں" مبارک دیتیں "لو، چھوٹے نواب، شادی مبارک! سہرا مبارک!"

"وہ" کہتے: "شادی وادی کیسی، میں شادی نہیں کروں گا —— میری شادی تو ہو چکی:"

وہ آنکھیں پھاڑ کر پوچھتیں: "ایں، شادی ہو چکی! کیسی شادی! —"

"وہ" پہلو بدل جاتے: "لیجیے، ابھی تو آپ نے شادی کی مبارک بادی اور ابھی گھبرائی جاتی ہیں کہ کیسی شادی! —— نا بھئی، آپ لوگوں کی بات کا اعتبار نہیں۔ اس لئے میں اپنی شادی آپ ہی کروں گا!"

کبھی بڑے بھائی بول اٹھتے: "اور جو ہم کر رہے ہیں!"

"اچھا آپ کر رہے ہیں! تو مبارک! شرع میں تو چار جائز ہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں!"

سب ہنس پڑتے۔

"تم بڑے شوخ ہو، چھوٹے نواب! —— میں تمہاری شادی کو کہتا ہوں!"

"میری شادی کا فکر آپ لوگ نہ کریں —— میں تو اپنی شادی آپ کروں گا، یا بہت ممکن ہے کہ کروں ہی نہیں!"

لیکن معاملات بڑھتے گئے، اور "ان" کی شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ اب "وہ" کچھ پریشان اور مغموم سے ہو گئے۔

***

ایک دن بہو ماں، خالہ بی، اور ہماری رفیق بہن وغیرہ اُن کی شادی کے سلسلہ میں گئی ہوئی ہیں۔ بی آپا آرام فرما رہی ہیں۔ یتیمن اور مراد بھی گھر میں نہیں کہ بابا ٹہلتے، اور دیکھتے ہوئے گھر میں آئے۔

چھوٹے نواب ٹینس کو جانے کے لئے بنگلہ سے اُتر رہے تھے کہ بابا نے آواز دی "چھوٹے نواب، اِدھر آؤ!" یہ کہتے ہوئے وہ کتب خانہ کی طرف گئے۔

چونکہ لہجہ خلافِ توقع سخت تھا، میں تاڑ گئی کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ جیسے "وہ" گئے میں بھی اپنے کمرے سے نکل ایک دوسرے دروازے سے گھسی، اور ایک الماری کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ بابا خلافِ عادت کچھ غصہ میں تھے۔ انہوں نے کہا:

"تو اس سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو شادی کرنی منظور نہیں ——؟"

"جی نہیں!"

"اور گھر سے اُٹھنے منظور ہیں؟"

"جی ہاں!"

"نالائق، بدتمیز! ــــ تم شاید اس حقیقت کو بھول رہے ہو کہ تم اس وقت اپنے باپ سے گفتگو کر رہے ہو ــــ تم ایک شریف زادے ہو، اور تمہیں شریف زادوں کی طرح رہنا چاہیئے ـــ محبت، دولت یا خوبصورتی سے ناجائز فائدہ اٹھانا کمینوں کا فعل ہے ــــ جس شخص میں اتنا تاؤ ہو کہ اپنی مرضی اور بل بوتے پر سب کچھ کرنا چاہتا ہو، اس میں اتنی شرافت بھی ہونی چاہیئے کہ وہ دوسروں کی بہو بیٹیوں کو اپنی ماں، بہن سمجھے ــــ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ بڑی بھاوج بڑی بہن کے برابر ہوتی ہے ــــ اور جو ایسا ہی شوقِ تفریح ہے تو شادی کرنے ہی سے کیوں عار ہو ــــ ہم کچھ تمہارے دشمن تو نہیں ــــ جو کچھ کرتے ہیں وہ تمہاری ہی نالائقیوں کے سدِباب اور بہتری کے لئے ــــ اور اس کا موقع بھی ہم خوب سمجھتے ہیں ــــ آپ کے مشورے کی ہمیں ضرورت نہیں ــــ آپ کی زبان تو زبان ہے کہ ٹل نہیں سکتی ــــ اور دوسروں کی زبان کوئی جھاڑو ہے کہ رہے یا گھسے ــــ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ شادی ہو کر رہے گی ــــ آپ کو اس سے مفر نہیں ــــ اب جبکہ پانی سر سے اونچا ہو چکا، آپ کی آنکھیں کھلیں اور شاخسانے سوجھے ــــ آپنے ہمارے احسانوں کا جو بدلہ دیا اور خاندان کا نام جس طرح روشن کیا، اس سے تو یہ بہتر تھا کہ آپ پیدا ہی نہ ہوتے، یا ہوئے تھے تو وقت سے پہلے مرجاتے"

"وہ" خاموش کھڑے سنتے رہے۔ آخری جملے پر انہوں نے اتنا کہا "موت سے میں نہیں ڈرتا بابا ــــ آپ نے درست فرمایا کہ میں پیدا ہی نہ ہوتا یا ہوا تھا تو وقت سے پہلے مرجاتا۔ اور مجھے تو کھٹکا ہے کہ ایسا ضرور ہوگا، آپ برا نہ مانیئے!"

یہ کہکر "وہ" چلے گئے۔ میرا جو حال ہوا میں اس کو بیان نہیں کر سکتی۔ دل کا یہ کہ تھا کہ بلیاں کی اچھل رہی ہوں، دماغ کا یہ کہ تھا بھبکا کہ کھولا جا رہا ہو۔ "ان" کے لئے کوئی ٹیڑھی بات کرے، یہ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔

مجھے کچھ سوجھائی نہ دیا۔ فوراً بابا کے سامنے جا کھڑی ہوگئی۔ وہ غصہ میں بلکہ زیادہ تر فکر میں گھرے بیٹھے تھے اور غالباً ایسی فکر میں جو ان جیسے باپ کو "ان" جیسے بیٹے پر عتاب کرنے کے بعد ہونی چاہیئے۔

بہت دیر کے بعد بابا نے میری طرف رخ کیا، اور خفگی سے کہا گویا میں ہی ملزم اصلی ہوں،

"کیا ہے؟"

"میں کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں، بابا!"

"فرمایئے، کیا ارشاد ہوتا ہے؟"

"ارشاد کی تو میری شان نہیں بابا! میں صرف یہ عرض کرنے آئی ہوں کہ چھوٹے نواب کے بارے میں جو کچھ آپ نے فرمایا وہ ذرا غور کا محتاج ہے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ چھوٹے نواب آدمی نہیں فرشتہ ہیں۔ اور ان سے بہتر انسان دنیا میں ہو نہیں سکتا۔ جو کچھ بدگمانیاں ہیں اگر وہ کچھ اصلیت رکھتی بھی ہیں تو انکی ذمہ داری مجھ پر ہونی چاہیئے۔ "ان" پر ایک ذرہ برابر بھی نہیں ــــ میں یقین دلاتی ہوں کہ میں اس معاملہ میں مطلق جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔ ــــ میں نے آج تک کبھی آپ سے بات نہیں کی، اور آج اس طرح آپ کے مقابلے میں بول رہی ہوں، یہ میری نہیں صداقت کی زبان ہے اور یہی اس کا کافی ثبوت ــــ صداقت جھوٹ کو موقع دیتی ہے، مات نہیں کھاتی بابا۔

جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی، اور جو اب سے پھیلائی گئی ہیں، خود بخود ظاہر ہو جائیں گی۔ اور چاہوں تو میں خود آج کھول سکتی ہوں، لیکن مجھے انکی اجازت نہیں، اور جب پاپ سر چڑھکر بولتا ہے تو نیکی کی فطرت ہے کہ خاموش ہو جائے، کیونکہ اصلی نیکی وہی ہے جو بدی کو ڈھانپے۔

رہا "ان" کی شادی اور آپ حضرات کی زبان و وقار کا سوال، سو اس بارے میں میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ وہ کبھی انکار نہ کریں گے:"

جانے مجھ میں کہاں کی جرأت آگئی تھی کہ بابا کے سامنے اتنا کہہ گئی اور وہ بھی چپ سنتے رہے۔ اتنا سننا تھا کہ انہوں نے پھر تن کر کہا،

"کیا؟ انکار نہ کریں گے! ــــ یہ لیجیے!"

انہوں نے میری طرف یہ خط پھینکا۔

"میرے عزیز بابا،

میری عادت نہیں کہ اپنی مدافعت آپ کرنا بیٹھوں۔ جو کچھ آپ لوگوں نے سمجھا ٹھیک ہوگا۔ میری فطرت ایک معمہ ہے، اسے میں خود نہیں سمجھ سکا تو دوسروں کا کیا ذکر، اس لئے مجھے کسی سے کچھ گلہ بھی نہیں۔

آج مجھے ایک دو باتوں کا خلاصہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ گناہ اور بد اخلاقی بشریت ہے، اور میں بھی زیادہ سے زیادہ بشر ہی تو ہوں۔ اور گناہ کی سزا بھی ضروری تو مجھے اس سے بھی انکار نہیں چنے کے ساتھ گھن پسے تو خیر، فطرت ایک ہی ہی، لیکن بد کے ساتھ

نیک کو عقوبت و الزام دیا جاتے، یہ تو کوئی انصاف نہیں۔

اس بات کا میں یقین دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ثریا جتنی عزیز ہے اس سے زیادہ شریف ـــــ افسوس ہے کہ آپ لوگوں نے اسکو کبھی نہیں پہچانا۔

یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ ایک تعلقدار کی بیٹی سے میرا بیاہ ہو، لیکن مجھے اس پر ناز نہیں، بلکہ افسوس ہے، اس لئے کہ ایک تعلقدار کی بیٹی کیلئے تعلقدار ہی زیب دیتا ہے ـــ دولت سے دولت مل سکتی ہے بابا، دل کا ملنا ضروری نہیں۔

میں اپنے وقار کو بہت عزیز رکھتا ہوں ـــــ ایک شادی کیا، ہر کام اپنی مرضی اور بل بوتے پر کرنا چاہتا ہوں ـــــ میری بات بدل نہیں سکتی ـــ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی، مگر اس سے گستاخی ہرگز منظور نہیں، حقیقت کا اظہار مقصود ہے ـــ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ آپ نہیں کہتا بلکہ یہ محسوس کرتا ہوں کہ کوئی غیبی طاقت مجھ سے کہلاتی ہے ـــ اور بچپن سے آج تک میرے اکثر خیالات اسی طرح پورے ہوتے آئے ہیں ـــ ،

یوں بھی شادی کے متعلق میرے خیالات تقریباً جنونی معلوم ہوں گے، پھر ابھی میری اعلیٰ تعلیم و مقاصد، اور مجھ سے بڑے بھائی بہن کی شادی باقی ہے اس لئے اس انکار کو اور بھی قوی ہونا چاہیے، اس پر بھی آپ ہی کی تو مختار ہیں، لیکن انجام کی ذمہ داریوں کو سوچ لینا بھی نامناسب نہ ہوگا۔

اگرچہ کوئی بات شکستِ خاطر کیلئے نہیں لکھی، پھر بھی مبادا کوئی امر انقباضِ طبع کا باعث ہو، اعتذار کرتا ہوں۔

آپ کا ناخلف

شاکر"

میں نے بابا سے وعدہ کیا کہ "انہیں" اس شادی پر آمادہ کردونگی۔ یہ سنتے ہی ان کا غصہ سب فرو ہوگیا۔ انہوں نے مجھے پاس بلایا، سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعا دی، اور کہا: "میں جانتا ہوں ثریا کہ تم ایک نہایت شریف اور خوش اخلاق لڑکی ہو، اور میری بیٹی سے زیادہ عزیز۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے چھوٹے نواب بھی تمہاری طرح شریف ہیں مگر ذرا آزاد مزاج ـــ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم دونوں میں بہت محبت ہے۔ مگر افسوس ہے ثریا کہ میں انہیں تمہاری بہوماں کو دے چکا ہوں، اور ان کا یہ تہیہ تھا کہ اپنی بہن کی لڑکی کریں۔ اور اب تو بات بہت بڑھ چکی ہے، اور ایسے وقت میں ننگ و ناموس کا سوال بھی درپیش ہے۔

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ ساری آگ تمہاری بہن کی لگائی ہوئی ہے، مگر افسوس ہے کہ اب ان باتوں کا موقع نہیں۔ مگر تم مطمئن رہو بیٹا کہ میں تمہیں اپنے جگر کا ٹکڑا بنا کر رکھوں گا، اور تمہیں کوئی دکھ نہ ہونے دونگا!"

"مجھے آپ سے ایسی ہی امید ہے، بابا!"

"وہ" ٹینس سے بہت جلد واپس آگئے، اور جیسے میں کتب خانہ سے نکل رہی تھی "انہوں" نے دیکھ لیا۔ میں ان کے کمرے میں گئی۔ ذرا روکھے پن سے کہا: "آئیے بیگم صاحب، بہت جلد خیال آیا ـــ کیا راستہ تو نہیں بھول گئیں؟"

"ہاں، بھول گئی تھی، اسی لئے تو سبق لینے آئی ہوں!"

"سبق لینے، یا امتحان؟"

میں ڈری کہ کہیں وہ سب تاڑ نہ گئے ہوں، کہ انہوں نے کہا: "کیوں آج تمہیں پردے کا خیال نہیں ہوا؟ یا بہن ابھی نہیں گئیں؟"

"کیوں، بہن سے پردہ کا کیا تعلق؟"

سنبھلکر: "ارے ٹھیک ہے ـــ میں نے یونہی کہدیا ـــ خیر، آؤ اور اگر تکلیف نہ ہو تو بیٹھو!"

"آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں! ـــ کیا کوئی بہت زیادہ قصور ہوگیا ہے لونڈی سے؟ ـــ یا آنا ہی ناگوار ہے؟ ـــ تو لیجیے جاتی ہوں!"

"انہوں" نے ایک سوچ سے کہا: "آنا ہی ناگوار ہے! ـــ ہاں، ثریا! اسی لئے تو بند ہوا ـــ مگر اب ان باتوں سے کیا فائدہ! کہو کچھ کہنا ہے؟"

"کہنا تو بہت کچھ ہے مگر آپ سنیں گے نہیں!"

ذرا کھلکر: "ضرور سنوں گا ثریا! میں نے صرف مذاق کیا تھا، میں کبھی تم پر خفا ہو سکتا ہوں ـــ آؤ بیٹھو!"

"میں نے آج تک آپ سے کوئی چیز نہیں مانگی، اور نہ ہی مجھے اس کی ضرورت ہوئی۔ لیکن آج مجبور ہو کر آپ سے ایک بھیک مانگنے آئی ہوں! ـ آپ دیں گے؟"

"تو کیسی باتیں کرتی ہے ثریا، چیز کی کیا حقیقت ہے، میں تو اپنی جان بھی تجھے دینے کو تیار ہوں، اگر وہ تیرے لائق ہو سکتی ہے!"

"جان تو میں بھی دے سکتی ہوں ـــ مجھے اسکی ضرورت نہیں۔"

"تو پھر کہہ، تجھے اور کیا چاہیے، میری ثریّ!"
"مگر فرمائش سے پہلے ایک وعدہ بھی لینا ضروری سمجھتی ہوں!"
"تو اس سے تیرا کیا مطلب؟ ــــ کیا تو مجھے دھوکا دینا چاہتی ہے؟"
"دھوکا اور آپ کو؟ ــــ اس زندگی میں تو نہیں!"
"تو پھر کہہ، کیا وعدہ کروں!"
"اگر مجھ سے کوئی قصور ہو جائے تو آپ معاف کر دینگے نا؟"
"اگر میں اس قصور کو قصور سمجھونگا تو!"
"میں نے سُنا ہے آپ شادی سے سچ مچ انکار کر رہے ہیں!"
وہ ایک دم چونکے "تو پھر!"
"کیوں؟"
"اوّل تو مجھے اپنی شادی کی ایسی جلدی نہیں ــــ پھر میں اپنی مرضی سے کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے ایسا نہ ہو!"
"اپنی مرضی سے کرنے کے یہ معنی نہیں کہ ماں باپ کی مرضی سے نہ کریں ــــ اور یہ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ شرع میں چار جائز ہیں!"
"ارے واہ! وہ تو میں نے مذاقاً کہا تھا۔"
"زندگی میں بعض مذاق حقیقت بھی ہو جایا کرتے ہیں!"
"ہوں، لیکن عورتوں کو دھوکا دینا میری شان کے خلاف ہے، اور میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ ایسی شادی نہ کروں گا، اور میری زبان کبھی بدل نہیں سکتی!"
"یہ مجھے معلوم ہے!"
"اسی لئے مجھے انکار ہے!"
"لیکن آپ انکار نہیں کر سکتے!"
"کیوں؟"
"میں وعدہ کر چکی ہوں کہ یہ شادی ہو جائے گی، اور یاد ہے کہ شکار کی تحریک کے وقت آپ نے کہا تھا: اب تو ثریّا بھی ہماری ہے! ــــ ثریّا آپ کی ہے، اسلئے ثریّا کی زبان بھی آپ کی زبان، اور آپ کی زبان کبھی بدل نہیں سکتی!"
"لیکن میری مرضی کے بغیر تجھے کیا حق تھا کہ میری زندگی کے اتنے بڑے سوال کو حل کرے؟"
"یہی تو قصور ہوا، جس کے لئے پہلے معافی مانگ چکی ہوں!"
"لیکن یاد رکھنا کہ اس کا دکھ بھی تجھی کو اٹھانا پڑے گا، مجھے نہیں!"
"اگر اس دکھ کو میں دکھ سمجھوں گی تو!"

ــــــــــ

"ان" کی شادی ہو چکی ــــ یا کر دی گئی۔ فی الحال ہر طرف سکون ہی سکون اور اطمینان ہی اطمینان تھا۔ مگر پانچ جھگیاں بھی نہ ہونے پائیں کہ سمدھیانے والوں نے دلہن کو روک لیا اور شرط لگائی کہ جب تک میں نہ شادی جاؤں، نہ بھیجیں گے۔ ادھر بہن صاحب نے ماں باپ کو خط لکھ لکھ کر اور افسانے گھڑ گھڑ بلایا کہ مجھے لے جائیں۔

شادی کا انجام! ــــ کیا سوچا تھا! اور کیا ہوا! ــــ خیر مجھے اس کا غم کیا۔ دل تو اس لئے بیٹھا جاتا تھا، کہ جس کنول کو سنبھالنے اور ابھارنے کے لئے یہ پانی سینچا وہی اب کملا رہا تھا، جس بلبل کے نغمہ سننے کے لئے یہ چمن بنایا گیا وہی اب سوگوار تھا۔ "ان" کی سنجیدگی اور خاموشی، میرا تو ذکر ہی کیا، سارے "عزیزوں" کو بھی مشوش کئے دیتی تھی۔ لیکن اپنی کرنی بھرنی تھی، کوئی کہہ کیا سکتا تھا۔

میرے جانے کا دن آ گیا، سب سے رخصت ہو کر ان کے کمرے میں گئی۔ صوفے پر بیٹھے تھے، گود میں کتاب تھی اور دماغ میں کچھ سوچ۔ میں جا کے ملی۔ مسکراتے ہوئے کہا: "تم جا رہی ہو ثریّا! ــــ کبھی پھر بھی یاد کرو گی؟"
"جی نہیں! ــــ یاد کرنے کے لئے آپ کوئی سبق تھوڑی ہیں! ــــ"
"سبق نہیں تو کم سے کم آموختہ تو ہو نگے!"
"تو پھر آموختہ کو یاد کرنے کی کیا ضرورت؟ وہ تو ہمیشہ دل میں رہتا ہی ہے!"
ہم مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ "انہوں نے خاموشی توڑی: "ثریّا، ہم نے بھی عجیب طبیعتیں پائیں، اور اب تک ہم صرف شاعری کرتے رہے، ہرچند میں اس قابل نہیں ہوں کہ تم سے اس قسم کی بات بھی کروں، مگر جانے، کیوں اب بھی یہ خلش کھائے جاتی ہے کہ تم سے ایک دفعہ صاف سُن لوں کہ کیا اب بھی تم مجھ سے محبت کرتی ہو ثریّ؟"
"یہی سوال میں بھی کر سکتی ہوں!"
"ہاں! ــــ کر سکتی ہو ثریّ، مگر شمع کے زبان نہیں ہوتی۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ ایک شعلہ ہے جو کبھی نہیں بجھتا اور کہیں

نہیں بجھتا! —"

"اور پروانے کے تو عقل بھی نہیں ہوتی، بس اتنا جانتی ہوں کہ وہ ایک خاکستر ہے، جو اپنی جگہ رہے یا کو بکو اڑے، یہی اس کی زندگی ہے، اور یہی اس کی موت!"

"موت! — کتنا پوچ لفظ، مگر ساتھ ہی بھیانک بھی — میں جب تک زندہ ہوں، تو مر نہیں سکتی ثریا!"

تلے، گو یا ملک الموت پر بھی حکومت ہے آپ کی!"

"ملک الموت کچھ تجھ سے بڑھے ہوئے تو نہیں ثریا! — تجھ پر حکومت ہے تو ساری دنیا پر حکومت ہے، کیونکہ تو سراپا حسن و عشق ہے، اور عشق سے بڑھی ہوئی کائنات میں کوئی طاقت نہیں اسلئے پہلے مجھے فنا..... "

"بس بس، رہنے دیجئے، پھر بھی آپ کی شاعری تو جاتی نہیں اس لئے اب ہم جاتے ہیں!"

"For men may come & men may go,
But I go on for ever!"

"ثریا! میری دلی تمنا ہے کہ تو ہمیشہ خوش رہے!"

وہ بھی عجیب وقت ہوتا ہے کہ دو جدا ہونے والوں کی آنکھوں میں آنسو ہوں، اور لبوں پر مسکراہٹ، زبان سے "الوداع" کہیں اور دل سے "نہ جا!"

اب میں اپنے گھر آ چکی ہوں، اپنا وطن ہے، اپنے عزیز اقارب ہیں، اپنے ماں باپ ہیں، بھائی بہن ہیں، دوست احباب ہیں، سکھی سہیلیاں ہیں، چاہنے والے ہیں، سراہنے والے ہیں، اپنی دنیا ہے اور اپنے اوقات ہیں۔

پہلو میں دل ہے، دل میں امنگیں، امنگوں میں جوش، جوانی کی راتیں ہیں، بہاروں کے دن ہیں اور کسی کی کھوج۔ ایسے شوہر عاشق "صادق" مل رہے ہیں، ہردم محبت کا دعویٰ ہے اور وفا کا وعدہ۔ میرے لئے سب کچھ قربان کر سکتے ہیں — اور میرے لئے ہی مجھے چاہتے ہیں، لیکن میں جسے چاہوں اس کی جان کے لاگو ہیں درحالیکہ جانتے ہیں "محبت ایک جذبۂ بے اختیاری ہے" عقلمند ہیں۔ دولتمند ہیں، خوبصورت بھی سمجھتے ہیں، اخلاق و عادات کا تو سارا دانا خاندان معترف ہے۔ "حق" بھی رکھتے ہیں، کیونکہ بچپن سے ہی میری رجسٹری ہو چکی ہے، اس لئے دماغ میں اقتدار ہے، افتخار ہے، حماقت، انگ ہیں کرم ہے، اکرم میں ستم۔ دل میں محبت ہے اور محبت میں ہوس، غرض سب کچھ موجود ہے، مجھے اور کیا چاہیئے؟

شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے، تیاریاں زوروں پر ہیں، اور سب اپنی اپنی دھن میں لگے ہوئے۔ نیوتے جا رہے ہیں، رشتہ دار آ رہے ہیں۔ والد صاحب بیٹی، داماد اور بہو ماں کو بھی لاتے ہیں، سنتی ہوں کہ "وہ" بھی آئے ہوئے ہیں۔ بھابی جان اور بی آپا نہیں آئیں، کیونکہ بی آپا کے متعلق دوشیزہ ہونے کا اور بھابی جان کے متعلق کچھ عذر ہے —

مریض ہے اور طبیب، دریا ہے اور پیاسا، زخم ہے اور مرہم، ذرہ ہے اور آفتاب، قمری ہے اور سرو، چاند ہے اور چکور، مُردہ ہے اور مسیحا — مگر مریض سے زیادہ بے بس حکیم، دریا سے زیادہ ساکت پیاسا، زخم سے زیادہ گھائل مرہم، ذرہ سے زیادہ مجبور آفتاب۔ قمری سے زیادہ پابستہ سرو، چکور سے زیادہ دُور چاند اور مُردہ سے زیادہ بے دم مسیحا ہے — کیا اسی کا نام بخت رسا نہیں؟ اور بخت یاور ہے تو منزل بھی کوئی دور نہیں!

لوگ مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں، کوئی طعنہ دیتی ہیں، کوئی ہمدردی کرتی ہیں، کوئی ازراہِ کرم فرماتی ہیں کہ میں کیوں اداس رہتی ہوں۔ کیوں پہلے کی طرح ہنستی بولتی نہیں — کیوں ملتی جلتی نہیں — کیوں گھلی جا رہی ہوں؟۔

ایسے سوالوں کا جواب؟ — جانے، کیا ہوتا ہے!

مجھے تو بس ایک سبق یاد آتا ہے کہ عشق کا انجام اب موت ہے — میں عشق کی موت سے نہیں گھبراتی، البتہ بے عشق زندگی سے گھبراتی بلکہ نفرت کرتی ہوں۔

عشق گرمی ہے، اور گرمی سے حرکت، حرکت سے زندگی، اور جمود سے موت۔ اس لئے عشق کی موت میرے لئے زندگی ہے اور بے عشق زندگی موت! کیونکہ میں "سراپا حسن و عشق ہوں — !"

موت! — "کتنا پوچ لفظ" — اسی لئے تو شاید "انہوں" نے کہا تھا کہ "موت سے میں نہیں گھبراتا، بابا!" تو میں کیوں گھبراؤں!۔

"ان" کا ہر قول میری فطرت و صداقت ہے اور صداقت میرا ایمان، ایمان کیلئے جان دینا خودکشی نہیں —

میں نے طے کر لیا کہ یہ بے کیف شادی کبھی نہ ہونے دونگی ــــ اور شادی کرنے کا کسی کو حق ہی کیا ہے، جبکہ میں اپنی شادی آپ کر چکی ہوں ــــ!

سماج کا رواج اور کل کی لاج! ــــ کتنے بھونڈے اور بزدلانہ الفاظ! ــــ میں ان حدود سے فطرتاً آگے تھی، اور اب تو شاید آسمانوں کے فاصلہ پر، لہٰذا موت کا فیصلہ اور بھی اٹل ہونا چاہئے۔

مگر ایک حسرت ستائے جاتی تھی کہ ایک دفعہ "اُنہیں" دیکھ لوں، لیکن اس کا پورا ہونا بہت دشوار تھا۔ کیونکہ میں "منجے" بٹھادی گئی تھی، اور ہماری رفیق بہن کا سارا لاڈ اُمنڈ آیا تھا کہ وہ راتوں میں بھی میرے ہی پاس سویا کرتیں۔

کتنی بیوقوف دُنیا، اور کتنے احمق رشتہ دار! ــــ کہ دُشمنی کریں اور دوستی سمجھیں، توسنِ آزادی کو مہمیز پر مہمیز لگائیں اور مقید سمجھیں، برباد کریں آباد سمجھیں۔ ناشاد کریں دل شاد سمجھیں! ــــ کیا ان حرکتوں سے یہ ثریا کے ارادہ کو بدل سکتی ہیں؟ ــــ ناممکن!۔

جانے کتنے مجھے طعنہ دیں گے، بے حیا کہیں گے، رسوا کرینگے شرافت کے خلاف سمجھیں گے، لیکن محبت اور سماج میں ہمیشہ دشمنی رہی ہے اور رہیگی۔ اور جہاں عزت وعزم کا سوال ہو ایک قوی دُشمن ضعیف سے دب جائے، محال! ــ "محبت سے زیادہ قوی کائنات کی کوئی طاقت نہیں" تو سماج چہ پدی است کہ مقابلہ کرے!۔

یہ صحیح ہے کہ شریف عورت کے لیے عشق کی ذمہ داریوں سے کہیں اخلاقی ذمہ داریاں بڑھی ہوئی ہیں۔ لیکن ذمہ داریوں کا سوال تو وہاں اُٹھتا ہے جہاں عقل ہو ــــ اور جس کی عقل جنون کے عوض چھین لی گئی ہو، جس کی دُنیا بسا کر لوٹ لی گئی ہو، جس کا دماغ ہوش کے بعد خراب کیا گیا ہو، جس کی اُمنگیں بہار کے بعد پامال کی گئی ہوں، جس کو سب کچھ ملنے کے بعد کچھ نہ ملا ہو، جس کو اتنا بھی بس نہ ہو کہ جس پر وہ اپنا حق سمجھتی ہو اُسے اپنا کرے، بچھڑے کو ملالے، کھوئے کو پالے ــــ وہ پرائے کو اپنائے، غیر کی خدمت کرے بیگانے کو بہلائے، دُشمن کو سکھ دے! ــــ امانت میں خیانت کرے! ــــ اُف کتنا بڑا گناہ، اور کتنی بڑی کمزوری! ــــ اور ثریا کبھی کمزور، بزدل یا منافق نہیں ہو سکتی! ــــ

لیکن جب یہی عقلمند دُنیا مجبور کر رہی ہے کہ وہ کمزور بنے، یہی سماج سکھا رہا ہے کہ منافقی کرے، یہی شرفاء جتا رہے ہیں کہ دغا دے، تو اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس ہی تو کہتا ہے کہ ایسی ذلیل زندگی پر موت کو ترجیح دی جائے ــــ خواہ دُنیا ملامت کرے یا ستائش! ــــ محبت اگر واقعی کوئی چیز ہے تو اس سے ارفع تر کہ تعریف سے بڑھے اور توہین سے گھٹے ــــ جس طرح دباؤ سے فوارہ اور زیادہ اُٹھتا ہے اسی طرح رکاوٹوں سے محبت کو اور قوی ہونا چاہیئے ــ!

***

شادی کی رسمیں شروع ہو چکی تھیں ــــ خدا مُبارک کرے رفیقانِ کارساز کو کہ یہی اُن کی ساری اُمنگوں کا حاصل ہے۔ ــــ کیوں نہ ہو، آخر "بڑے" اور "سمجھدار" ہیں نا! ــــ بچہ بھی تو آخر رنگوں کو دیکھ تتلی پر لپکتا ہے، خواہ اس سے تتلی کی جان ہی کیوں نہ جائے!

ایک "مقدس" "رسم" "ہلدی" کا دن ہونے والا تھا جس میں شاید مجھے دُلہن بنانے کا سامان کیا جاتا ــــ اور شادیانہ رسوم میں کسی کو چون وچرا کرنے کی گنجائش بھی نہیں ہوتی، کیونکہ یہی سب کی منشا اور رسم ورواج ہے۔ میں نے ضروری سمجھا اتنی ساکت وصامت ہوجاؤں کہ مجھے سنوارنے میں انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

صبح کے کوئی چار بجے ہونگے ــــ رات تمام ہمارے رفیق گاتے بجاتے، ہنستے ہنساتے اور ہماری تعریفیں کرتے کرتے اتنے تھک گئے تھے کہ انہیں نیند نے موت کا مزہ چکھادیا ہوگا!۔

میرے لئے اس سے زیادہ کون اچھا موقع ہو سکتا تھا۔ میں اُٹھی، اور چپکے سے نکل پیچھے کے دروازے سے خانہ باغ کی باؤلی کا عزم کیا ــــ آہ! میں اپنی کامیابی پر کس قدر مسرور ومطمئن تھی کہ بیان سے باہر ہے ــــ جس طرح غواص کی آنکھ سمندر میں موتی ڈھونڈتی ہے، میں نے بھی اس تاریک غار میں اپنی مرادوں کا موتی پایا، اور اس کو حاصل کرنے کے لئے لپکی ــ مگر ــــ

***

سچ کہا ہے کہ بندہ تجویز کرتا ہے اور خدا تردید ــــ لیجے، اب میں بھلی چنگی ہو بیٹھی ہوں اور اسی کے جان کے لالے پڑے ہیں جس کے لئے میں نے سب کچھ قربان کیا۔ یہ قسمت کا کھیل ہے اور قسمت سے کسی کو چھٹکارا نہیں!۔

جب میں ہوش میں آئی تو دیکھا کہ گھر سارا ماتم کدہ بن گیا ہے ــــ کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ کیا اندھیر ہے ــــ سُنتی

ہوں کہ "اُن" کا سر پھٹ گیا ہے ـــــ ان کا سر! ـــــ مجھے نکالنے کے بعد کسی نے پتھر ڈال دیا ـــــ کسی نے! ـــــ جسے میں جانتی ہوں! ـــــ جانتی ہی نہیں نفرت کرتی ہوں! ـــــ جس کی تصدیق کئی آدمی کر چکے ہیں ـــــ ہر طرف یہی گفتگو اور گومگو ہے! ـــــ یہ دنیا ہے! ـــــ اور یہ شرافت! ـــــ یہ اخلاق ہے! ـــــ اور یہ محبت! ـــــ یہ جاں نثاری ہے اور یہ بلند حوصلگی!۔

نہیں جانتی کہ میں ہوش میں ہوں یا محوِ خواب! ـــــ زندہ ہوں یا مُردہ! ـــــ جدھر کان لگا در رونے کی آواز، جدھر دیکھو ایک کہرام مچا ہوا! ـــــ کیا یہی میری شادی کا منظارہ ہے! ـــــ

"وہ" دواخانے سے آچکے ہیں۔ سر پر پٹی بندھی ہے جسم نحیف ہے، پھر بھی سنبھلنے کے آثار ہیں ـــــ ایک دن "انہوں" نے مجھ سے ملنے کی خواہش کی ـــــ کسے معلوم تھا کہ یہی میری زندگی اور اُمنگوں کا آخری دن ہوگا۔ جو میں گئی، مسکرائے اور "اُن" کی زبان سے نکلا "میں نہ کہتا تھا ثریا، کہ جب تک میں زندہ ہوں تو مر نہیں سکتی ـــــ؟"

یہ الفاظ ہیں تا تیرِ محبت ہے یا موت؟

مجھے پلنگ پر بیٹھنے کو کہا۔ "وہ" شگفتہ تھے، اور اس تصور سے میں بھی خوش تھی کہ انہوں نے کہا۔ "ثریا، جی چاہتا ہے کہ آج تجھ سے خوب کھل کر باتیں کروں ـــــ میرا خیال تھا تا کہ تالاب پر ایک بنگلہ بناؤں؟ اور ہمیشہ ہم وہیں رہیں ـــــ لیکن بنگلہ میں میں ہمیشہ تھوڑی رہ سکتا تھا ـــــ اس لئے اب وہاں میری قبر ہوگی ثری، تم بابا سے کہدینا!"

"آپ یہ کیا باتیں کر رہے ہیں!"

"اور تو ـــــ تیری تو ہوگی ہی! ـــــ

ثریا، تجھے یہ بھی خواہش تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ہو رہیں اور یہ بھی معلوم کرے کہ مجھے تجھ سے محبت ہے، یا نہیں!۔ تو سن ثری، مجھے تجھ سے محبت ہے! ـــــ

(آہ میں کتنی خوش نصیب تھی کہ آخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر رہی! زندگی کی کتنی بڑی آرزو!)

ثریا، تو کہے گی کہ میں نے کتنی جلدی اس کا اظہار کیا ـــــ مگر ثریا، محبت زندگی کا وہ راز ہے جس کے بند ہونے میں جتنا مزہ ہے کھلنے میں نہیں! اسی لئے محبت کا تعلق دل سے ہے، اور دل ایک شگوفہ ـــــ شگوفہ کے کھلنے کی تمنا میں جتنی مسرت ہے اتنا ہی اُس کے کھلنے کے بعد مُرجھانے کا اندیشہ۔ اسی طرح محبت زندہ ہے جب تک کہ وہ بند ہے اور ظاہر ہونے کے بعد مُردہ۔"

"بس بس، اب آپ آرام کیجے، بہت باتیں ہولیں!"

"آرام! ـــــ دیوانی، اب تو ایسا آرام کرنے والا ہوں کہ تو کبھی نہ اُٹھا سکے، اس لئے آرام سے پہلے تجھ سے جی کھولکر باتیں کرلوں ـــــ تو ہاں ثری، میری زندگی کا ہر تخیل بلندی پر مبنی تھا، اسی طرح میری محبت کو بھی اعلیٰ و ارفع ہونا چاہیئے نا! ـــــ اس لئے ثری، ہم جسموں سے ایک دوسرے کے نہ ہو سکے، لیکن ہماری رُوحیں ایک ہیں ـــــ عطر ہمارا ہے اور فضلہ دوسروں کا! ـــــ روحی محبت! کتنی لطیف! ـــــ کتنی بلند!"

اتنے میں وہ سُورما گئے جنہیں شرافت، ہمت، حوصلہ سب ہی کچھ ہونے کا دعویٰ تھا۔ آتے ہی ہاتھ جوڑتے ہوئے منفعلانہ انداز میں کہا "مجھے معاف فرمایئے، چھوٹے نواب! میں اسقدر اندھا ہوگیا تھا کہ میں نے ایسی ذلیل حرکت....."

اتنا سُننا تھا کہ "اُنہوں" نے اُن کے دہنِ مبارک پر ہاتھ رکھا اور بولے "میں جانتا ہوں صادق صاحب! ـــــ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ـــــ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی شادی ہو جائیگی، آپ گھبرایئے نہیں!"

یہ سُننا تھا کہ مجھے ایک تیر سا لگا ـــــ دھوکا، فریب، خواب! ـــــ سب ہی کچھ میرے ذہن میں آنے لگے کہ "اُنہوں" نے میرا ہاتھ لیا اور صادق صاحب کے ہاتھ سے ملانا چاہا، میں نے فوراً جھٹکا دیا اور کہا "مَردوں کو دھوکا دینا میری شان کے خلاف ہے!"

"لیکن میں وعدہ کر چکا ہوں کہ یہ شادی ہو جائیگی ـــــ تو میری ہے ثریا، اس لئے تیری زبان بھی میری زبان، اور میری زبان کبھی ہل نہیں سکتی!"

"لیکن ایسی زبان سے کہیں بڑھا ہوا ایک شریف عورت کا وقار ہوتا ہے"

"اور ایسے وقار سے کہیں بڑھا ہوا اُس کا ایثار!"

یہ کہتے ہوئے "اُنہوں" نے ہم دونوں کا ہاتھ ملا ہی دیا،

اور مُسکراتے ہوئے بولے :-

"For men may come & men may go
But I go on for ever!"

ثریّا، میری دلی تمنّا ہے کہ تُو ہمیشہ خوش رہے۔ خُدا حافظ۔"

سارے خوابوں کی تعبیر، سارے مقاصد کی تکمیل، ساری اُمنگوں کا نقشہ اور ایک پگھلتی ہوئی شمع کے آنسو سامنے دھرے ہیں ——— دُنیا اُنہیں دیکھے ——— اور میں! ———
میری تو شادی ہو چکی ہے، اور میں خوش ہوں!۔

سید علی شاکر۔ ایم۔ اے

سن اے مرغانِ بسمل کا تماشا دیکھنے والے
نہ تھا تاریخ کا آغاز بھی جن کے زمانوں میں

ہلاکِ عشق یوں ہوتے ہیں جلوا دیکھنے والے
وہ جینے جا گئے ہیں آج تک بھی داستانوں میں

مقید ہی نہ تھے اصنام بت خانہ وہ ہیکل میں
تردد اور تفکر سے وہ انساں دُور رہتے تھے
گل و بلبل کی بیتی سُنتے اور اپنی سُناتے تھے
نہ تہذیب و تمدن سے نہ علم و فن سے مطلب تھا
تھی ایسے عالمِ طفلی میں جبکہ نوعِ انسانی
منجم، غیب داں، رمّال، سب نے یک زباں ہوکر
خبر یہ بادشہ سن کر نہیں پھولا سماتا تھا
چھٹی کے روز اک اک نام لیکر ہر بشر آیا
شہنشہ کو بڑا فرزند کے بارے میں یہ سپنا
نہ آئینہ نہ سطحِ آب دیکھی شاہزادے نے

تھے دیوی دیوتا زندہ اسی دُنیا کی ہلچل میں
حواس و ہوشِ طفلانہ سے وہ معمور رہتے تھے
وہ علمی پیاس افسانے ہی پی پی کر بجھاتے تھے
نہ یزداں سے غرض تھی اور نہ اہرمن سے مطلب تھا
تولد ایک شہزادہ ہوا یوناں میں لاثانی
کہا کہ چاند کی دیوی کا یہ فرزند ہے دلبر
اسی دیوی کے آگے نذر و قربانی چڑھاتا تھا
مگر شاہنشہ والا کو نرگس نام ہی بھایا
مرے گا بے کسی کی موت گر دیکھے گا حسن اپنا
ندیموں کی نظر بے تاب دیکھی شاہزادے نے

نیا اک دَور آیا زندگانی کی کہانی میں
شکار و سیر پر ڈالا جوانی کی امنگوں نے
وزیر و شاہ و اعیانِ حکومت تھے بہت حائل
مگر شہزادہ وہ گھوڑے پہ بیٹھا اور چل نکلا
ہوا لگتے ہی جنگل کی اُڑا اسپ وہ مہ پیکر
وہ پٹ میدان اور وہ دھوپ اور اپنوں کا چھٹ جانا
پیاسے، دھوپ کے مارے نے دیکھا اک جگہ سایا
یہاں اک قدرتی فوارہ چشمے سے اچھلتا تھا
یہاں سورج کی کرنیں چپکے چپکے مسکراتی تھیں

قدم رکھا جونہی اس شاہزادے نے جوانی میں
دیا صید افگنی کا جُل جوانی کی ترنگوں نے
مبادا کوئی بیری دشمنوں کو کر نہ دے گھائل
اسی کے پیچھے پیچھے فوجِ خاصہ کا بھی دل نکلا
تعاقب میں ہرن کے چل پڑا ابرقِ تپاں بنکر
غریبِ راہ رَو کا دن دہاڑے گویا لُٹ جانا
بھٹک کر راستے سے اس جگہ دیوانہ وار آیا
ہٹیلا بچہ جیسے گود میں ماں کی مچلتا تھا
تڑپتی، لوٹتی، اور تھرتھرا کر جگمگاتی تھیں

شکن چشمے کے ماتھے پر ہواؤں سے جو آتے تھے
وہ بن کر موج ساحل تک مسلسل گاتے جاتے تھے

فضائیں مے پرستِ نغمۂ امواج رہتی تھیں
ہوائیں نشۂ سرشار بن کر بن میں بہتی تھیں

یہ لہریں جب ہوا کی گدگدی سے دور ہوتی تھیں
تو رو رو کر وہ منہ کو چلوؤں آنسو سے دھوتی تھیں

گر پیاسا نظر نیچی کئے چشمہ پہ جا پہونچا
پریشاں پیاس کی شدت سے نقادہ اور پژمردا

وہ جھک کر چشمۂ شیریں سے پانی پینے والا تھا
کبھی جو عمر بھر میں بھی نہ دیکھا تھا، وہ کچھ دیکھا

وہ سمجھا کوئی دریائی پری چشمے میں برپا ہے
جسے میری شریکِ زیست ہونیکی تمنا ہے

کھڑے پانی میں اک بجلی ہے وہ بھی کوندنے والی
بلوریں جھاڑ میں ڈالی ہے وہ بھی پھول کی ڈالی

نگاہِ ساحری فن میں پریشاں بجلیاں لاکھوں
جہانِ دل میں لرزاں ہیں زمین و آسماں لاکھوں

قیودِ جسم سے بھی پاک ان کے حسن کا عالم
مگر چمکیلی آنکھیں ناک ستواں، بال خم در خم

گلابی گال لمبے بال، ہیں سامانِ آرائش
نزاکت کا تصور ہی تصور اس کی زیبائش

بہارِ بے خزاں گہوارہ اسکے حسن رنگیں کا
اچھوتا پن ہے وصفِ خاص اسکے جسم سیمیں کا

فسانے دیو و پریوں کے جو شہزادے کو یاد آئے
تو سمجھا کوئی دریائی پری بیٹھی ہے شرمائے

ہماری دلنشینی کو یہی دلدار زیبا ہے
کہ نازک تر تصور سے بھی حسن اس کا اچھوتا ہے

مبتدل عشق میں یہ شوق ہم بزمی ہوا آخر
وہ شہزادہ اسیرِ حسنِ خود بیں ہو گیا آخر

پری سے مکھی جتنی لگائی شاہزادے نے
پری زادوں کی اتنی دی دُھائی شاہزادے نے

دماغ و دل پہ جب حسنِ مجسم کی گھٹا چھائی
تمنا ہم بغل ہونے کی اس کے دل میں لہرائی

جونہی جنبش سے پانی میں ہوئی اک تھرتھری پیدا
پری غائب تھی اور عاشق کو شوریدہ سری پیدا

نہ پایا اس پری کو جب تو نکلا جستجو کرنے
جہاں مل جائے ہم بزمی کی اس سے آرزو کرنے

نہ پایا پر نہ پایا اس پری کو سبزہ زاروں میں
نہ باغوں میں نہ جنگل میں نہ تھی وہ آبشاروں میں

اسی چشمے پہ آخر شاہزادہ تھک کے آپہنچا
بہت آہستہ دزدیدہ نگاہوں سے ذرا جھانکا

مسرت سی مسرت تھی کہ وہ جلوا دکھاتی تھی
ہنسو تو ہنستی تھی اور روؤ تو آنسو بہاتی تھی

کرو اظہارِ غم جتنی بھی طولانی گذارش میں
جوابِ گفتگو دیتی تھی بس ہونٹوں کی جنبش میں

جوابِ باصواب اس سے نہ پایا جب تو کیا سمجھا!
صدائے بازگشت اس کی تھی یہ اپنی صدا سمجھا

ہوا شہزادہ اپنے عکس کا اس درجہ شیدائی
کہ کھُلّم کھُلا نوبت عشق کے اظہار کی آئی
کہا اس نے "مری جاں! دل سے تجھ پر جان دیتا ہوں
غلامی میں تری رہنے کا میں پیمان دیتا ہوں
مرے دل کی ہو مالک ذرا باہر تو آجاؤ
ابھی آنکھوں میں بیٹھی ہو ذرا دل میں سما جاؤ
گلے ملنے کو بڑھتا اور کبھی تھا مسکرا دیتا
خموشی عکس کی پاتا تو پھر آنسو بہا دیتا
کیا اظہارِ عشق اس نے بدل کر لاکھ پیرائے
لبوں پر چُپ لگی تھی واں جوابِ شوق کیا آئے

تڑپ کر آنسوؤں نے آنکھوں سے گنگا بہا ڈالی
جنھوں نے سطح پر پانی کی اک ہل چل مچا ڈالی
وہ ننھی ننھی لہریں جبین پیشانی بناتی تھیں
پری کے روٹھنے سے شاہزادہ کو ڈراتی تھیں
اُسے ڈر تھا کہ وہ یارِ دگر غائب نہ ہو جائے
جو کچھ حاصل ہے جلوہ وہ بھی پانی میں نہ کھو جائے

کہا اس نے اگر تم ہو خفا میرے بُلانے سے
تو لو میں باز آتا ہوں تمھارے پاس آنے سے
نہ پایا گو جواب اس کا خموشی کو رضا سمجھا
لگائے ٹکٹکی اس پر وہیں آسن جما بیٹھا

چھُپا مہرِ درخشاں، ماہِ تاباں بھی نکل آیا
مگر شہزادہ اس دیدار ہی سے نہ اُکتایا
گذرتے ہی گئے یوں روز و شب آہستہ آہستہ
بڑھے جاتا تھا عشقِ بے سبب آہستہ آہستہ
نہ خواب و خور کی خواہش تھی نہ لذت زندگانی میں
بڑھاپے کی ہوا کھانے لگا اس نوجوانی میں
یونہی گھُل گھُل کے آخر جان دے دی ناتواں ہو کر
نتیجہ یہ نکلا شاہزادے نے جواں ہو کر
شکار و سیر کو نکلا، ہوا خود ہی شکار آخر
رہی لاش اس کی چشمے کے کنارے بے مزار آخر

وہ ہمراہی کہ جو تھے جستجو میں شاہزادے کی
وہاں پہنچے تو دیکھا شاہزادہ ہو چکا مٹی
کنارِ آب پر تھیں چند سوکھی ہڈیاں باقی
پڑا تھا طرۂ دستار اک اس کا نشاں باقی
کٹورا سی مگر مستانہ آنکھیں ایک پودے سے
لگائے ٹکٹکی مصروفِ نظارہ تھیں چشمہ سے
نظر بھر کر جو سب نے شاہزادہ کا پتہ پایا
سروں پر خاک ڈالی اور ماتم کر دیا برپا
کہا ہمراہیوں نے شاہزادہ خاص بندہ تھا
کہ یکتا حُسن میں اور عشق کا کامل نمونہ تھا!
ہے نرگس یادگار اس شاہزادہ کے فسانے کا
ہے یہ معیار سچے عاشقوں کے آزمانے کا

عرشی تیموری